حافظ بصیر پوری کی نظم و نثر کے جمالیاتی عناصر:
فکری و فنی جائزہ

تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اردو

مقالہ نگار:
حافظ صابر علی
رجسٹریشن: 197-FLL/MSURDU/F-16

نگران:
ڈاکٹر غلام فریدہ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو (فی میل)
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

INTERNATIONAL ISLAMIC UNIVERSITY ISLAMABAD
International Islamic Univ.
CENTRAL LIBRARY
ISLAMABAD

شعبہ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Accession No. TH34476

PhD
891.43901
ZLE

۱- اردو کلاسیکی شعر --- تنقید و تاریخ

۲- نظم و نثر --- تشخص کی جانچ

حافظ بصیرپوری کی نظم و نثر کے جمالیاتی عناصر: فکری و فنی جائزہ

(تحقیقی مقالہ)

مقالہ نگار

حافظ صابر علی

رجسٹریشن نمبر:197-FLL/MSURDU/F16

مقالہ برائے ایم ایس (اُردو)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

کلیۂ زبان و ادب

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیۂ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں MS اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور MS اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **"حافظ بصیر پوری کی نظم ونثر میں جمالیاتی عناصر: فکری وفنی جائزہ"**

مقالہ نگار: حافظ صابر علی

رجسٹریشن نمبر: 197-FLL/MSURDU/F16

کمیٹی دفاع مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف
ڈین
کلیۂ زبان وادب

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
چیئرمین
شعبۂ اُردو

ڈاکٹر صفدر رشید
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر ارشد محمود آصف
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر غلام فریدہ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو (فی میل)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

جون، 2021ء

اقرار نامہ

حافظ صابر علی، رجسٹریشن نمبر:197-FLL/MSURDU/F16 حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ بعنوان "**حافظ بصیر پوری کی نظم و نثر کے جمالیاتی عناصر: فکری و فنی جائزہ**" میں پیش کیا گیا کام میری ذاتی کاوش ہے اور سرقے سے پاک ہے۔ میں نے یہ کام بین الاقوامی اسلامی، یونیورسٹی، اسلام آباد کے ایم ایس (اردو) کے سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر غلام فریدہ کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ پیش کروں گا۔

حافظ صابر علی

مقالہ نگار

تصدیق نامہ

حافظ صابر علی رجسٹریشن 197-FLL/MSURDU/F-16 کے تحت اپنا تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اردو، بعنوان ''**حافظ بصیر پوری کی نظم و نثر کے جمالیاتی عناصر: فکری و فنی جائزہ**'' میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔

کمیٹی دفاع مقالہ منعقدہ اجلاس مورخہ ۲رجون ۲۰۲۱ء میں جو تجاویز دیں اس کے مطابق مقالہ نگار نے درستی کر لی ہے۔اب یہ مقالہ شعبہ امتحانات کو بھیجنے اور ڈگری جاری کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

Ghulam Farida

ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو (فی میل)

کلیہ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

فہرست ابواب

	عنوان	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
باب اول	ادب اور جمالیاتی عناصر بنیادی مباحث	
باب دوم	پروفیسر حافظ بصیرپوری کی حیات و خدمات مختصر جائزہ	
باب سوم	پروفیسر حافظ بصیرپوری کی شاعری فلسفہ جمالیات کی روشنی میں	
باب چہارم	پروفیسر حافظ بصیرپوری کی نثر فلسفہ جمالیات کی روشنی میں	
باب پنجم	پروفیسر حافظ بصیرپوری کی مکتوب نگاری میں جمالیاتی عناصر	
	محاکمہ	
	کتابیات	

پیش لفظ

پنجاب یونیورسٹی اور اینٹل کالج کے اساتذہ کی صحبت سے فکر و فن کے تصورات نثر اور شاعری میں فنی زیر و بم تو ذہن پر نقش تھا مگر جمالیات کے حوالے سے میرا ایم اے کی سطح پر کوئی کام نہیں تھا۔ بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی میں پر اعتماد رویہ نے اساتذہ کی نظروں میں مجھے بہت لائق فائق طالب علم ظاہر کیا۔ جس کے نتیجے میں مجھے سخت اور طویل تحقیق کے مراحل سے دوچار ہونا پڑا اور کورس ورک کی تکمیل کے بعد گھریلو معاملات میرے لئے ایک ابتلا سے کم نہ تھے۔ اساتذہ کی توقعات پر پورا اترنے کے لیے دن رات کتب کی تلاش میں صحرا نوردی کی۔

خاص طور پر ڈاکٹر ارشد معراج صاحب اور ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی صاحب کی توجہ ثمر بار ہوئی اور موضوع کے انتخاب کے لیے ان اساتذہ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے میرا ذہن پڑھ کر فوراً "جمالیات" پر کام کرنے کا عزمِ صمیم دیا۔ تاحیات اِن ہستیوں کے لیے دل سے دعا گو رہوں گا۔ ان کی شفقتیں میری عقیدت پر ہمیشہ فائق رہیں گی۔ صدرِ شعبہ اُردو کا بھی شکریہ ادا کرنا واجب سمجھتا ہوں کیونکہ وہ پنجاب یونیورسٹی میں بھی میرے استادِ انتقاد رہ چکے ہیں۔ جہاں اول الذکر اساتذہ کی شفقتیں ہم رکاب رہیں وہاں سر عزیز ابن الحسن صاحب کی عسکریت نے بھی جہادِ مقالہ میں مجھے تیر و تفنگ اور تیغ و سپر فراہم کیے۔ اُن کی تنقیدی ڈھال نے مجھے اس رہگزر پر کبھی نڈھال نہیں ہونے دیا۔ اپنے پیارے دوست محمد امجد کا بھی شکر گزار ہوں جو چھوٹا بھائی ہونے کے باوجود بڑے مشورے دیتا رہا۔ میری تُند و تلخ باتوں کو زہر ہلاہل کے باوجود قند و نبات سمجھ کر نبھاہ کرتا رہا اور ہمیشہ میری دل جوئی کرتا رہا، دوستی کا دَم بھرتا رہا۔ اپنی بساط کے مطابق میرا معاون رہا۔

جمالیات پر قبل ازیں بہت کم مقالہ جات لکھے گئے۔۔ بابائے جمالیات ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی کتب پاکستان کی لائبریریوں میں ناپید ہیں۔۔ فیروز سنز لاہور، راولپنڈی حتیٰ کہ کراچی سے جمالیات کی کتب کا سراغ لگانے کی سعی لا حاصل رہی۔ آخر کار یہ معمہ اکادمی ادبیات کے مہربان اور شفیق ادیب جناب مہر علی صاحب نے حل کیا۔۔ انہوں نے نیشنل لائبریری آف پاکستان کے ڈائریکٹر غیور اختر صاحب سے میرے کام کی بابت اظہار خیال کیا اور بتلایا کہ قومی لائبریری کے علاوہ یہ معاملہ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔

جناب غیور اختر صاحب کا جتنا شکریہ ادا کیا جائے کم ہے کیونکہ انہوں نے اس کار خیر میں خشت اول کا کردار ادا کیا۔ ریاض احمد صاحب نے نیشنل لائبریری میں سے مواد اکٹھا کرنے اور کتب کی فراہمی میں نہایت صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ تحقیق کے دوران جذب و شوق کی کیفیات نے مجھے عجیب اضطراب اور کشمکش میں مبتلا رکھا اور اس بے قراری نے آخر کار اساتذہ کی توقعات پر پورا اترنے کا حوصلہ بخشا۔ کیونکہ

أمن يجيب المضطر اذا دعآه ويكشف

بے قرار کی دعا کو کون قبول کرتا ہے اور اس سے اس کی مشکلات کو دور کرتا ہے۔۔(اللہ)

کئی بار یہ خیال پریشان کر دیتا کہ تعلیم کافی ہے۔ قرآن کریم کی منزل اور امور روزگار کی انجام دہی کے علاوہ تمام کارہائے تحقیق وقت کا زیاں معلوم ہوتے تھے۔ اس عمر سے ناپائیدار کا کیا بھروسہ کہ کب پیغام دوست آجائے اور سب دھرے کا دھرا رہ جائے۔ یہ بنجارہ کیا کرتا۔ مزاج برہم تھا اور رستہ بھی کٹھن تھا۔۔ زمانے نے اتنی کروٹیں بدلیں کہ دوران تحقیق میری حالت جوگی اور مجنوں جیسی تھی۔

اک بے وفا سے پیار کیا ہم نے کیا کیا؟
دل کو داغ دار کیا ہم نے کیا کیا؟

اس مقالے کی تکمیل سراسر حافظ بصیر پوری کی باطنی استعانت کا ثمر ہے ورنہ کہاں افلاک اور کہاں یہ خاک ۔۔۔۔۔۔ مقالہ کی تکمیل میں اپنے احباب کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور دل سے ان کے خلوص کا معترف ہوں جنہوں نے اپنے گوناگوں مصروفیات کے باوجود میرے جیسے مرد ناہنجار سے نبھاہ کیا۔۔ کچھ احباب ایسے بھی ملے جن سے جب بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی تو یہی احساس ہوتا کہ

مجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

شہر الفت میں ہے افلاس کا دورہ حافظ
کوئی اب کس سے وفاؤں کے خزانے مانگے

روز بروز خرابیِ صحت نے راہ فرار اختیار کرنے پر بارہا مجبور کیا مگر شوق و ذوق کا سیل رواں تھا جو تھمتا نہ تھا۔ شاید یہ حضرت حافظ بصیر پوری علیہ الرحمہ کی باطنی توجہ تھی اور اُن کا روحانی تصرف تھا۔ وارداتِ قلبی اور کیفیاتِ باطنی اتنی طوفاں خیز تھیں کہ مجھے لگا کہ سَب کچھ بھول گیا، علم سَلب ہو گیا، قرآن کی آیات مجھ سے رُوٹھ گئیں۔۔۔ مگر بھلا ہو جذبِ دل کا کہ تخیّلات کی کشتی کنارے لگی۔

پنجاب یونیورسٹی لاہور کے عظیم اساتذہ میں ڈاکٹر سیس اکرم اکرام صاحب، ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری، ڈاکٹر ضیاء الحسن صاحب اور ڈاکٹر محمد کامران صاحب کا خصوصی طور پر تہِ دل سے ممنون ہوں کہ کم وقت میں بہت کچھ عنایت کیا۔ علاوہ ازیں بہت سے مُحسنین ہیں جن کے لیے دعا گو تو رہتا ہوں مگر فرداً فرداً نام لینا اُن کے ہاں ریاکاری سمجھا جاتا ہے۔

اَپنی نگران ڈاکٹر غلام فریدہ صاحبہ کا جتنا شکریہ ادا کروں، کم ہے۔ ہر باب کی تکمیل پر میرا حوصلہ بڑھایا اور ہمیشہ ایسے الفاظ سے دل نوازی کی جس سے مجھے اطمینان قلب حاصل رہا۔ عبارت کی تصحیح ہو یا حوالہ جات کی درستی،

انہوں نے اس سلسلے میں شفقت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ ہمیشہ ایک نیا عزم دیا اور بکھرے خیالات کو نظم کیا ۔کمپوزنگ کے مسائل کو حل کرنے میں برادرِ مکرم اسحاق خان صاحب کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا معترف ہوں کہ انہوں نے قلیل وقت میں طویل مسافت کو طے کرنے میں حق دوستی ادا کر دیا اور رتجگے کے باوجود نہایت انکساری کا مظاہرہ کر کے میرا بھرپور ساتھ دیا۔

اول اور آخر میں اپنے والدین کا احسان مند ہوں جنہوں نے مسلسل دعاؤں کے لشکر میرے ہم رکاب کیے، حسیں سپنے اور سہانے خواب دیئے۔ اپنی شب بیدار والدہ ماجدہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی گود سے مجھے قرآن کریم کا پیار ملا اور حسن اظہار ملا۔ میری والدہ وہ واحد ہستی ہیں جن کے صبر و تحمل اور مشفقانہ رویہ نے دوران تحقیق میری وحشت کو درجہ اعتدال پر قائم رکھا اور یہ کام بطریق احسن تکمیل پذیر ہوا۔ ورنہ یہ فقیر پر تقصیر دل گیر ہی رہتا۔۔ میدان خلوص و وفا میں اپنی والدہ کا بہت زیادہ شکر گزار ہوں۔۔ جمالیات جیسے عمیق اور دقیق موضوع پر بلا رفیق خامہ فرسائی کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ اس حوالے سے راقم الحروف حافظ بصیر پوری رحمتہ اللہ علیہ کے جملہ صاحبزادگان خاص طور پر ان کے خلف رشید صاحبزادہ حافظ مشہود احمد صاحب کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ممنون و مشکور ہوں۔ صاحبزادہ صاحب نے حافظ بصیر پوری کے حالات زندگی کو تحریر کرنے میں بھرپور ساتھ دیا۔ حافظ بصیر پوری جیسی شفقت اور پیار عطا کیا۔

میری طبع سیمابی کا پاس رکھتے ہوئے انتہائی مروت سے کام لیا اور تحقیقی کام میں میری بہت زیادہ حوصلہ افزائی فرمائی۔ مقالے کو حتمی شکل دینے میں منان لطیف صاحب کا بہت ممنون ہوں اور ان کی علمی و ادبی دیانت داری کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نہایت لطافت سے موضوع کی جمالیات کو مجھ پر آشکار کیا۔ (منان لطیف صاحب کا) ادبی اعتبار کے ساتھ ساتھ منان لطیف صاحب کا اس لیے بھی رہین عنایت ہوں کہ وہ ظاہری ہیئت و بناوٹ کے ساتھ ساتھ میرے جملوں کو باطنی دوربین سے بھی پرکھتے رہے۔ یہ کمال سراسر انہیں صاحب نسبت اور خوش عقیدہ ہونے کی وجہ سے حاصل ہوا اردو کا صرف استاد ہونا مکتفی نہیں۔ صاحب خبر کے ساتھ ساتھ صاحب نظر ہونا اتنا لازم و ملزوم ہے جتنا ایک خوش رنگ پھول کے لیے خوشبودار ہونا ایک اہمیت رکھتا ہے۔

پیر سید ابو سعید گلشن شاہ بخاری کا بے حد مشکور ہوں کہ انہوں نے طریقت کے وہ رموز جو ماوشا کو معلوم نہیں قبلہ حافظ بصیر پوری کی نظم و نثر سے نشان دہی فرمائی۔ محترم شاہ صاحب اردو، عربی، فارسی اور دیگر علوم پر خاصا عبور رکھتے ہیں۔ آخر میں مجھے اپنی کم مائیگی کا اعتراف ہے کہ جمالیات اور اردو ادب میں جمالیات جیسے فلسفیاتی اور اہم موضوع پر بہت کم لکھا ہے شاید اپنی مصروفیات اور خرابی صحت کے باعث اس کا حق ادا نہیں کر سکا امید ہے کہ یہ مقالہ آنے والے لوگوں کے لیے ایک تحقیق کا نیا باب وا کرے گا۔

فلسفہ جمالیات کی بہت سی کتابوں سے خوشہ چینی کی تھی جن کو سپردِ قرطاس لانا باقی تھا مگر وقت کی قلت کے باعث عنانِ قلم کھینچتے ہوئے انہی سطور پر اکتفا کرتا ہوں۔ حاصلِ گفتگو یہی ہے: حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ اس ادنیٰ سی کاوش پر طالب دعا ہوں کہ

خرد بستان جنوں خواہم الٰہی
زِ تو سوزِ دروں خواہم الٰہی
نگاہ بااثر خواہم خدایا
نوائے پرفسوں خواہم الٰہی

حافظ صابر علی

۲۰ جنوری ۲۰۲۱ء

باب اول

ادب اور جمالیاتی عناصر بنیادی مباحث

جمالیات:

جمال یونانی لفظ aisthetikos سے مشتق، بمعنی حِسّی ادراک، جمالیاتی ادراک، جو مرکب ہے جمالیاتی انبساط و تحسین سے۔ aesthete کے معنی ادراک کرنے والے یعنی حسن پرست اور حسن شناس کے ہیں۔ صلاحیتِ حسن کی معطلی کو anaesthesia کہتے ہیں۔ aesthesia کے معنی صلاحیتِ حسن کی بحالی کے ہیں، جسے احساس کی ایک عمومی صلاحیت اور عمل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کسی شے یا فن کی خوبصورتی کے احساس کو جمالیات کہا جاتا ہے۔ عظیم سائنس دان آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے مطابق جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ یقینی نہیں کہ وہی ہو جو ہم دیکھ اور سمجھ رہے ہیں۔ ہمیں وہ چیز جو کچھ نظر آرہی ہے وہ ہماری نگاہ، فاصلے اور زاویے کے علاوہ اور بہت سے ایسے حقائق پر منحصر ہے جن سے ہماری شناسائی نہیں ہوتی یا جن کو ''نامعلوم عوامل'' کہا جاتا ہے۔ اکثر سائنس دانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس کائنات میں کوئی چیز ''مکمل'' نہیں۔ نہ کوئی دائرہ مکمل ہے نہ کوئی خط مستقیم۔ شے اصل میں کیا ہے اور کیا نظر آتی ہے۔ یہ ہماری نظروں کے اسے دیکھنے اور محسوس کرنے پر منحصر ہے۔

مثلاً ہم چاند، سورج اور سیاروں کو گول سمجھتے ہیں جب کہ وہ مکمل گول نہیں۔ اسی طرح فطرت میں کوئی شے نہ خوبصورت ہے نہ بدصورت۔ صرف کسی شے کا وجود ہی اصل حقیقت ہے۔ اسے دیکھ کر آپ کے اندر کون سی حس جاگتی ہے کون سا جذبہ ابھرتا ہے اسی کو ہم جمالیات یا خوبصورتی کہتے ہیں۔ انسان ہر چیز کو ''حواس خمسہ'' سے محسوس کرتا ہے لیکن جمالیات کو حواس خمسہ نہیں بلکہ انسان کی ''چھٹی حس'' محسوس کرتی ہے۔ پانچوں حسیں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں لیکن وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ ہر انسان میں چھٹی حس ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ زیادہ تر لوگوں میں چھٹی حس کی کمی ہوتی ہے تو یہ کچھ غلط بھی نہیں ہوگا۔

اگر ہم بینائی اور نظر کے فرق کو سمجھ لیں تو یقیناً ہمیں جمالیات کو سمجھنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔ ظاہری طور پر دیکھا جائے تو بینائی اور نظر ہم معانی الفاظ ہیں لیکن فنی طور پر ان میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ بینائی دیکھنے کی طاقت ہے اور نظر کسی چیز کی قدر و قیمت کو سمجھنے کا پیمانہ ہو سکتا ہے۔ اور اسی نظر سے نظریات اور فلسفے جنم لیتے ہیں۔ بینائی کی قوت سے ہم چیزوں کو دیکھ تو سکتے ہیں مگر اس کا عمیق مطالعہ نہیں کر سکتے اس کا عمیق مطالعہ کرنے کے لیے نظر کا ہونا

ضروری ہے۔ نظر کو ایک اندرونی احساس بھی کہا جاسکتا ہے جس کے ذریعے ہم کسی بھی چیز کی اچھائی یا برائی کو محسوس کر سکتے ہیں۔

انسان اس کائنات کا حسن ہے۔ ہر زمانے میں ہر مذہب و دین نے اس کے اس جمالیاتی تخیل کا خیال رکھا ہے جو اس کے ساتھ اس کی فطرت کے موافق جڑا ہوا ہے جس کو وہ فنون لطیفہ اور ثقافت کی جمالیاتی اقدار کے پہلوؤں کے ذریعے مختلف تصورات کی بنیاد پر اجاگر کرتا رہا ہے۔ اردو ادب میں اسے ذوقِ جمال یا جمالیاتی ذوق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسانی نفسیات کو خوبصورتی، بدصورتی، اچھائی اور برائی ہر دور میں متاثر کرتی رہی ہے۔ انسان فطرتاً حسن پرست ہے خواہ وہ ظاہری حسن و جمال ہو یا حقیقی حسن یا عشق مجازی ہو یا عشق حقیقی۔ ہر دور میں انسان خوشی، غم، دکھ، درد، رنج، تکلیف جیسے جذبات سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ اس کا موضوع انفرادی محسوسات بھی رہا ہے اور اجتماعی بھی۔

تاریخ کے ابتدائی ادوار میں انسان اجتماعی مشترکہ زندگی گزارتا تھا۔ لہٰذا اس کے ان محسوسات کا محور و مرکز اجتماعیت ہی تھا۔ وہ اپنے ان جذبوں کا اظہار پینٹنگ، سنگ تراشی، مجسمہ سازی، موسیقی، شاعری اور رقص وغیرہ میں کرتا رہا۔ ایک تخلیق کار کا ایسے جذبوں کا بیان کردہ کسی بھی شکل میں اظہار ہی دراصل ایستھیٹکس یا جمالیاتی ذوق کہلاتا ہے جو جمال کے سربستہ کو کھولنے اور سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔ حسن، خوبصورتی اور پرکشش روپ یہ لفظ فکری حوالے سے کائنات کی تخلیق سے پہلے خالق کائنات نے تجویز کیا اور کائنات کو حسن کی تعبیر اور معنویت کی مثال بنا کے پیش کیا۔ حسن نام ہے کسی چیز کا صحیح اور درست توازن۔ امام راغب المفردات میں حسن کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ حسن وہ چیز ہے جو مسرت بخشتی ہے یا جو عقل وحسیات کی رو سے مرغوب ہو، حسن کا نقیض وہ ہے جو غم لاتا ہے۔

جمال کی تعبیر کو قرآن میں ''حسنہ'' کہا گیا ہے جس کے معنی زندگی کے ہر گوشہ میں سامان راحت، آسائش، انفرادی اور اجتماعی حیات کے پہلوؤں کا احاطہ کرنا ہے۔ قرآن نے انسانی قد و قامت کے جمالیات کو چار مدارج میں تقسیم کیا ہے۔ تخلیق، تسویہ، تعدیل اور ترکیب صوری۔ جمالیات کے مختلف پہلوؤں میں جمالیاتی حقائق، جمالیاتی اقدار، ماورائی جمالیات، جمالیاتی رجحانات، جمالیاتی حظ، جمالیاتی حسیات اور جمالیاتی ذوق وغیرہ شامل ہیں۔

فکری طور پر جمالیات ایک وسیع موضوع ہے جو اپنے ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے آج تک کے انسانی فکر و جمال کے مختلف زاویوں اور روایات کا احاطہ کرتا آیا ہے جس میں انسانی معاشرت سے متعلق ہر چیز سمونے کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ معاشرے کے تاریخی ارتقاء کے دوران سماجی شعور کی متنوع صورتوں نے خود کو انسان کی زندگی اور روحانی فعالیت کے مختلف سانچوں میں ڈھالا۔ انسانی تاریخ کے ابتدائی مراحل سے جمالیاتی محسوسات، تجربات اور ادراکات بھی اس میں شامل ہو گئے جس کے نتیجے میں سماجی زندگی کی ایک معینہ ہیئت ارتقاپذیر ہوئی جس میں انسان کی

حقیقت و واقعیت کے ساتھ جمالیاتی رویوں نے خود کو مستحکم کیا، ایک سانچے میں اپنے آپ کو ڈالا اور ترقی کی منازل طے کیں۔

جمالیاتی ارتقاء کے دوران نہ جانے کتنے تصورات پیدا ہوئے، تبدیل ہوئے، مختلف تصورات میں نئے مفاہیم کی جہتیں پیدا ہوئیں، خود جمالیات نے کتنی اصطلاحات خلق کی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

جمالیات کے بنیادی مباحث

حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم زندگی کے ہر شعبے میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے، کیونکہ اس میں ہر بنیادی مسئلہ حیات کا حل موجود ہے لیکن معارف قرآنی سے آگاہ ہونے کے لئے اس پر اس قلب کے ساتھ غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ جو اپنے حسن فطری سے منور ہو۔ اس سے پیشتر کہ نفس مضمون پر بحث کا آغاز کیا جائے۔ اس واقعیت کا اظہار کر دینا ضروری ہے کہ قرآن حکیم نے آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے حیات انسانی کے اس اساسی مسئلے پر، جسے جمالیات کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، روشنی ڈالی ہے اور اسے اس انداز بیان سے حل کیا ہے جو ذہن انسانی کے ارتقائے مدام کے باوجود ہر زمان و مکان میں اس کی جمالیاتی حس کے اس بنیادی جذبے کی تشفی کرتا رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں اس نے جمالیات کے اسی اساسی مسئلے کا ایسا حل بتایا ہے جو زمان و مکان کی اضافیت میں مطلق حیثیت رکھتا ہے۔

رنگ و نور کے اس جنت نگاہ نگار میں اگرچہ ہر شے اپنے حسن کی دل آویزی کے ساتھ ذوق نظر کی تسکین کا سامان ہے لیکن حسن کی قیامت سامانیوں کا کچھ اور ہی رنگ ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انسان اپنے قد و قامت کی موزونیت و جاذبیت اور شکل و شباہت کی نظر افروزی و دلکشی کے اعتبار سے حسن تمام کا پیکر بے مثال ہے۔ انسان پر حسن کی یہ ارزانی، اس کے عز و شرف کی وجہ اور فضل ربانی کی دلیل ہے۔ چنانچہ اس واقعیت کی طرف باری تعالیٰ نے کئی مرتبہ انسان کی توجہ کو منعطف کیا ہے۔

وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (۶۴:۳)

اور تمہاری صورتیں بنائیں تو کیا ہی حسین صورتیں بنائیں۔ ۱

یہ بات ثابت ہو جانے کے بعد انسان اس عالم انفس و آفاق میں حسن و نظر افروزی میں آپ اپنی مثال ہے، ہمیں پہلے اس بات کا سراغ لگانا ہوگا کہ اس کے حسن کی وجہ حقیقی کیا ہے؟ ماہیت حسن کے راز سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے میرے نزدیک جستجو کی یہ راہ نسبتاً زیادہ آسان اور موزوں ہے۔ بہر کیف وجود انسانی میں کس طرح حسن و نظر افروزی پیدا ہوتی ہے؟ اس راز کو باری تعالیٰ بلیغانہ انداز میں نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کرتا ہے۔

اِلّا اس (باری تعالیٰ) نے تیری تخلیق کی (یعنی تیرا ہیولیٰ تیار کیا)، پھر تیرے (عناصر) میں مناسبت و ہم آہنگی حد کمال تک پیدا کی۔ پھر ان میں تناسب و اعتدال پیدا کی، اس کے بعد جیسی شکل و صورت بنانا چاہی، اس کے مطابق ترکیب دے دی۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصرؔ نے ''جمالیات قرآن حکیم کی روشنی'' میں ـــ آیات مذکورہ بالا میں وجود انسانی کی تخلیق سے لے کر اس کی صورت گری تک جن چار ارتقائی مرحلوں کا ذکر کیا ہے، وہ حسبِ ذیل ہیں:۔ [ارسطو نے اسے محاکمات یا تشبیہ قرار دیا ہے]

''اول: تخلیق۔ اس سے یہاں مراد وجود انسانی کا خاکہ بنانا، اس کا ہیولیٰ تیار کرنا ہے۔

دوئم: تسویہ۔ کسی کے عناصر ترکیبی میں مطلق اور اضافی ہر حیثیت میں اس طرح مناسبت و ہم آہنگی پیدا کرنا کہ وہ موزونی و کمال کا مظہر بن جائے۔ [اسلامی فلسفہ میں: کسی تخلیق کا ہر حیثیت سے موزوں اور باکمال مظہر ہونا ہے]

سوئم: تعدیل۔ انفرادی اور مجموعی، جزوی اور کلی، مطلق اور اضافی، ہر حیثیت میں کسی شے کے مختلف اجزا میں تناسب و اعتدال روا رکھنا۔

چہارم: ترکیب صوری۔ شکل و صورت بنانا، نوک پلک نکالنا وغیرہ۔ اس میں ڈیزائن بنانے کا بھی مفہوم مضمر ہے۔''۲

تخلیقی فعلیت کے متذکرہ بالا چاروں ارتقائی مرحلوں پر غور کرنے سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ نہ تو تخلیق اور نہ ہی ترکیب صوری کے عمل سے وجود انسانی میں حسن پیدا ہوتا ہے بلکہ حسن آفرینی کا راز تسویہ و تعدیل کے عمل میں مضمر ہے۔ ان آیات پر مکرر غور کریں تو حقیقت کے اس پہلو پر بھی نظر پڑتی کی تخلیق فعلیت کے اس سلسلے کی چاروں کڑیاں اس طرح مربوط و منضبط ہیں کہ ان کے نظم و ضبط نے وحدت کی صورت اختیار کر لی ہے اور یہ وحدت ہی فن کاری یا حسن آفرینی کی علت تامہ ہے۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کسی فنی تخلیق میں وحدت کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ فن کی یہ مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ فنی تخلیقات میں وحدت، تناسب و ہم آہنگی کے کمال سے پیدا ہوتی ہے، جس کے لئے قرآن حکیم نے تسویہ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس امر کی تصدیق متعدد آیات قرآنی سے ہوتی ہے۔ مثلاً

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ سورۃ ص: ۷۱

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ سورۃ الحجر: ۲۹ سورۃ ص: ۷۲

جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے انسان پیدا کرنے والا ہوں، چنانچہ جب اس (کے عناصر ترکیبی) میں مناسبت و ہم آہنگی حد کمال تک پیدا کر دوں اور اپنی روح اس میں پھونک دوں، تو اس کے سامنے

سجدے میں گر جانا۔

تسویہ سے چونکہ وجود انسانی میں حسن اور موزونیت پیدا ہوتی ہے اس لئے بلاغت قرآنی نے خوب صورت مرد کے لئے بشر اسویا کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

فَأَرْسَلْنَآ إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹۔۱۷)

چنانچہ ہم نے اپنی روح کو اس کی طرف بھیجا، تو وہ ایک خوب صورت مرد کے روپ میں ظاہر ہوا۔

اس بحث سے یہ ثابت ہوا کہ حسن انسانی، تسویہ کا مرہون منت ہے کیونکہ اس وحدت سے فن پیدا ہوتی ہے۔اس مقام پر بعض تشکیک پس طبائع میں چونکہ یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ تسویہ صرف حسن انسانی کا مبنی ہے اور دیگر فنی تخلیقات میں حسن نہیں پیدا ہوتا، قرآن حکیم نے نہایت واضح اور جامع الفاظ میں اس امر کی صراحت کر دی کہ تخلیقی فعلیت میں تسویہ کی حیثیت مطلق ہے، لہذا کوئی فنی تخلیق اس کے بغیر حسین نہیں بن سکتی۔

الذی خلق فسوی (سورۃ الاعلیٰ: ۲)

اس نے ہر شے کو پیدا کیا اور اس میں مناسبت ہم آہنگی حد کمال تک پیدا کی۔اور اس تسویہ کا اعجاز ہے کہ خالق حقیقی کی ہر شے حسن و نظر افروزی کی آئینہ دار ہے۔

الذی احسن کل شیء خلقه (سورۃ السجدہ: ۷)

(اس نے جو چیز بھی بنائی حسین بنائی) ۳

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ تعدیل و تسویہ کی دو اہم قدریں ہیں، جنھیں اصطلاح میں جمالیاتی قدریں کہتے ہیں اور ان میں سے تسویہ ایسی قدر ہے جو بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔لہٰذا وہ اساسی جمالیاتی قدر ہوئی اور اس کے اعجاز ہو گیا کہ اشیاء کا حسن تسویہ کی اساسی جمالیاتی قدر کا مرہون منت ہے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اشیاء میں وہ اساسی جمالیاتی قدر ہے یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں حسن کو معلوم کرنے کا معیار یا اس کو پرکھنے کی کسوٹی کیا ہے؟ غور سے دیکھیں تو تسویہ بذات خود حسن کو پرکھنے کا معیار یا کسوٹی ہے، جسے صاحب فن اور اہل ذوق کی نظر خوب پہچانتی ہے۔ میں نے صاحب فن اور اہل ذوق کی تخصیص اس لیے کی ہے کیونکہ ان کی نگاہوں میں تسویہ یا مناسبت و ہم آہنگی درجہ کمال تک پائی جاتی ہے، مگر اس کے برعکس عام انسانوں کی نظروں میں اس معیار حسن کو معلوم کرنے کی استعداد یا بصیرت دو طرح سے پیدا ہوتی ہے۔

۱۔ایک تو مشق و مزاولت سے جسے کسبی کہتے ہیں۔

۲۔دوسرے فطری طور پر جس کا نام وہبی ہے۔

چنانچہ یہ بصیرت اس شخص میں درجہ کمال تک پہنچی ہو گی جس کی بصیرتوں میں ہم آہنگی کم ہو گی اسی

نسبت سے اس شخص میں حسن کو معلوم کرنے کی استعداد یا بصیرت کم ہو گی۔ اصل یہ ہے کہ یہ بصیرت، حسن کا موضوعی معیار ہے اور اس سے ہر شخص بہرہ مند ہے۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (سورۃ التین : ۹۵۔۴)

بلاشبہ ہم نے انسان کی فطرت کو بہت حسین بنایا ہے۔ ۴؎

یہ احسن تقویم ہے جسے میں نے بصیرت کے نام سے تعبیر کیا ہے اور اسی لفظ کو جمالیاتی حسن یا حسن جمال کے نام سے پکارا جاتا ہے اور اب یہ نفسیاتِ انسانی کی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اس جمالیاتی حسن کی وجہ ہی انسان خوب صورت چیزوں سے حظ اٹھاتا ہے اور مسرور ہوتا ہے۔ اس سے نتیجہ نکلا کہ سرور انگیزی حسن کا خاصہ ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ جو شے سرور انگیز ہو گی، وہ حسین بھی ضرور ہو گی۔ بالفاظ دیگر وہ شے تسویہ کی اساسی جمالیاتی قدر کی ضرور حامل ہو گی۔ چنانچہ حقیقت کے اس پہلو کی قرآن حکیم اس طرح نقاب کشائی کرتا ہے۔

لَّوۡنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيۡنَ (سورۃ البقرہ: ۶۹)

اس کا رنگ دیکھنے والوں کو خوشی بخشتا ہے۔ ۵؎

اس آیت میں نکتہ اور قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ یہاں حسن کے لفظ کو محذوف کر کے اس حقیقت کو آشکار کیا گیا ہے کہ حسن کی صفت مطلق سے ہر دل آشنا ہے اور اسے فطری طور پر محسوس کرتا اور پہچانتا ہے اور دل کی یہ انفعالی قوت جسے **وجدان** بھی کہتے ہیں، حسن کی اس صفت سرور انگیز کو معلوم کرنے کا موضوعی معیار ہے۔

آیت حوالۂ بالا میں حسن کے لفظ کو محذوف کر کے اس کی صفت سرور انگیزی کو بیان کیا گیا ہے، لیکن دوسری جگہ اس کی صفت کا بظاہر کوئی ذکر نہیں، لیکن لفظ ــــ (جمال) کو اس انداز سے فقرے میں استعمال کیا گیا ہے کہ جمال کی حقیقت سرور انگیزی خود بخود آشکار ہو گئی ہے۔

وَلَكُمۡ فِيۡهَا جَمَالٌ حِيۡنَ تُرِيۡحُوۡنَ وَحِيۡنَ تَسۡرَحُوۡنَ۝ (سورۃ النحل: آیت نمبر ۶)

اور تمھارے لیے چوپایوں میں، جب شام کے وقت چراگاہ سے واپس لاتے

ہو اور صبح کو لے جاتے ہو، جمال ہے۔ ۶؎

اس آیت میں چوپایوں کے خرام ناز کے نظر افروز نظاروں کی سرور انگیزی کو (جمال) سے تعبیر کر کے بتایا گیا ہے کہ حسن و سرور لازم و ملزوم ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حسن اور سرور ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ حسن چونکہ اس کا معروضی پہلو ہے لہٰذا اس کا تعلق حواس سے ہے اور سرور چونکہ اپنی نوعیت میں موضوعی ہے لہٰذا یہ قلب سے متعلق ہے۔ چنانچہ جو شے حواس کے نزدیک حسن ہے، اسی شے کو قلب سرور کہتا ہے۔

اس جگہ ایک اہم نکتہ بیان کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ محبت یا عشق کا حس اور قلب کی ہم آہنگی میں

مضمر ہے۔اس امر کی توجیہ یہ ہے کہ محبت ہمیشہ اس شے سے ہوتی ہے جسے انسان حسین سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہر حسین شے سے، ہر شخص اتنی شدت سے محبت نہیں کرتا جتنی شدت سے دوسرا، بلکہ وہ اس شے سے محبت کرتا ہے جو اس کی نظر میں اسی قدر حسین ہوتی ہے جس قدر اس کا قلب اس سے طمانیت و سرور حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ ذوق نظر کی تشفی اور قلب کی مسرت میں کمیت و کیفیت کے اعتبار سے مکمل ہم آہنگی یا وحدت پائی جاتی ہے تو انسان کے قلب میں اسی شے کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ محبت اس اعتبار سے اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ محبوب، عاشق کے نزدیک حسن و سرور کا مثالی نمونہ ہوتا ہے۔ ہر شخص چونکہ اپنی موضوعی انفرادی حیثیت رکھتا ہے اس لیے ہر شخص کا یہ مثالی نمونہ بھی مختلف ہوگا۔ بالفاظ دیگر افراد نسل انسانی کے ذوق حسن میں تفاوت کا پایا جانا ضروری ہے۔

حافظ بصیر پوری چونکہ قرآن کریم سے ہمہ وقت جڑے رہے۔ اس لیے ان کی جمالیات کو قرآن کریم کی آیات سے ہی بیان کیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے اپنے اس نظریہ حسن کی صراحت کئی ایک دلکش مگر جامع اسالیب سے کی ہے، مثلاً سورۃ السجدہ میں اس کو ٹھنڈک سے تعبیر کیا ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

(سورۃ السجدۃ: ۳۲۔۱۷)

چنانچہ کوئی متنفس نہیں جانتا کہ آنکھوں کی ٹھنڈک سے کیا (حسین) چیز (یعنی جنت) چھپائی ہوئی ہے، جو ان کے (حسین) عملوں کا بدلہ ہے۔

اس آیت کریمہ کے سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہے کہ ما اخفی لھم من قرۃ اعین سے مراد جنت اور جنت حسن کا بے مثال شاہکار ہے۔

وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (سورۃ ال عمران: ۱۴)

اللہ کے پاس لوٹ کر جانے کی حسین جگہ ہے۔

وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ (سورۃ ص: ۲۵)

اور بلاشبہ ان کے واسطے ہمارے حضور قربت کا مرتبہ اور لوٹنے کی جگہ حسین ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (سورۃ الفرقان: ۷۵۔۷۶)

ان ہی لوگوں کو بلند مقامات بدلے میں دیے گے، اس لیے کہ انھوں نے صبر

سے کام لیااور اس میں دعااور سلامتی ملے گی۔اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ آرام
اور پڑاؤ کرنے کی حسین جگہ ہے۔ ۷

جنت کو (قرۃ العین) اور (حسن المآب) کے الفاظ تعبیر کر کے قرآن حکیم نے اس واقعیت کی صراحت کر دی کہ حسن اور سرور ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ چنانچہ اس نے اسی لیے سورۃ الدھر (۷٦) میں جنت کو نضرہ و (سرور) کہا ہے۔

وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا (سورۃ الدھر ۷٦۔۱۱)

انھیں رونق وخوب صورتی اور خوشی سے ملا دیا۔ ۸

عربی زبان میں نضرۃ کے لغوی معنی رونق وخوبصورتی کے ہیں اور یہ حسن کی انفعالی خوبی ہے لیکن اس کے برعکس تسکین آفرینی اور سرور انگیزی حسن کا فعلی وصف ہے۔ نضرۃ اور سرور کے الفاظ کو آیت محولہ بالا میں اس طرح استعمال کیا گیا ہے کہ قرآن حکیم کے اس نظریہ حسن کی از خود صراحت ہو گئی ہے کہ حسن اور سرور ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ اس بحث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کے نزدیک معرفت حسن کا موضوعی معیار تسکین حواس اور سرور قلب ہے۔ حاصل بحث یہ ہوا کہ ہر وہ فنی تخلیق حقیقت میں حسین ہو گی جو حواس کو تسکین اور قلب کو حقیقی خوشی پہنچانے کے قابل ہو گی۔ حسن کی مذکورہ بالا پیرایوں میں تصریح کرنے کے علاوہ قرآن حکیم نے اس انداز سے تعریف کی ہے، جسے حسن کی مابعد الطبیعیاتی تعریف کہہ سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کائنات کی ہر شے حسین و نظر افروز ہے، کیونکہ خالق حقیقی نے اسے ایسا بنایا۔

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (سورۃ السجدہ: ۷)

وہ ذات جس نے جو چیز بھی بنائی، خوب صورت بنائی۔ ۹

اور اس کے ہر شے کو حسین بنانے کی ایک وجہ حضور اکرم ﷺ نے یہ بتائی کہ اللہ تعالیٰ حسین بھی ہے اور حسن کو چاہتا بھی ہے:۔

اللہ جمیل ویحب الجمال۔ (الحدیث) ۱۰

اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ جب قرآن حکیم کی رو سے وہی اصل حقیقت ہے اور اس کے علاوہ باقی ہر شے غیر حقیقی ہے تو پھر اس کے ماسوا ہر شے اضافی نہیں ہو گی؟ ذات باری تعالیٰ کے سوا یقیناً ہر شے کی حیثیت اضافی ہے اور اسی وجہ سے ہر شے اپنے ظہور و بقا کے لیے کسی مطلق حقیقی کی مرہون منت ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خلقت کائنات کے حسن کے ظہور و بقا کا کس مطلق حقیقت پر انحصار ہے؟

قرآن حکیم کی رو سے اس کا جواب یہ ہے کہ اس کائنات کی تمام نظر وافروزیاں اور جمال آرائیاں چونکہ حسن خداوندی کی مرہون منت ہیں اس لیے حسن کائنات کا مبداء اور منبع بھی اللہ کا حسن مطلق ہے۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورۃ النور: ۳۵)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔۱۱

اس آیت میں نور کو قرآن حکیم نے حسن مطلق کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور اس لفظ کا حقیقی مفہوم بھی یہی ہے، کیونکہ نور، ظلمت کو قرآن حکیم قبیح، باطل اور ناخوب کے معنوں میں استعمال کرتا ہے اور ان ہی الفاظ کو اس نے حسن کی اضداد کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ نور حسن مطلق کی حقیقت ہے تو یہ مسلمہ امر ہے کہ جوہر عقل کے بغیر پہچانا نہیں جاسکتا کیونکہ

؎ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

لہٰذا ذہین انسان ہر شے کو اس کی اضافی حیثیت میں پہچان اور سمجھ سکتا ہے اور مطلق حیثیت میں اس کا ادراک نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ذہن انسانی کے اس عجز کے پیش نظر قرآن حکیم نے حسن مطلق کے متعلق صرف اتنا کہا کہ وہ منفرد اور بے مثال ہے۔

لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (سورۃ الشوریٰ: ۱۱)

اس (حسن مطلق) کی مثل کوئی چیز نہیں۔۱۲

حسن مطلق چونکہ منفرد و بے مثال ہے کہ اس لیے اس کی ماہیت پر بحث نہیں ہو سکتی۔ اسکے علاوہ وہ بذات خود حقیقت ہے اور حقیقت ایک بحر ناپیدا کنار ہے جسے الفاظ کے کوزے میں بند نہیں کیا جاسکتا۔ حسن مطلق کے حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (الحق) ہے۔

اللہ جب (الحق) ہوا تو اس کا حسن بھی حق ہوا، بالفاظ دیگر وہ بذات خود حقیقت ہوا۔ لہٰذا حسن مطلق کی حقیقت یہ ہوئی کہ وہ برحق ہے اور کوئی شخص یہ سوال کرے کہ حق کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہو گا کہ وہ حسن مطلق ہے جو منفرد و بے مثال ہونے کی وجہ سے فہم انسانی میں نہیں آسکتا۔

آخر میں ایک لطیف نکتے کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ قرآن کی رو سے پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ حسن اشیاء کی اصل تسویہ میں مضمر ہے۔ ظاہر ہے کہ تسویہ کا دوسرا نام وحدت ہے۔ اس طرح مذکورہ بالا بحث سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس کائنات کے حسن و نظر افروزی کی وجہ حقیقی حسن مطلق ہے اور چونکہ اس کی اصل وحدت میں مضمر ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ حسن اشیاء بھی اپنی اصل کے اعتبار سے وحدت کا آئینہ دار ہے۔ اس سے بات ثابت ہوئی کہ حسن کی مندرجہ دونوں تعریفیں اگرچہ بظاہر مختلف نظر آتی ہیں لیکن حقیقت میں ایک ہی ہیں کیونکہ ان

دونوں میں ہم آہنگی یا وحدت پائی جاتی ہے۔

جمالیات کی تاریخ اور ادب میں جمالیاتی عناصر کی اہمیت

حسن اور فن کے فلسفے کا نام جمالیات ہے۔ بام گارٹن (۱۷۱۴ء۔ ۱۷۶۲ء) نے تاریخ جمالیات میں سب سے پہلے فلسفۂ حسن کے لیے ایستھیٹکس (Aesthetics) یعنی جمالیات کی اصطلاح استعمال کی اور اس کو فلسفے کا ایک علیحدہ مستقل شعبہ قرار دیا۔ اس لحاظ سے جمالیات کا علم اپنے نام سے زیادہ قدیم ہے۔ لغوی اعتبار سے اس کا مفہوم وہ نہیں جو اس سے اصطلاحاً لیا جاتا ہے۔ ایستھیٹکس دراصل یونانی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ایسی شے کے ہیں جس کا ادارک حواس کے ذریعے ہوتا ہے۔ لیکن بام گارٹن نے اس علم کو جمالیات کے لفظ سے تعبیر کیا جو احساس اور ادارک دونوں پر دلالت کرتا ہے، اور اس کا اطلاق حسن پر کیا۔ اس طرح یہ لفظ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ رواج پاتا گیا اور مستقل طور پر فلسفۂ جمال کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا لیکن اس کے مفہوم میں بتدریج وسعت و گہرائی پیدا ہوتی رہی اور بالآخر جمالیات کی اصطلاح جدیدہ حسن اور فن دونوں کو محیط ہو گئی لہٰذا اب اس کا موضوع صرف حسن ہی نہیں بلکہ فن بھی ہے اور اس کے تحت دونوں کے فلسفے پر بحث کی جاتی ہے۔

حُسن اور فَن

حسن اور فن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فن دراصل حسن کاری کا دوسرا نام ہے، یعنی حسن کو تجسیم کرنا۔ حسن جب فن کار کی شعوری کوشش سے، چاہے یہ آمد ہو یا آورد، کوئی شکل و صورت اختیار کرتا ہے تو اسے فنی تخلیق کہتے ہیں اور فنی تخلیق کے حسن کی کمیت و کیفیت کے ایک اندازہ کو جمالیات کی اصطلاح میں جمالیاتی قدر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جمالیاتی اقدار کا تعلق براہ راست حواس اور قلب سے ہے۔ حواس اور قلب جو ایک ہی سلسلے کی معروضی اور موضوعی کڑیاں ہیں، مشق و مزاولت سے جب پوری طرح مشاق ہو جاتے ہیں تو کسی فنی تخلیق کی جمالیاتی قدروں کو صحیح طور پر معلوم اور متعین کر سکتے ہیں۔ حواس سے مقصود ہماری حسیاتی قوتیں ہیں۔ مثلاً باصرہ، سامعہ، شامہ، لامسہ اور ذائقہ اور قلب سے مراد انفعالی اور فعلی قوتیں ہیں۔

حسن اور فن کیا ہیں؟ اصل یہ ہے کہ یہ سوال جمالیات میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے پیشتر کہ قرآن حکیم کی روشنی میں جمالیاتی عناصر معلوم کرنے کی کوشش کی جائے اس جگہ حسن اور فن کے اُن مشہور اور اہم نظریات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو تاریخ جمالیات میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، تاکہ اس سے قرآن حکیم کے اساسی جمالیاتی نظریات کو واضح طور پر سمجھنے میں مدد مل سکے۔

حسن اور فن سے متعلق متعدد مکاتبِ فکر ہیں جن کے نظریات ایک دوسرے سے متخالف و متضاد ہیں لیکن

اس تخالف و تضاد میں ایک ایسا تال میل پایا جاتا ہے جو فکرِ انسانی کے ارتقا کا آئینہ دار ہے۔ ان نظریاتِ حسن کا مطالعہ قرآن حکیم کے جمالیاتی نظریات کو سمجھنے کے لیے ازبس مفید اور ضروری ہے، لیکن ان پر مفصل بحث کرنا میرا نہیں بلکہ مورّخ جمالیات کا فرضِ منصبی ہے، لہٰذا اس جگہ ان پر صرف طائرانہ نگاہ ڈالنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

قرآن حکیم نے فلسفۂ جمال کے رموز و اسرار کی وضاحت کر کے ذہنِ انسانی کو اس کی حقیقت سے آشنا کیا اور حسن کو مقصدِ حیات قرار دے کر اس کی غیر معمولی اہمیت و ضرورت پر بجا طور پر زور دیا لیکن باوجود اس واقعیت کے مغربی مفکرین نے جو یقیناً اسلام کے جمالیاتی نظریات سے متاثر و مستفید ہوئے، جمالیات کی ترویج و ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

سقراط

سقراط (۴۶۹۔۳۹۹ قبل مسیح) جو یونان کا سب سے پہلا فلسفی تسلیم کیا جاتا ہے، وہ حسن کو ذاتِ خداوندی کا مظہر سمجھتا ہے۔ اگرچہ اس نے واضح طور پر حسن کی ماہیت پر کچھ نہیں کہا لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے متقدمین کی طرح تناسب و ہم آہنگی کو حسن کے ناگزیر اجزائے ترکیبی سمجھتا ہے۔

حسن اور فن کے تعلق کی نوعیت اس کے نزدیک اصل اور فرع کی سی ہے۔ وہ حسن کو اصل اور فن کو فرع خیال کرتا ہے۔ اصل اور فرع چونکہ ایک نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے حسن اور فن بھی ایک نہیں ہو سکتے۔ مزید برآں حسن چونکہ حقیقت ہے، اس لیے فن حقیقت نہیں ہو سکتا، اور چونکہ یہ حقیقی قدروں کا حامل نہیں اس لیے اس کا باطل اور لا حاصل ہونا لازمی ہے۔ اس نے حسن اور فن کے تعلق پر ایک اور انداز سے بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے نزدیک حسنِ مطلق کا مظہر مکمل فطرت یا کائنات مشابہت رکھتی ہے فن کار اپنے کمالِ فن کے باوجود چونکہ فطرت کی مثل اپنی فنی تخلیقات کی تکمیل نہیں کر سکتا، اس لیے فن ناقص اور ادھورا ہوا۔ سقراط حسن اور خیر کو چونکہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ تصور کرتا ہے، لہٰذا وہ ہر اس شے کو جو حسنِ مکمل نہیں، حیاتِ انسانی کے لیے سود مند نہیں سمجھتا۔ اس کا نظریۂ فن یقیناً افادی ہے لیکن اس کی افادیت کا مفہوم اس سے بہت زیادہ وسیع ہے، جتنا کہ علمائے جمالیات عام طور پر سمجھتے ہیں۔ وہ افادیت سے روح کی سکینت و رفعت مراد لیتا ہے اور اس کو پھر حسنِ عمل یا اخلاقِ حسنہ کا منبع سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ روح چونکہ غیر فانی ہے اس لیے اس کی افادیت بھی زمان و مکان کی قیود سے ماورا ہے۔

افلاطون

افلاطون کے نزدیک حسن بے شک حسیاتی اور روحانی خوشیوں کا مبدأ ہے، لیکن وہ صرف ان مسرتوں کو مقصودِ زندگی سمجھتا ہے جو پاکیزہ ہیں اور یہ صرف حسنِ قلب کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہیں چنانچہ نیکی اور مسرت کے باہمی تعلق کی صراحت کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

موسیقی کو نفاست اور خوشی سے ناپ لیا جاسکتا ہے، لیکن ہر کس و ناکس سامع کی خوشی سے نہیں۔ خوب صورت ترین موسیقی وہ ہے جو سب سے زیادہ تعلیم یافتہ شخص کو سب سے زیادہ خوش کرتی ہے اور خاص کر وہ موسیقی جو اُس شخص کو خوشی بخشتی ہے جو نیکی اور علم میں معروف ہے۔[۱۳]

افلاطون اور ارسطو کے جمالیاتی نظریات میں نمایاں فرق ہے۔ افلاطون تصوریت پسند ہے۔ اس کے نظریے کی بنیاد اُن اصولوں پر مبنی ہے جو حیاتِ انسانی کے مطالعے سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ارسطو ثنیئت یا حقیقت پسند ہے اور اس کے نظریے کا مبنیٰ وہ علمی مواد ہے جو اس کے سامنے موجود تھا۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ افلاطون فن کو فلسفیانہ اظہار و ابلاغ کا ذریعہ سمجھتا ہے اور تنقید اس کی نظر میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کا نام ہے کہ فن کا پیام، فلسفے کے پیام سے کس قدر مطابقت و ہم آہنگی رکھتا ہے۔ ارسطو اس کے برعکس فن کو اخلاقی مقصدیت سے علیحدہ اور آزاد تصور پیش کرتا ہے۔ ''اخلاقیات'' میں ارسطو لکھتا ہے کہ فن تخلیقی صلاحیت اور عقل کی وحدت کی تخلیق ہے۔ ''شعریات'' میں وہ لکھتا ہے کہ تخلیقی صلاحیت کا سرچشمہ نقالی کا قدیمی جذبہ ہے۔

ارسطو اور افلاطون کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے پر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ارسطو نقالی میں تمام تخلیقی فن کی اصل کو مضمر سمجھتا ہے۔ اور اس سے تخلیقِ مکرر مراد لیتا ہے لیکن افلاطون اس لفظ کو محض شبیہ آرائی یا عکاسی کے مفہوم میں استعمال کرتا ہے۔

ارسطو کا نظریہ حُسن اپنے عہد کے نظریات سے بہت حد تک متاثر نظر آتا ہے لہٰذا وہ بھی حسن کو نیکی اور نیکی کو مسرت سمجھتا ہے۔ ''حسن وہ نیکی ہے جو سرور انگیز ہے کیونکہ یہ نیکی ہے''۔ اس سے وہ یہ بات ثابت کرنا چاہتا ہے کہ حسن، نیکی اور سرور، حقیقتِ مطلق کے تین مظاہر ہیں اور اصل کے اعتبار سے ان میں ہی مقصدِ زندگی مضمر ہے۔

اعتدال اس کی نظر میں حسن، نیکی اور سرور کے درمیان مشترک قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا جس طرح قول و فعل میں اعتدال نیکی کہلاتا ہے، اسی طرح کسی شے کے عناصرِ تخلیقی میں اعتدال اس کے حسن اور سرور انگیزی کا باعث ہے۔

ارسطو قبیح کو حسن کی ایک ناگزیر صفت تصور کرتا ہے اور اسے کئی ایک طریقوں سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ''قابلِ تضحیک'' فرحیہ کا موضوع ہے اور چونکہ یہ فنِ لطیف کے ضمن میں آتا ہے اس لیے یہ خوب صورت شے کی ایک ضروری صفت ہوا۔

ارسطو بھی اپنے پیش رو مفکرین کی طرح فن کو نقالی ہی خیال کرتا ہے اور پھر نقالی کو حصولِ علم و حکمت کا ناگزیر ذریعہ بھی سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک نقالی اگرچہ ناپسندیدہ شے ہی کیوں نہ ہو، نشاط انگیز ہوتی ہے۔ اس کے

علاوہ فن کار کی نقالی محض عام واقعے کی تمثیل آرائی نہیں، بلکہ آفاقی یا مثالی واقعیت ہوتی ہے جس کی تہہ میں معمولی واقعہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ فن کی ہر صنف خصوصاً شاعری کو تاریخ سے زیادہ حقیقت کا آئینہ دار سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک فنِ نقالی سے بدصورت شے بھی خوب صورت نظر آنے لگتی ہے کیونکہ حقیقت سے اس کا مظہر اور مظہر سے اس کی فنی عکاسی زیادہ خوب صورت ہوتی ہے۔ یہ نظریہ ایک اعتبار سے جدید رومانی فن کا سنگ بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ وہ فطرت کو حسن کا معیار تو سمجھتا ہے مگر فن کو عروجِ کمال تک پہنچانے کے لیے فن کار کے تصرف کی اہمیت پر بھی زور دیتا ہے۔ اقبالؔ بھی قریب قریب اسی نظریۂ فن کا حامی معلوم ہوتا ہے:

ہے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تُو کر
(اقبالؔ)

ارسطو اپنے اس نظریے کی بنا پر فن کی یہ تعریف کرتا ہے کہ کسی پیش نظر حقیقت کی نقالی کو اپنے زورِ تصور سے حدِ کمال تک پہنچانا......... اور غالباً اپنے اسی نظریے کی بنا پر وہ شاعری کو فن کے دیگر تمام اوصاف پر ترجیح دیتا ہے۔

جمالیات میں ارسطو کے بعد سب سے اہم فلسفی افلاطونس ہے جو عہد قدیم کے حکماء کے سلسلے کی آخری کڑی اور فلسفۂ اشراق کا بانی ہے۔ اس کے نظامِ فلسفہ میں نور و ظلمت کا مابعد الطبیعیاتی نظریہ چونکہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس نے جمالیات کے مسائل کو بھی اسی نظریے کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

> حسن و تناسب ہم آہنگی کا نام نہیں بلکہ وہ نور ہے جو چیزوں کے تناسب و ہم آہنگی کے اوپر چمکتا ہے اور اسی پر ان کی دلکشی و نظر افروزی کا انحصار ہے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ حسن کا نور، زندہ چیزوں پر تو ہوتا ہے مگر مردہ چہرے پر اس کا صرف شائبہ ہی ہوتا ہے، اگرچہ اس کی صورت، عناصر ترکیبی کے تناسب و ہم آہنگی کے لحاظ سے ابھی خراب بھی نہ ہوئی ہو اور کیا وجہ ہے کہ زندہ نما مجسمے نسبتاً زیادہ خوب صورت ہوتے ہیں۔۔۔[۱۴]

بام گارٹن

بام گارٹن کے نظریۂ جمال میں تصورِ ''کمال'' کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ وہ کمال کو حسن کی ایک ناگزیر صفت سمجھتا ہے اور احساس یا جذبے کی تکمیل کو حسن کا نما دیتا ہے۔ بونیقے کی رائے میں بام گارٹن نے تصورِ

کمال کو براہِ راست وولف سے لیا ہے اور وولف کے نزدیک کمال سے مراد کُل کا اپنے اجزا سے منطقی تعلق یا کثرت میں وحدت ہے اور ان ہی معنوں میں بام گارٹن بھی کمال کے لفظ کو استعمال کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ جذبے یا احساس کے مکمل اظہار کو حسن سے تعبیر کرتا ہے۔ میرے نزدیک اس کا یہ نظریہ حسن جمالیات کے اس مکتبِ فکر کا سنگ بنیاد ہے جو "اظہاریت" کے نام سے مشہور ہے اور جس کا سب سے بڑا علم بردار کروچے تھا۔

بام گارٹن کے نزدیک یہ کائنات جو اختلافات و تضادات اور بو قلمونی و تنوع کی آئینہ دار ہے، اپنے گوناگوں نظاروں کی کثرت کی وجہ سے ایک مکمل ہم آہنگی رکھتی ہے جسے وہ وحدت کے نام سے تعبیر کرتا ہے اور اس وحدت کو وہ کمال اور کمال کو مظہر حسن سمجھتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ فقدانِ کمال یا حریف کمال شے کو قبیح خیال کرتا ہے۔

کانٹ

کانٹ کے نظام فکر میں جمالیاتی قوتِ محاکمہ کو درمیانی حیثیت حاصل ہے اور اس کو اس نے چار اقوالِ محال میں نہایت موثر طریقے سے واضح کیا ہے اور یہ اقوالِ محال ماورائے تجربی تصورات کے ان چار عنوانات سے مماثل ہیں، جن کو عقل محض پر تنقیدی تحقیق" میں زیر بحث لایا گیا ہے اور ان کے ذریعے اس نے اپنے تمام مباحث کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ اس کا خلاصہ پیش حسب ذیل ہے۔

(۱) ذوق کی قوتِ محاکمہ جمالیاتی ہے اور حسن کا خوشگواری اور نیکی سے کوئی تعلق نہیں۔

(۲) حسن ایسی انبساط انگیز شے ہے جو آفاقی اور ضروری ہے اور یہ آفاقیت و ضرورت دونوں موضوعی ہیں۔

(۳) حسن ایک ایسی چیز میں اس حد تک صورت مقصدیت ہے جہاں تک تصور مقصد کے بغیر اس کا احساس ہو سکتا ہے۔

(۴) حسن کا تعلق افادیت و کمال سے نہیں ہے۔

جمالیاتی شعور کی اس نے دو تعریفیں کی ہیں: سلبی اور ایجابی۔ سلبی کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔ "جمالیاتی شعور کا تعلق نہ تو مجرد عقل سے ہے اور نہ ہی حسیاتی تشفی اور اخلاقی تسکین سے"۔ اس کی ایجابی تعریف یہ ہے۔ "جمالیاتی شعور حسن اور عقل کا مقامِ اتصال ہے"۔ ظاہر ہے یہ دونوں تعریفیں ناقص اور ادھوری ہیں۔

کروچے

> کروچے ایک جرمن ماہرِ جمالیات تھا۔ کروچے کے نزدیک حسن اظہارِ مکمل ہے کیونکہ وہ حقیقی اظہار نہیں جو مکمل نہ ہو اس لیے ہم اس نہایت قدیم سوال کا نہایت آسانی سے جواب دے سکتے ہیں کہ حسن اظہار ہے۔ وہ فن کو طبیعیات

اور مابعد الطبیعیات دونوں پر فوقیت دیتا ہے۔ فن کی اصل، تصورات کو تشکیل کرنے کی قوت میں مضمر ہے۔ تخیل بے مثال طریقے سے فن پر حکومت کرتا ہے۔ فن کا کل سرمایہ تخلیقات ہیں۔ انسان جوں ہی تخلیق آفرینی کرنے لگتا ہے، فنکار ہوتا ہے اس سے بہت پہلے کہ وہ عقل سے کام لے۔ ۱۵؎

جمالیاتی فعلیت کا راز اُس پر سکون کوشش میں مضمر ہے جو وہ اس مکمل تمثیل کو سوچنے میں صَرف کرتا ہے جو اس نفسِ مضمون کو ظاہر کرنے والی ہوتی ہے جو اس کے قلب میں ہوتا ہے۔ یہ نفسِ مضمون وجدان کی صورت مستور ہوتا ہے جس میں تصوفانہ بصیرت کو کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ مکمل بصیرت کلی مشاہدے اور جامع تصور کو دخل دیتا ہے۔ فن کا اعجاز معروضی اظہار یا خارج میں صورت گری نہیں بلکہ تصور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے میں ہے۔ خارجی صورت گری تو میکانکی تکنیک اور جسمانی ہنر مندی سے تعلق رکھتی ہے۔

جمالیات قرآنِ حکیم کی روشنی میں:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (سورۃ الروم: آیت نمبر ۳۰)

قرآن حکیم کی رُو سے انسان کی فطرت چونکہ فطرت الٰہی پر بنی ہوئی ہے اس لیے حیاتِ انسانی کے حُسن کی بقا اور ارتقائے مدام کے لیے ضروری ہے کہ وہ موضوعی طور پر رنگ تغیر سے ناآشنا رہے، مگر معروضی لحاظ سے اس کو حرکتِ مدام لازمی ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ حیات انسانی کے حسن و کمال کا راز اس کی موضوعی سکینت و سلامتی اور معروضی حرکتِ مدام میں مضمر ہے۔ حیاتِ انسانی کی موضوعیت سے مراد قلبِ انسانی ہے اور قلب انفعالی اور فعلی قوتوں کے مجموعے کا نام ہے۔ انفعالی قوت کے مرکز کو دل اور فعلی قوت کے مرکز کو دماغ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہوا کہ حیاتِ انسانی کے حسن سے مقصود قلبِ انسانی کا حسن ہے۔ لہٰذا حسن قلب کے لیے ضروری ہوا کہ اس میں سکینت اور سلامتی ہو۔ بالفاظِ دیگر قلب کی سکینت و سلامتی اس کے حسن کی دلیل ہے لیکن اس جگہ اس نکتے کی صراحت کر دینا ضروری ہے کہ قلب کی سکینت و سلامتی کے معنی اس کا جمود و تعطل نہیں ہے کیونکہ اس میں ٹھہراؤ کی کیفیت ہوتی ہے وہ مطلق حیثیت میں ہوتی ہے۔ اضافی حیثیت میں نہیں ہوتی بلکہ اضافی حیثیت میں یہ بذاتِ خود ایک مستقل ارتقائی حرکت میں رہتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انسان یکسانیت سے جلد بیزار ہو جاتا ہے اور ہمیشہ تغیرؒ کو پسند کرتا ہے اور اپنے ذوقِ نظر کی تسکین کے نئے سے نئے سامانوں کی طلب و جستجو میں رہتا ہے۔ انسان کے حسنِ باطنی کے اس تحرکِ ارتقائی کی کیفیت کو حالیؔ اور اقبالؔ نے نہایت ہی دلکش انداز میں بیان کیا ہے:

؎ ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں
(حالیؔ)

؎ ہر نگارے کہ مرا پیش نظر می آید
خوش نگاریست ولے خوشتر ازاں می بائست
(اقبالؔ)

(ہر خوب صورت شخص کہ میری نظر کے سامنے آتا ہے۔ وہ خوب صورت تو ہے مگر میں اس سے زیادہ خوب صورت دیکھنا چاہتا ہوں) ادب سمیت دنیا کی کسی بھی شے کی جمالیات بارے اگرچند لفظوں میں بات کی جائے تو کہا جائے گا کہ جمال دراصل اعتدال کا نام ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ جمال کی کوئی ایک تعریف ممکن نہیں ہے اس کا انحصار دیکھنے والے کی نظر اور اس کے نظریے پر ہے۔ اب اگر اس کائنات کے حسن و جمال پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں یہاں ہر چیز متوازن نظر آئے گی۔

خدا کی سب سے اعلیٰ و افضل تخلیق خود انسان ہے اللہ نے اس کو جس تناسب سے بنایا ہے اس پر تمام سائنس اور سائنسدان دنگ رہ گئے ہیں کہ کارِیگر نے کس طرح ہر چیز کو مناسب خط و خال سے نواز کر ایک شاہکار پیش کیا۔

کسی بھی تخلیق کار کے ہاں پایا جانے والا احساس، ذوق اور وجدان ہی اس کے فن پارے کی حسن و خوبی اور اس کے جمال کا پتہ دیتے ہیں۔ کسی فن پارے کی خوبی اس میں استعمال ہونے والے الفاظ، تراکیب، تشبیہ و استعارہ وغیرہ بھی اس میں جمال کے اظہار کا سبب ہوتا ہے۔ اس سارے مقالے میں ہم انہی بنیادی عناصر کو مد نظر رکھتے ہوئے تجزیہ پیش کر رہے ہیں

حصہ دوم:

نثر میں جمالیات اور جمالیاتی عناصر

اُسلوب:

ادب میں موضوع سے زیادہ اسلوب پر زور دینے والا یا اس سے تعلق رکھنے والا، کسی ادیب یا ادیبوں کے گروہ کا شناختی اسلوب، فنون میں خارجی اسلوب، روش یا انداز، کوئی مخصوص طرز، ادا، وہ طور طریقہ جسے موزوں اور شستہ سمجھا جاتا ہے۔ لکھنے، کندہ کرنے یا خاکہ کشی کے لئے مخصوص نوکیلا قلم اسٹائیلوس ۱۶

انگریزی زبان میں سٹائل کے ساتھ بہت سے اور الفاظ بھی ہیں جن کے مطالعے سے اس لفظ سٹائل کی معنویت اور استعمال کے کئی اور گوشے سامنے آتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

سٹائلر: صاحب طرز، خاص اسلوب کا مالک سٹائلٹ، کٹار، خنجر یا اسی قسم کا کوئی نوکیلا آلہ۔ وجیہ فیشنی معیاروں کے مطابق یا اس سے متعلق۔ طرح دار۔ کسی ایک خاص طرز سے متعلق۔

سٹائلش: کسی وضع یا طرز کا انوکھا پن

سٹائلسٹ صاحب طرز، کسی طرز پر کاربند رہنے والا، طرز پیدا کرنے والا یا طرز کا ماہر

(خصوصاً ادیب یا مقرر) فیشن کا موجد۔

سٹائلسٹکلی: اسلوب بیان کے لحاظ سے۔ ۱۷

ان نکات اور وضاحتوں سے درج ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ کسی بھی کلام کے مخصوص اور موثر بیان کو اسلوب کہتے ہیں۔ غیر معمولی لسانیاتی اظہار کا مخصوص ڈھنگ اسلوب ہے۔

اسلوب لسانیاتی اظہار کا وہ مخصوص انداز ہے جو فنکار کی شخصیت اور موضوع سے متعلق ہوتا ہے اور جو اجتناب، انتخاب، امتزاج، تناسب اور غیر موجود عناصر کے اظہار کے لیے غیر معمولی آلہ کار پر مبنی ہوتا ہے۔

اسلوب کا مقصد قاری کو متاثر کرنا ہے۔

اسلوب صنائع بدائع سے مملو و مزین ہوتا ہے۔

اسلوب کا تعلق انفرادی شخصیت سے ہے اور اسلوب کا تعلق موضوع سے بھی ہے۔

کسی بھی فنکار کے لیے لسانیاتی اظہار کے مخصوص انداز کے متعین راستوں میں ایک سے زیادہ راستے بھی ہو سکتے ہیں۔ اسے کسی خاص انداز کا پابند نہیں بنایا جا سکتا تاہم یہ حقیقت ہے۔

معاصر ادب میں لفظ شناسی اپنے اندر نفسیاتی، سماجی، عمرانی اور تہذیبی و تمدنی تلازمات کی کئی تہیں، پرتیں اور رنگ رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں اسلوبیات ایک جداگانہ مضمون بلکہ سائنس ہے اور ہر اہل قلم کے فکری و فنی تجزیے میں اسلوبیاتی نقطہ نظر کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

ہر بڑا فن کار اپنے فن کے اندر ایسے امکانات کی نشاندہی کر جاتا ہے جو آنے والے زمانے میں بھی اپنی نت نئی تعبیر اور تشریح کے حوالے سے بامعنی ہوتے ہیں۔ گزشتہ ایک صدی میں تنقیدات اقبال کے جائزے سے کلام اقبال کی تشریحات اور معنویت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

اُسلوب کے حوالے سے بھی کلام اقبال کے کئی ایسے پہلو ہیں جو قدیم تنقیدی معیارات کے مطابق محاسن قرار پاجانے جانے کے ساتھ ساتھ اُن میلانات اور رجحانات کی روشنی میں بھی بامعنی اور پر تاثیر ہیں جو جدید تہذیبی، تمدنی، سائنسی، مابعد الطبیعاتی اور لسانیاتی و صوتی علوم و فنون کی عطا ہیں۔

لفظ شخصیت اور اُسلوب خود انسان کا چہرہ نما کیسے بنتا ہے نیز معاصر تخلیقی زمانے سے نسبت رکھتے ہوئے آتی صدیوں کا صورت گر اور بدلتی ہوئی تہذیبوں میں اپنے جداگانہ خوابوں کا تعبیر یاب کیسے قرار پاتا ہے؟ اُردو شاعری میں اس کی مثال اقبال کے کلام میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اقبال کے اُردو کلام کے اُسلوب کے تجزیاتی مطالعے کا مقصد ایسے عناصر کی دریافت اور نشاندہی ہے جن کے سبب اقبال کا کلام رنگ ثبات و دوام کا حامل ہو گیا ہے۔ اقبال کے اُردو کلام کے اُسلوب کے تجزیاتی مطالعے سے قبل لغات اور ماہرین کی آرا کی روشنی میں اُسلوب سے متعلق مسائل اور حتمی موضوعات کا جاننا مناسب ہو گا۔

اُسلوب کے لیے انگریزی کا لفظ "اسٹائل" استعمال کیا جاتا ہے۔ یونانی میں سٹائیلاس اور لاطینی میں سٹائیلس کے الفاظ اُسلوب کے ہم معنی ہیں۔ "انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا" میں اس لفظ کا تعلق لاطینی زبان سے جوڑا گیا ہے اور یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اس لفظ کا ہمیشہ وہی مطلب اخذ کیا گیا ہے جو سٹائل میں پوشیدہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا مطلب لکھنے کا طریق کار، لکھنے کا قلم، تیز چلنے والا قلم جسے اصطلاح کا درجہ حاصل ہے وہ "اُسلوب" ہے اب یہ لفظ ایک ادبی اصطلاح ہی نہیں تنقیدی موضوعات میں ایک جداگانہ فن کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سے اسلوبیات اور اسلوبیاتی لفظ بن گئے ہیں جو سٹائل اور سٹائلسٹک کے فنی پہلوؤں سے متعلق مباحث کے ذیل میں استعمال ہوتے ہیں۔ اُردو لغت میں اسلوب کی درج ذیل تعریف موجود ہے:

1- انداز، وضع، ڈھنگ، روش، طور، طرز

صنم کی زلف پریشاں نے پیچ کھایا ہے ہمارے حال پریشاں کا دیکھ کر اُسلوب
سمیٹیں گے متاع دین و دنیا اپنے دامن میں یہ اسلوبِ مناسب اتحادِ جسم و جاں ہو گا

قدیم اُردو لغات میں اسلوب کا لفظ اپنے عمومی مفہوم طور طریقہ، روش اور طرز کے معنی میں ملتا ہے۔

فارسی زبان میں اُسلوب کے لیے "سبک" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ عربی لفظ ہے۔ سبک یسبک (ضرب یضرب) کے معنی ہیں دھات کو پگھلانا اور سانچے میں ڈھالنا۔ چنانچہ ایسا سونا جسے کٹھالی میں ڈال کر میل سے صاف کر لیا جاتا ہے اُسے سبیک یا مسبوک کہتے ہیں اور دھات کی چیزیں ڈھالنے والی فا ونڈری کو مسبکتہ کہتے ہیں۔ سبک کا مطلب ہے دھات کو پگھلا کے اُسے حشو و زوائد سے پاک کرنا، نکھارنا، ایک سانچے میں ڈھالنا اور کوئی خوش نما شکل دینا۔ یہی عمل اچھے سٹائل میں لفظوں کے ساتھ بھی دہرایا جاتا ہے۔ چنانچہ عربی میں اس کا مفہوم کلام کو حشو و زوائد سے پاک کرنا بھی ہے۔

فارسی زبان میں سٹائل یا اسلوب کے لیے 'سبک' کا لفظ اپنی قبیل کے دوسرے الفاظ (انداز' طرز' روش وغیرہ) سے زیادہ بلیغ اور پُر معنی ہے۔ جمالیتی عناصر اسلوب کی ہی دین ہیں۔ چنانچہ میر صادقی (ذوالقدر) "واژہ نامہ ہنر شاعری" میں سبک کی تعریف میں لکھتی ہیں:

> "سبك(سٹائل)در زبان عربی به معنی گداختن وبه قالب ریختن زرونقره درسٹائل معاول آن در زبان هائی اروپایی از اصل لاتینی گرفته شده به معنی نوعی قلم فلزی است که درزمان هائی قدیم حروف و کلمات رابه وسیله آت بر روی لوح هائی مومی نقش می کرده.......
>
> اصطلاح سبك یا اسلوب در نقدابی(نقد)تعریف ها ئے خنلفی داردامابه طور خلاصه می توان آن راچنین تعریف کرد:شیوه خاصی که نویسنده یا شاعری برای بیان مفاهیم خود به کارمی بردوبه عبارت دیگر این که نویسنده یا شاعر آنچه رامی گوید چگونه بیان می کندحر مباحث جدید تر'سبك را انحراف یا تمایزی دانسته اند که درشیده بیان هر کسے تیست به دیگر شیوه هائی بیان وجوددار دوبه عبارت دیگر' سبك یعنی انحراف از زمر (نیرمر) یاهنجار بیان دیگران یه این معنی که...." ۱۸

اُسلوب کا استعمال صرف طرز تحریر کے معنوں میں نہیں ہوتا بلکہ فنون لطیفہ کے دوسرے ضابطوں میں بھی ہوتا ہے۔ اسلوب تخلیق کا وہ قرینہ ہے جس سے فن کار اپنے موضوع کی گہرائی میں اُتر کر موضوع کا جائزہ لیتا ہے۔ یہ اظہار کا معجزہ اور بات کہنے کا ڈھنگ ہے۔ اسلوب میں فنی خصوصیات اور قوت اظہار پہ توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ زبان

کی عمومی سطح سے اجتناب یا گریز اسلوب ہے۔فنی اظہار میں انفرادیت کی موجودگی اسلوب ہے۔ہر مصنف کی اپنی انفرادیت اس کا اسلوب ہے۔اظہار وزباں کے لیے مناسب لفظوں کا استعمال اسلوب کہلاتا ہے۔کسی ادبی تخلیق کی وہ خصوصیت جس کا تعلق خیال یا موضوع کی مناسب صورت یا اظہار سے ہوتا ہے،اسلوب ہے۔

اسلوب کی درج ذیل تعریفیں کی جاسکتی ہیں۔

1-انفرادی خصوصیات (تحریری اور تقریری)

2-موضوع کے اظہار کا طریق کار

3-ادب کی تخلیقی قوتوں کے اسباب

انفرادی خصوصیات کے اعتبار سے اسلوب خود انسان ہے۔اسلوب کی یہ تعریف ڈاکٹر بوفان نے کی ہے۔

Le Style Estl'Homme Meme ۱۹

مصنف کی شخصیت اپنے نشیب وفراز اور رنگ وآہنگ کے ساتھ الفاظ میں منتقل ہوتی ہے۔یہی بات ایمرسن نے زیادہ واضح الفاظ میں کہی ہے۔

A man's style is his mind's voice ۲۰

بچپن میں جب انسان کا ذہن اثر پزیری کی زیادہ صلاحیتں رکھتا ہے تو ہر چیز کا نقش جلد قبول کر لیتا ہے۔اُسی وقت طرز یا اسلوب کی نشوونما شروع ہو جاتی ہے۔اچھے اسلوب کے لیے لکھنے پر قدرت، اظہار میں سہولت اور دروبست کی صلاحیت ناگزیر ہے۔شوپنہار کے مطابق باطن کی خارجی تصویر اسلوب ہے۔اُسلوب موضوع کے اظہار کا طریق کار ہے۔سوئفٹ نے اسلوب کو(پروپر ورڈزان پروپر پلیسز)مناسب ترین لفظوں کا مناسب استعمال کہا ہے۔

حسن خوبیDefinition of a good style کو بھی اسلوب کے معانی میں لیا جاسکتا ہے-

اُسلوب:

اسلوب در حقیقت صنف نثر میں جمالیاتی عناصر کا ایک پیمانہ ہے۔اسلوب قاری کو جتنا متاثر کرے گا، جمالیات اتنی ہی ہوگی۔موضوع سے ہٹ کر ایک مخصوص نوع کا ذہنی انبساط فراہم کرنے کی قوت رکھتا ہے۔کسی کلام کا اُسلوب اس کی ایسی لسانیاتی خصوصیات میں مضمر ہے جو اس کلام کی زبان کے متوازی اس کی لسانیاتی صورت سے اس کو مختلف کرتی ہے۔انتخاب اُسلوب کی سب سے بہترین تعریف ہے۔کسی ایک زبان کے ایسے دو لفظوں کا فرق اسلوب ہے جن کے معنی تقریباً ایک ہوں لیکن جو اپنی لسانیاتی تشکیل میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔نارم سے اجتناب اسلوب کو منفرد قرار دینا ہے۔

اُسلوب کے حوالے سے چار چیزیں بالکل واضح ہیں۔

۱۔ لسانیاتی انتخاب

۲۔ عمومیت سے اجتناب

۳۔ موثر اظہار بیان

۴۔ غیر معمولی لسانیاتی استعمال

اسلوب بنیادی طور پر ایک شخصی صفت ہے اور جب اسلوب کی مکمل تشکیل ہو جاتی ہے تب وہ کسی بھی مصنف کی شخصیت کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ فنکار کسی سلسلہِ فکر کے اظہار کے وقت وہ تمام کوائف شامل کرے جو سلسلہ فکر کے کامل ابلاغ کے لیے ضروری ہیں۔ اگر اسلوب کی سائنٹیفک تعریف کرنے کی کوشش کی جائے تو جمالیات اور اصول انتقاد دونوں کو کھنگالنا پڑے گا۔ ہندی میں اسلوب درج ذیل مفاہیم کے لیے استعمال ہوتا ہے:

1۔ چال، ڈھب، ڈھنگ 2۔ طریق، رواج، رسم، روایت 3۔ ضابطہ، طرز، طریق 4۔ فقرہ کی تشکیل کے نوع

اُسلوب کی مختلف تعریفوں پر غور کرتے ہوئے ہمیں پانچ اہم نکات نظر آتے ہیں:۔

1۔ اسلوب بمعنی اظہار روح، تصویر دماغ، مظاہر فطرت انسانی، حصہ شخصیت انسانی۔

2۔ اسلوب بمعنی عناصر فکر، لباس فکر۔

3۔ اسلوب بمعنی زبان کا منفرد ذریعہ، بیان کا متوازن طریقہ، اظہار کی ذاتی صفت، بے محابا قوت لسانی۔

4۔ اسلوب بمعنی قاری سے تعلق پیدا کرنے کا سلیقہ، قاری کو متحرک کرنے کا ذریعہ۔

5۔ اسلوب بمعنی لسانی اظہار کے جملہ امکانی عناصر کا استعمال۔

یا لکھنے کا کوئی نوکیلا آلہ کار بھی بیان کیا گیا ہے۔

لفظ اسلوب عربی لفظ سلب سے مشتق ہے۔ انگریزی میں اسلوب سے مراد لکھنے کا طریقہ اور بڑے سیاق میں اظہار کا طریق کار ہے۔

ہندوستانی مصوری میں بھی قلم کا استعمال اسلوب کے لیے ہوتا ہے۔

کسی ادبی شخصیت اور مقرر، ادبی گروہ یا دور کا اپنا منفرد طریق اظہار، مصنف کا تخلیقی ضابطہ جس میں توضیح، قوت تاثیر اور حسن وغیرہ کے اجزا موجود ہوں، بھی اسلوب کہلاتا ہے۔

ہمارے ادبیات میں سٹائل کے مفہوم میں اسلوب کے علاوہ کچھ اور الفاظ بھی کبھی کبھار استعمال ہوتے ہیں ان کی حیثیت اگرچہ اسلوب کے درجہ پر اصطلاح کے طور پر مسلم تو نہیں کیونکہ زیادہ تر (خصوصاً عصر حاضر) میں

ہمارے ہاں اسلوب کا لفظ ہی خاص ہو کر رہ گیا ہے اور اسی سے "اسلوبیات" اور "اسلوبیاتی" کے لفظ معروف ہوئے ہیں۔ پھر بھی اسلوب کے ہم معنی الفاظ کا سرسری ذکر بے جا نہ ہو گا۔

اُسلوب کے مترادفات میں ہمارے ہاں انداز (بیاں)، ادا، ڈھب، روش، طور طریقہ، سلیقہ، طرز، ادا وغیرہ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ درج ذیل اشعار اسلوب کی وضاحت کے لیے دیکھیے:

انداز گفتگو

بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا

سلیقہ

بات کرنے کا سلیقہ اسے آجاتا تھا ان کی صحبت سے بشر آدمی کہلاتا تھا

طرز

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

ڈھب

اب تو ہوئے ہیں ہم بھی ترے ڈھب سے آشنا واں تو نے کچھ کیا کہ ادھر ہم نے پائی بات

ان اشعار میں انداز بیاں، سلیقہ، طرز، ڈھب، ادا، طور، روش، سٹائل وغیرہ کے الفاظ اسلوب کے ہم معنی ہیں اور اپنے لغوی مفہوم کے ساتھ ساتھ شعر کہنے اور بات کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوئے ہیں لیکن ایک ادبی اصطلاح کے طور پر جو لفظ ان دنوں زیادہ رواج پا گیا ہے اور جسے ایک مستند اصطلاح کا درجہ حاصل ہے، وہ اُسلوب ہے۔ اَب یہ لفظ ایک ادبی اصطلاح ہی نہیں تنقیدی موضوعات میں ایک جداگانہ فن کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سے اُسلوبیات اور اُسلوبیاتی لفظ بن گئے ہیں جو سٹائل اور سٹائیلسٹک کے فنی پہلوؤں سے متعلق مباحث کے ذیل میں استعمال ہوتے ہیں۔

کسی بھی فن کار کے لیے لسانیاتی اظہار کے مخصوص انداز کے متعین راستوں میں ایک سے زیادہ راستے بھی ہو سکتے ہیں۔ اسے کسی خاص انداز کا پابند نہیں بنایا جا سکتا تاہم یہ حقیقت ہے کہ نثر اور شاعری کے لوازمات اور خصوصیات کے مرکزی رویوں کے سبب اس کا کوئی انداز تحریر یا اسلوب نمایاں ہوتا ہے یہی اسلوب بہت اہمیت کا حامل ہے اور صاحب اسلوب اس سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل۔ اچھی' دلکش' خوبصورت' شستہ' شائستہ اور رواں تحریر فن تحریر میں مہارت کا نتیجہ ہے۔ لیکن اسلوب اس سے بہت مختلف شے ہے جس کا تعلق منفرد شخصیت اور بے مثال تخلیقی تجربے اور تخیل سے ہوتا ہے۔ ادبی اسلوب کی بنیادی شرط قابل مطالعہ ہوتا ہے۔ قابل مطالعہ سے مراد دلچسپی کا ہوتا ہے۔

غرضیکہ خود اسلوب کیا ہے؟ کا مطالعہ ایک دلچسپ کام ہے اس حوالے سے ذیل میں ہم مختلف زاویوں سے اس مطالعے کو مختلف صورتوں میں پیش کریں گے۔

اپنے موضوع پر قابو پانا اور اس پر مکمل دسترس حاصل کرنا اُسلوب ہے۔ اُسلوب کی خالصیت اس کی وہ بنیادی شرط ہے جس کے سبب اسلوب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسلوب کی خالصیت لفظوں کی ہنر کاری کی متقاضی ہوتی ہے اور ایسی تشکیل کی بھی جس کا تعلق زبان کے محاوروں سے ہوتا ہے یا صفتوں اور دیگر زبانوں سے لیے گئے متروکات اور نئے پروردہ لفظوں سے۔ قواعد کی غلطیاں، بیرونی محاورے اور متروکات اور نئے الفاظ اسلوب کی خالصیت پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔

اسلوب میں الفاظ کی ترتیب، انتخاب اور تناسب خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس بارے میں نثار فاروقی لکھتے ہیں:

> الفاظ کے انتخاب اور دروبست کا یہ کمال حافظؔ، سعدیؔ، فردوسی، میرؔ اور انیسؔ کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ نثر میں غالبؔ، آزادؔ (محمد حسین) اور ابوالکلام کی تحریروں کو پیش کیا جا سکتا ہے لیکن یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ اُردو کا کوئی نثر نگار اردو کے شاعروں کی طرح الفاظ کے انتخاب کا اعلیٰ معیار پیش نہیں کرتا '۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ نثر کی نسبت نظم میں فکر و تامل کے لیے مہلت زیادہ ملتی ہے اور کبھی کبھی عروض کی پابندیاں بھی مناسب الفاظ تلاش کرنے پر مجبور کرتی ہیں جو موقع کی مناسبت کے علاوہ صوتی اعتبار سے بھی ہم آہنگ ہوں۔ [۲۱]

اچھا اسٹائل یا اسلوب محنت اور کاوش کے بغیر نہیں بن سکتا۔ صاحب اُسلوب کو ایسے الفاظ کا انتخاب کرنا چاہیے جو اس کے خیالات کو پراگندہ اور منتشر نہ کر سکیں اور الفاظ کا صحیح استعمال مناسب خیال کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ فن کار اپنے قاری سے خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے۔ اگر معمولی اور سیدھی سادی بات بیان کرنی ہو تو اس کے لیے ادق الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کا استعمال مناسب نہیں۔ یوں تحریر میں سادگی پیدا نہیں ہوتی۔ لوکس نے سادگی کو "کلیرٹی" اور سید عابد علی عابد نے "قطعیت" کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق زبان کے آسان ہونے کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس میں جان، اثر اور لطف کے قائل ہیں جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ وہ لفظ کو ایسی بے جان چیز تصور نہیں کرتے جسے جہاں چاہا اٹھایا اور رکھ دیا بلکہ ان کی رائے میں اس کے گنوں کو پرکھنے والے مشاق ادیب ہی ہو

سکتے ہیں۔ کسی اعلیٰ درجے کے شاعر کا کلام اٹھا کے دیکھیے۔ ہر لفظ سے معلوم ہو گا کہ ایک نگینہ ہے جو اپنی جگہ جڑا ہوا ہے۔ اظہار کے اس پہلو کے حوالے سے طارق سعید اپنی کتاب اسلوب اور اسلوبیات میں لکھتے ہیں:

۱۔اُسلوب کو جڑی ہوئی چیز کی شکل میں دیکھا گیا۔

۲۔تاثر کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔ تاثر خالق فن کے لیے اسلوب سے اہم ہے مگر اسلوب اس تاثر کو اس قدر خصوصیت بخشتا ہے جو اسے سکہ رائج الوقت بناتا ہے۔

۳۔ طرز جس سے فنکار کا بھی تعارف ملتا ہے۔ اسلوب کی آمیزش سے تخلیق منفرد ہو جاتی ہے جو فن کار کی شخصیت کو بلند و اعلیٰ کر دیتی ہے۔ ۲۲

اُسلوب کے حوالے سے چند ضمنی مسائل الفاظ کے استعمال سے ادا ہوتے ہیں واضح رہے کہ الفاظ کے انتخاب کا معاملہ سٹائل میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ انتخاب موضوع کی مناسبت اور تحریر کے اعلیٰ تقاضوں کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اس حوالے سے الفاظ کو مانوس یا نامانوس الفاظ کے خانوں میں تقسیم کرنا مناسب نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زبان میں کوئی دو لفظ مترادف نہیں ہوتے یعنی ان میں کچھ نہ کچھ فرق تو ضرور ہوتا ہے۔ اُنس، محبت وعشق، جنون، اُلفت، شیفتگی یہ سب ایک ہی جذبے کے مختلف مدارج کو ظاہر کرتے ہیں اور ان میں بہت نازک فرق ہے جسے وجدان ہی محسوس کر سکتا ہے، الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ شبلی نے انیسؔ کی مرثیہ نگاری سے بحث کرتے ہوئے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً اوس اور شبنم ایک ہی چیز کے دو نام ہیں لیکن دونوں میں جو لطیف وجدانی فرق ہے وہ محل استعمال پر ہی کھلتا ہے۔ اُسلوب فکر و معانی اور ہیئت و صورت کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ اُسلوب سے مراد لکھنے والے کی وہ **طرز نگارش** ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ یہ دعویٰ کہ کسی شاعر نے اسی زبان میں ایک لفظ کی جگہ دوسرا اہم معنی لیکن زیادہ موثر لفظ استعمال کیا ہے، غلط ہے۔ لغت یہ تو کرتی ہے یہ کلمے کے کئی سلسلہ معانی متعین کر دے لیکن یہ نہیں کرتی۔

پروفیسر حافظ بصیرپوری کی خطابت میں، قرآن میں، تحریر میں، تقریر میں حتیٰ کہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں حسن اور جمال نظر آتا ہے۔ حافظ بصیرپوری کی زندگی اقبال کے اس شعر کی مکمل طور پر عکاسی کرتی ہے۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود ۲۳

حافظ صاحب کے اسلوب میں اسلامی آرٹ بالخصوص شاعری میں جمالیاتی رنگ عشق و عرفان کے قالب میں ڈھل کر حسن و جمال کی غمازی کرتا نظر آتا ہے۔ اسلامی شاعری چونکہ تصوف اور عشق حقیقی کے مضامین کو جمالیاتی

انداز میں پیش کرنے کا ذریعہ ہے۔ حافظ صاحب کی نثر اور شاعری دونوں میں یہ موضوعات کی طرح بلکہ اس پر مستزاد یہ کہ ان کی شاعری میں قرآن کریم کی آیات اور احادیث مبارکہ کے حوالے ملتے ہیں مثلاً

ظالموں کو فلاح نہیں ہوگی   ہم نے ام الکتاب میں دیکھا

انہ لایفلح الظالمون ۲۴

ایک دفعہ قبیلہ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول کریم ﷺ کو سنایا گیا:

ولقد ابیت علی الطوی واظلہ

حتی انال بہ کریمہ الماکل ۲۵

میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں تاکہ میں اکل حلال کے قابل ہو سکوں۔

رسول اللہ ﷺ جن کی بعثت کا مقصدِ وحید یہ تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائیں اور اس کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آئند اور مطبوع کر کے دکھائیں۔ اس شعر کو سن کر بے انتہا محظوظ ہوئے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوق ملاقات پیدا نہیں کیا، لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے لکھنے والے شاعر کو دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔"

اللہ اکبر! توحید کا وہ داعیِ اعظم ﷺ جس کے چہرہ مبارک پر ایک نظر ڈال لینا زمانے کے تمام نظاروں کے لیے دنیوی برکت اور اُخروی نجات کی دو گونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا، خود ایک صاحبِ فن عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کیا کہ اس عرب شاعر نے اپنے شعر میں اس درجہ حکمت کی بات کہی جس پر انسانی زندگی کی بنیاد ہے۔ فن کے ساتھ ساتھ فکر اس درجہ بُلند ہے کہ جوامع الکلم ہستی جن کی ذات سے فصاحت و بلاغت کے چشمے پھوٹتے ہیں اور جن کے بارے میں شاعرِ عشقِ رسول ﷺ حضرت محمد احمد رضا خان بریلوی رطب اللسان ہیں۔

ترے آگے یوں ہیں دبے لچے، فصحاء عرب کے بڑے بڑے

کوئی جانے منہ میں زباں نہیں، نہیں بلکہ جسم میں جاں نہیں

رسول اللہ ﷺ نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، تصویر ہے۔ حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اُٹھانی پڑتی ہیں، جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں ان کا نقش پردہ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ حضور خواجہ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم (بابی انت وامی) نے جو اس قدر شعر کی تعریف فرمائی اس سے شاعرانہ رفعت اور کلام کے اندر مخفی اسرار و رموز کی قدر دانی عیاں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ اپنے نعلین مبارک کو بنفس نفیس پیوند لگا رہے تھے اور میں چرخہ کات رہی تھی۔ اتفاق سے میری نظر امام الانبیاء ﷺ کے چہرہ انور کی طرف

گئی تو میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کی پیشانی مبارک پر پسینے کے چند قطرات نمایاں ہیں اور پسینہ کے اندر ایک نور ہے جو ابھر رہا ہے اور بڑھ رہا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے لئے یہ ایک ایسا خوبصورت منظر تھا کہ میں حیرت و تعجب سے پوری دل جمعی کے ساتھ کافی دیر تک آقا ﷺ کی جبیں مبارک کا دیدار کرتی رہی۔ اچانک رسول اللہ ﷺ نے جو نظر مبارک اٹھا کر میری طرف دیکھا(کہ میں آپ ﷺ کی طرف حیرانگی کے ساتھ دیکھ رہی ہوں)تو فرمایا:عائشہ! کیا بات ہے،کیوں حیران ہو کر میری طرف دیکھ رہی ہو؟

میں نے عرض کیا:یا رسول اللہ ﷺ! میں نے دیکھا ہے کہ آپ ﷺ کی پیشانی مبارک پر پسینہ کے قطرات ہیں اور مجھے قطرات میں ایک چمکتا ہوا نور دکھائی دے رہا ہے۔ اس خوش کن اور مبارک منظر نے مجھے آپ ﷺ کی طرف دیکھتے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔بخدا! اگر "ابو کبیر ہذلی"(زمانہ جاہلیت کا مشہور شاعر) آپ کو دیکھ لیتا تو اسے معلوم ہوتا کہ اس کے اشعار کا صحیح مصداق رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:سناؤ تو اس کے اشعار کیا ہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کوابو کبیر ہذلی کے یہ اشعار سنائے:

ترجمہ:...."وہ ولادت اور رضاعت کی آلودگیوں سے پاک ہے اس کے روشن چہرے کودیکھو تو معلوم ہوگا کہ نور اورروشن برق جلوہ دے رہی ہے۔"

جب رسول اللہ ﷺ نے یہ اشعار سنے تو جو کچھ ہاتھ میں تھا وہ رکھا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:جو لطف و راحت مجھے تیرے کلام سے حاصل ہوئی ہے اس قدر مسرت و سرور تجھے میرے نظارے سے بھی حاصل نہ ہوا ہوگا۔ ۲٦

اسلامی فلسفہء جمالیات:

مندرجہ بالا میں ہم نے فلسفہ جمالیات کے ان بنیادی عناصر کو بیان کیا ہے جن کی بنیاد پر اسلامی فلسفہ جمالیات رونما ہوا اور جس میں مختلف اسلامی فلسفیوں کے علاوہ ابن رشد نے اپنے خیالات اور فلسفہء جمالیات کو پیش کیا چونکہ اس نے اسلام کے نظریات کی روشنی میں ارسطو کو پیش کیا ہے۔اس لیے پہلے ہم اسلام کے فن شاعری پر نظریات کو واضح کریں گی۔اور قرآن حکیم کی روشنی میں فلسفہ جمالیات کو دیکھیں گے۔اسلامی فلسفے میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کا تعلق اسلامی ثقافت و تمدن کے منبع قرآن حکیم سے نہ ہو۔سب سے اول قرآن حکیم کی اس آیت پر غور فرمائیں جس میں اللہ تعالی نے انسان کے قد و قامت کی موزونیت،جاذبیت اور شکل وشباہت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

حضرت رسول رب العالمین ﷺ نے شعرا کی تعریف یوں فرمائی ہے۔"الشعراء تلامیذالرحمن وقلوبهم خزائن الاسرار "اوران کوسند امتیاز بخشا ہے۔حدیث شریف ان من الشعر لحکمه سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔عرب کے دور میں جو شخص شاعر ہوتا تھا،امیر بھی قرار دیا جاتا تھا۔ جیسے کہ امرءالقیس۔

لیکن "وما علمناه الشعر وما ینبغی له ان هو الا ذکر وقرآن مبین۔ "(۲۷)جس سے شعر داخل شریعت سے خارج خیال کیا جاتا ہے، لیکن یہ دلیل محض اس وقت درست ہے جب کہ قرآن حکیم کی فصاحت و بلاغت سے حضور کے الہامی عمل پر غیر قومیں اعتراض کریں کہ یہ معجزہ آسمانی شاعر کی تخلیق ہے۔اسلامی فلسفہ جمالیات میں یہ امر بہت اہم حیثیت رکھتا ہے کہ الہام اور فنی تخلیق میں قابل قدر فاصلہ ہے۔کیونکہ آپ کے فرمان کے مطابق" بل قالو اضغاث و احلام بل افتراه بل هو شاعر" (بلکہ کہا انہوں نے کہ یہ قرآن پریشان خیال ہیں بلکہ باندھ لیا ہے اس کو کہ وہ شاعر ہے۔)جب کہ حضور اقدس کے بارے میں شاعر کا خیال بھی معیوب ہے لیکن اگر شاعری بحیثیت فنی تخلیق معیوب ہوتی تو آپ ﷺ حسان بن ثابت رضی اللہ تعالی عنہ کے قصیدے پر صلہ تحسین عنایت نہ فرماتے اور ان کی تعریف نہ کرتے۔

قدیم اسلامی فلسفہ جمالیات میں بعض جگہ شعر کو سنت قرار دیا گیا ہے۔اور لکھا ہے کہ "والکلام المفهوم غیر حرام" اور کلام با معنی حرام نہیں ہے۔"والصوت الطیب الموزون غیر حرام" اور آواز پاکیزہ،وزن دار اور منظوم ومترنم آواز حرام نہیں۔ ۲۸

سنت کے لغوی معنی راہ، روش وعادت کے ہیں۔اسلامی اصطلاح میں وہ فعل ہے جس پر پیغمبر خدا ﷺ اور ان کی آل کرام اور صحابہ عظام علیهم التحیته والسلام نے عمل کیا ہو تو اسے سنت غیر کہتے ہیں۔ ۲۹

والحق فیه ماقاله الشافعی رحمهالله تعالیٰ اذاالشعر کلام محسنته حسن و قبیحته قبیح۔اور حق اس بارے میں وہ ہے جو شافعی رحمتہ اللہ نے کہا ہے کہ "شعر کلام ہے" سو اچھا اس کا اچھا ہے اور برا اسکا بُرا ہے۔

اور اس میں لحن کے لیے بھی یہ امر شامل ہے کہ ومهما جاز انشاد الشعر بغیر صوت والحسان جاز انشادمع الاالحان"۔

(بس جائز پڑھنا شعر کا بغیر آواز اور لحن کے جائز ہے۔پڑھنا اس کا ساتھ لحن کے بھی۔) ۳۰

اسلامی فلسفہ،جمالیات کے مطابق جو کہ آنحضرت کے فرمان سے اخذ ہوتا ہے:

"فان انواد المباحات اذااجتمعت کان ذلك المجموع مباحا۔"

(پس جب ایک ایک چیز مباح جمع ہوئی تو مجموعہ بھی مباح ہوگا) ۳۱

"ومهما انضمه مباح الی مباح لم یحرم الا اذا تضمن المجموع محظورا الا متضمنه الا حادا

(اور جب ایک مباح دوسری مباح کے ساتھ ہے تو حرام نہیں مگر جب کہ مجموعہ ایسے امر ممنوع کا متقضی ہو جو احادیث میں تھا۔

(اور اس جگہ امر ممنوع نہیں)"ولا محظور ھمنا" ۳۲؎

"و کیف ینکر انشاد الشعر وقد الشیته بین یدی رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ و آلہ وسلم"

اور شعر کے پڑھنے یا تخلیق کرنے سے کیسے انکار کیا جائے، حالانکہ اشعار آنحضرتؐ کے سامنے پڑھے گئے اور آپ نے اسے ممنوع نہیں فرمایا۔

و قال علیہ السلام " ان من الشعر لحکمہ" ۳۳؎

مندرجہ بالا احادیث و اقوال سے پتا چلتا ہے کہ اسلامی فلسفہ جمالیات ان اشعار یا فنی تخلیقات کو ممنون قرار دیتا ہے جن میں کہ صداقت نہ ہو جیسے کہ

"یجوز للشاعر مالا یجوز بغیرہ"

"کہا جاتا ہے کہ حضرت حسان بن ثابت اور حضرت ابن رواحہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! ہم بھی شاعر ہیں اور حق سبحانہ، تعالی ہمیں شاعر جانتے ہیں بلکہ ابن رواحہ نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو میں وصف (فن) میں مرنا نہیں چاہتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم ان شاعروں میں سے نہیں ہو جو "غاوی" ہیں بلکہ تم غازی ہو۔ اس لیے کہ مومن یا تو شمشیر سے جہاد کرتا ہے یا زبان سے۔ تم نے جو شعر مذمت کفار میں کہے ہیں وہ تیر و سنان سے زیادہ سخت ہیں اور اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

ان الذین اٰمنو او عملوا الصلحت و ذکروا اللہ کثیرا وانتصروا من

بعد ما ظلموا وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔ ۳۴؎

اسلامی فلسفہ جمالیات میں موزونیت کو فن میں اہم مرتبہ حاصل ہے۔ اور شاعر کو بحر، وزن، قافیہ، کی برائی بھلائی جاننے والا شمار کیا جاتا ہے۔ الحاصل موجب کلام فیض انظمام بلاغت التیام حضرت شافعی رحمتہ اللہ علیہ محاکات دو اقسام کی ٹھہری ہے جیسے کہ اس مقولہ مبارک سے واضح ہوتا ہے۔ "الشعر کلام" فحسنہ حسن قبیحہ قبیح۔"

فرقہ محمودہ کے فن کاروں میں حسین و پاکیزہ مضمون، جو نہایت عمدہ ہوں اور جن کے سننے سے بے احتیاط کلمات تحسین و آفرین زبان سے نکلیں۔ اور ان کے کلام میں کوئی بے تہذیبی و خلاف شرع بات نہ ہو۔

فرقہ مذمومہ میں وہ لوگ شامل ہیں جن کا فن قبیح ہو وہ بزرگوں کی ہجو اور کلمات میں استہزائی شریف اور خرافات، واہیات ہزلیات سے پُر ہوں۔

مرد کو مختلف شکل و صورت، ڈیل ڈول، رنگ روپ اور خد و خال کی عورت پسند ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جسے اپنی جمالیاتی حس کی وجہ سے پھول پسند نہیں۔ اگرچہ ذوق میں اختلافات کی وجہ سے ہر شخص کو مختلف قسم اور مختلف رنگ کے پھول مرغوب ہوتے ہیں۔ غرض جمالیاتی حس کا **نوعی** حسن سے اور جمالیاتی ذوق کا **انفرادی** حسن سے تعلق ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ حسن ایک عالمگیر وحدت ہونے کی وجہ سے کل افراد نسل انسانی کو ایک جیسا پسند ہے، لیکن یہ صورتیں اور رنگ ہیں، جو مختلف ہونے کے باعث مختلف ذوق کے انسانوں پر مختلف اثرات مرتب کرتے ہیں۔ غرض جمالیاتی حس کی حیثیت **نوعی** اور ذوق کی **انفرادی** ہے لہذا جس طرح انسان نوع کے لحاظ سے "ایک" اور فرد کے لحاظ سے "کثیر" ہے، اسی طرح جمالیاتی حس نوعی ہونے کی وجہ سے وحدت کی آئینہ دار ہے اور ذوق میں جو اس کا فرد ہے، کثرت و اختلاف پایا جاتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیگر حکمائے جمالیات کی طرح علامہ اقبال بھی جمالیاتی حس اور جمالیاتی ذوق کے اس بنیادی فرق سے آگاہ نہیں تھے جس کے باعث وہ بھی ذوق جمال سے جمالیاتی حس ہی مراد لیتے ہیں:

ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں

غافل! تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے! ۳۵

یہ ذوق یا جمالیات کی جدید اصطلاح میں جمالیاتی حس علامہ کے نزدیک قلب انسانی کو فطرتاً ودیعت ہوتی ہے اور یہی مشاہدہ انسانی کی حقیقی قوت ہے۔ چنانچہ یہ قوت اگر نظر یا حواس کے ہو تو مشاہدے کا غلط یا ناقص رہ جانا لازمی ہے۔ لہذا وہ مشاہدہ حسن کے لیے باصرہ کے بجائے دل کی آنکھ کو ضروری ٹھہراتے ہیں۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی

ہو دیکھنا تو دیدہ دل وا کرے کوئی ۳۶

قرآن حکیم کی رو سے جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں، قلب فطری طور پر معصوم، مصفا اور پاکیزہ ہوتا ہے، اور یہ سب حسن کی صفات ہیں، جو انسان کے ذوق، لطیف، پاکیزگی، طبع اور رفعت خیال پر دلالت کرتی ہیں۔ قلعب کی ان صفات ذاتی میں جب کوئی نقص پڑ جاتا ہے تو اس کا اثر جمالیاتی حس پر بھی پڑتا ہے، جس کا نتیجہ کور ذوقی اور پست خیالی کی صورت میں نکلتا ہے:

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب

کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف!

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید!

ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف! ۳۷

غبارِ راہ کو بخشا گیا ہے ذوقِ جمال
خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے؟ ۳۸؎

لیکن اس کے عمل علی الرغم اگر قلب اپنی اصل حسین حالت پر قائم رہے یا اسکی جمالیاتی قدروں میں اضافہ ہوتا چلا جائے تو اس کی جمالیاتی حس تیز اور قوت مشاہدہ بتدریج بڑھتی چلی جاتی ہے:

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور ۳۹؎

اردو ادب میں جمالیات کی بحث زیادہ قدیم نہیں تاہم یہ محض ایک دبستانِ تنقید کے حوالے سے درست بیان مانا جا سکتا ہے۔ حسن کاری کے مباحث تذکرہ نویسوں کے ہاں عموماً موجود نظر آتے ہیں۔ جب وہ ایک تخلیق کار کی تخلیقات پر تنقیدی حکم صادر کرتے ہیں تو انکے پیشِ نظر فصاحت، بلاغت، سلامت اور بے ساختگی ایسی اصطلاحات رہتی تھیں کہ جن کے وسیلے سے ایک شاعر اپنی تخلیق کو "جمالیاتی ذوق" کے لیے زیادہ پر کشش اور پُر لطف بنا دیتا تھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> جس طرح یونان کے معاشرہ اور پھر اس کے حوالہ سے ان کے فنون لطیفہ میں حسن کو اساسی حیثیت حاصل رہی ہے اسی طرح غالباً ہر عہد کے معاشرہ، تہذیب، ثقافت اور تخلیق میں حسن سے کسی نہ کسی طرح سے اظہارِ دلچسپی کیا جاتا رہا ہے۔۔۔اب اساسی اہمیت رکھنے والا ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حسن، انسان کو کیسے متاثر کرتا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ گلاب کا پھول، مدھ بھرا گیت، کہکشاں، دھنک، سرخ لب، نیلی آنکھیں، شفق، جھرنے ہمیں متاثر کرتے ہیں؟ ۴۰؎

قدیم یونانی ادب میں خیر کو حسن کا مترادف سمجھا جاتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یورپ میں جب جدید "جمالیاتی وجدانیت" کے دبستان کی داغ بیل ڈالی گئی تو تب بھی یہی بات بہ الفاظ دیگر دہرائی گئی: "حسن ہم آہنگی اور

مناسبت (ترتیب) کا نام ہے۔ مناسبت اور ہم آہنگی ہی حاملِ صداقت ہیں اور جہاں اجتماع حسن و صداقت ہو وہیں خیر ہے۔" ۴۱

اس بیان کو ذہن میں رکھ کے اگر ہم اپنے کلاسیکی شعراء کے تصورِ حسن کا جائزہ لیں تو یہ دیکھ کے خوش گوار خیرت ہو گی کہ ان کے نزدیک بھی ہم آہنگی اور مناسبت ہی اس تصور میں اساسی حیثیت رکھتی ہے۔اِس ہم آہنگی اور مناسبت کے حصول کے لیے وہ صنائع لفظی اور صنائع معنوی کو بطور آلہ (tool) استعمال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کلاسیکی شعراء کے ہاں ایک رچا ہوا تصورِ بیان و بدیع موجود تھا۔ جدید اردو تنقید نے صنائع لفظی مثلاً ایہام وغیرہ کو سامنے رکھ کر اس سارے تصورِ جمالیات کو فرومایہ قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ تنقید کے ساتھ کلاسیکی تصورِ حسن کے ساتھ بھی ناانصافی ہے۔ صنائع بدائع کا استعمال کلام میں تہہ داری، رمزیت اور تکثیرِ معانی کا باعث بنتا ہے۔اِس لحاظ سے گویا یہ عمل ابلاغ کو سہولت فراہم کرتا تھا۔ اگر شاعر نے اِس عمل میں ہوش مندی کا مظاہرہ نہیں کیا تو یہ عمل نہ صرف خام رہ جائے گا بلکہ تخلیق مبہم اور کم درجے کی رہ جائے گی۔ یہ خامی جمالیاتی ذوق پر گراں گزرے گی اور شاعر کا کلام پست درجے میں جگہ پائے گا۔اِس عمل کی اہمیت کے بارے میں عابد علی عابد لکھتے ہیں:

> یہ عمل، تخلیق کا پل صراط ہے کہ بہکا تو تحت الثریٰ میں گیا۔ غلط الفاظ و کلمات کا انتخاب کیا تو مطلب ہی مسخ ہو گیا۔ بے محل اور نامناسب الفاظ استعمال کیے تو معانیِ مطلوب کی متعلقہ دلالتیں روشن نہ ہوئیں۔ پھر مزا یہ کہ کیفیت کے منتقل کرنے میں نارواد یر لگی تو تاثر اس فرور تر درجے تک جا پہنچا جہاں وہ شعر میں چنگاریاں نہیں سلگا سکتا۔ جلدی کی تو مناسب الفاظ اور موزوں کلمات کی جستجو میں وقت صرف کرنے کی مہلت نہ ملی اور معانی مطلوب کے دقیق ترین پہلو تشنۂ اظہار رہ گئے۔ ۴۲

تخلیق عمل میں کار فرما اِس تصورِ حسن و جمال کو سمجھنے کے لیے نقاد کو تخلیق کے اسلوب کا تجزیہ کرنا پڑتا ہے۔اِس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> جمالیاتی تنقید میں ان ذرائع کا مطالعہ کیا جاتا ہے جنھیں بروئے کار لا کر تخلیق کار، تخلیقات میں حسن پیدا کرتا ہے۔اس لیے اِس میں اسلوب کے تجزیاتی

مطالعہ کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے کہ تخیل، تصور، خیال، سوچ سبھی اس کے ذریعہ سے تخلیق میں اظہار پا کر قاری کے اعصاب / حسیات / حواس پر خوشگوار اثرات مرتب کرتا ہے۔ ۴۳

تصورِ جمال کے اِس عمل میں نقاد اپنی جمالیاتی حس اور جمالیاتی ذوق کو بروئے کار لاتا ہے۔ صاحب کشاف کے نزدیک "جمالیاتی حس سے مراد انسان کی وہ فطری وجدانی صلاحیت ہے جس کے ذریعے وہ خوب اور ناخوب میں حسن اور قبح میں تمیز کرتا ہے۔" ۴۴

جبکہ جمالیاتی ذوق ورثے، ماحول اور تعلیم و تربیت کے نتیجے میں نمو پاتا ہے۔ تاہم اِن اصطلاحات سے قطع نظر اِن کے نتائج یکساں نظر آتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اچھا جمالیاتی ذوق نہ ہونے کے باعث نقاد افراط و تفریط کا شکار ہو جائے لیکن جمالیاتی حس اُسے انتہا پسند حکم لگانے سے بچاتی ہے۔ اسے جمالیاتی تنقید کا جمال کہا جا سکتا ہے۔

جمالیاتی حس کی تربیت میں روایت کا کردار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ادبی روایت سے آشنائی کے بغیر کسی تخلیق کے جمالیاتی عناصر کی پہچان تو دور کی بات ہے، زیادہ امکان اس کا ہے کہ نقاد اس ناواقفیت کے باوصف ایسی تعبیر یا توجیح کرے گا کہ جو سراسر غلط ہوگی۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی نے اِس حوالے سے "منصور" کی تلمیح کی ادبی روایت سے شناسائی کی مثال دی ہے۔ انہوں نے غالب کے دو، اصغر گونڈوی اور عابد علی عابد کے ایک ایک شعر کی مثال دے کر بتایا ہے کہ اِن اشعار کی درست تفہیم اور شعری حسن کو سمجھنے کے لیے اِس تلمیح کی پوری روایت سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اگر یہی اشعار کسی انگریز کو جیسے تیسے سنائے جائیں تو وہ جو نتائج اخذ کرے گا اُسے اکبر الہ آبادی نے اپنے شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

قصۂ منصور سن کر بول اٹھی وہ شوخ مس
کیسا احمق لوگ تھا، پاگل کو پھانسی کیوں دیا ۴۵

محولہ بالا مبحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں جمالیاتی تنقید کی ذیل میں جب اوضاعِ حسن، کوائفِ حسن اور حسن کاری کی بات ہوگی تو اصولی طور پر نقاد کو تخلیق کے اسلوب سے اعتناء کرنا ہوگا۔ اِس سلسلے میں جو وسائل اور آلہ کار اسکی معاونت کریں گے، وہ علم بیان، بدیع اور اسلوب میں واضح طور پر تشخیص رکھتے ہیں۔ اِن وسائل کی، آسانی کی خاطر دو اقسام کی جا سکتی ہیں:

۱۔ وہ وسائل جو عموماً شاعری میں زیادہ مستعمل ہیں۔

۲۔ وہ وسائل جو نثر میں بروئے کار لائے جاتے ہیں۔

پہلی قسم کے وسائل میں بیان اور بدیع کے مباحث شامل ہیں۔ ان میں ضائع لفظی اور صنائع معنوی کی بحث بدیع میں شامل ہے۔ جب تشبیہ، استعارہ، مجاز اور مجاز مرسل بیان کی ذیل میں آتے ہیں۔ شعری حسن کا سارادارومدار عروضی آہنگ پر منحصر ہوتا ہے۔ اِس سلسلے میں بحور اور وزن کی بحث عروض کی کتب میں شامل ہے۔

جہاں تک نثر کی جمالیات کا تعلق ہے، اس میں روزمرہ اور محاورہ، حشو وزوائد سے پاک ہونا اور سجع کا استعمال ایسی فنکارانہ چیزیں شامل ہیں۔ اِس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ہر بڑے نثر نگار کی نثر کے جمالیاتی عناصر کچھ تو روایت کے زمرے میں آتے ہیں جبکہ کچھ اسی نثر نگار کی منفرد پہچان ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں دبستانِ علی گڑھ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کے بعض عناصر کی نشاندہی کر سکتے ہیں لیکن بعض عناصر یوسفی کے اپنے اسلوب سے ابھرے ہیں۔ اسی طرح مختار مسعود کی نثری جمالیات کے بعض عناصر روایتی طور پر کسی اور دبستان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بعض عناصر ان کی تخلیق نثر کی انفرادی پہچان کے حامل ہیں۔

حافظ بصیرپوری کی نظم و نثر کے جمالیاتی عناصر بھی اسی طرح اساسی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک تو روایتی عناصر اور دوسرے انکے انفرادی اسلوب کے عناصر۔ اِن مباحث کو ہم ان کی نظم اور نثر کی ذیل میں مفصل انداز میں بیان کریں گے۔

حوالہ جات

۱۔ ناصر، ڈاکٹر نصیر احمد، جمالیات قرآن حکیم کی روشنی میں، مجلس ترقی ادب لاہور، اپریل، ۲۰۱۶

۲۔ ناصر، نصیر احمد، ڈاکٹر، تاریخ جمالیات، ص ۲۱۵

۳۔ محمد شریف، میاں، تاریخ جمالیات، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۶، ص ۳۱

۴۔ مجنون، گور کھپوری، تاریخ جمالیات یعنی فلسفہ حسن پر مختصر تاریخی تبصرہ، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، سرفراز قومی پریس لکھنؤ، جنوری ۱۹۵۹

۵۔ مجیب الرحمٰن، ابن رشد کا فلسفہ جمالیات و شرح کتاب الشعر، مطبع فلسفہ و ادب شرقیہ لاہور، پاکستان، جولائی ۱۹۷۵

۶۔ القرآن الکریم، تاج کمپنی لمٹیڈ لاہور، ۲۰۰۳ء

۷۔ القرآن الکریم، سورہ الفرقان، پارہ ۱۹

۸۔ القرآن الکریم، سورۃ الدھر، پارہ ۲۹

۹۔ القرآن الکریم، سورۃ السجدہ، آیت نمبر ۷

۱۰۔ الحدیث

۱۱۔ القرآن الکریم، سورۃ النور، پارہ ۱۸

۱۲۔ القرآن الکریم، سورۃ الشوریٰ، پارہ ۲۵

۱۳۔ ناصر، ڈاکٹر نصیر احمد، جمالیات، قرآن حکیم کی روشنی میں مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۶

۱۴۔ ناصر، ڈاکٹر نصیر احمد، جمالیات، قرآن حکیم کی روشنی میں مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۶

۱۵۔ ناصر، ڈاکٹر نصیر احمد، جمالیات، قرآن حکیم کی روشنی میں مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۶

۱۶۔ ناصر، ڈاکٹر نصیر احمد، جمالیات، قرآن حکیم کی روشنی میں مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۶

۱۷۔ ناصر، ڈاکٹر نصیر احمد، جمالیات، قرآن حکیم کی روشنی میں مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۶

۱۸۔ میمنت میر صادقی (ذوالقدر) : واژہ نامہ ہنر شاعری A Dictionary of Poetry & Poetics, Page ۱۲۵

۱۹۔ انسائیکلوپیڈیا، برٹینکا، جلد ۲۱، ص ۴۸۸

۲۰۔

۲۱۔ نثار احمد فاروقی، اسلوب کیا ہے مشمولہ نقوش، محمد طفیل (مدیر) لاہور، ادارہ فروغ اردو، جون ۱۹۶۳، ص ۶۰

۲۲۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، دہلی، ایجوکیشنل، پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶، ص ۱۷۳
۲۳۔ علامہ اقبال، بال جبریل، اقبال اکادمی، پاکستان لاہور، ۲۰۱۸، ص ۴۲۱
۲۴۔ القرآن الکریم، سورۃ انعام، آیت نمبر ۲۱
۲۵۔ ناصر، ڈاکٹر نصیر احمد، اقبال اور جمالیات، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۸۱، ص ۳۲۳
۲۶۔ مستدرک حاکم، مدارج السالکین، سیرت عائشہؓ، مصر، ص ۲۷۷
۲۷۔ مجیب الرحمٰن، ابن رشد کا فلسفہ جمالیات و شرح کتاب الشعر، مطبع فلسفہ و ادب شرقیہ لاہور، پاکستان، جولائی ۱۹۷۵، ص ۴۲
۲۸۔ مجیب الرحمٰن، ابن رشد کا فلسفہ جمالیات و شرح کتاب الشعر، مطبع فلسفہ و ادب شرقیہ لاہور، پاکستان، جولائی ۱۹۷۵، ص ۴۷
۲۹۔ مخزن الشعرا
۳۰۔ مجیب الرحمٰن، ابن رشد کا فلسفہ جمالیات و شرح کتاب الشعر، مطبع فلسفہ و ادب شرقیہ لاہور، پاکستان، جولائی ۱۹۷۵، ص ۵۱
۳۱۔ مجیب الرحمٰن، ابن رشد کا فلسفہ جمالیات و شرح کتاب الشعر، مطبع فلسفہ و ادب شرقیہ لاہور، پاکستان، جولائی ۱۹۷۵، ص ۵۲
۳۲۔ مجیب الرحمٰن، ابن رشد کا فلسفہ جمالیات و شرح کتاب الشعر، مطبع فلسفہ و ادب شرقیہ لاہور، پاکستان، جولائی ۱۹۷۵، ص ۶۳
۳۳۔ مجیب الرحمٰن، ابن رشد کا فلسفہ جمالیات و شرح کتاب الشعر، مطبع فلسفہ و ادب شرقیہ لاہور، پاکستان، جولائی ۱۹۷۵، ص ۶۷
۳۴۔ سورۃ الشعراء، آیت نمبر ۲۲۷
۳۵۔ بال جبریل، ص ۳۷
۳۶۔ بانگ درا، ص ۵۱
۳۷۔ ضرب کلیم، ص ۲۵
۳۸۔ ارمغان حجاز، ص ۴۷
۳۹۔ بال جبریل، ص ۷۷
۴۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۴۔۱۰۵
۴۱۔ ایضاً، ص ۱۰۸
۴۲۔ عابد علی عابد، مقالات، عابد؛ انتقادِ شعر، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۲۷۔۲۸

۴۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات؛ توضیحی لغت، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱ء ص ۱۰۶

۴۴۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۶۵

۴۵۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب لاہور، مئی ۲۰۱۵، ص ۲۶

باب دوم

پروفیسر حافظ بصیرپوری کی حیات وخدمات مختصر جائزہ

خاندانی پس منظر

بصیرپور تحصیل دیپال پور سے ملحق ایک مختصر آبادی پر مشتمل قریہ علاقہ ہے۔ سپہر کبود کی ستم ظریفیوں اور چرخ نیلی فام کی کروٹوں سے یہ نگر کئی بار لوٹا گیا۔ بصیرپور کی تاریخ خانقاہوں اور ولیوں کی یہ سرزمین صحیح معانی میں مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں آباد ہوئی۔ جب حاکم وقت نے " فریدارائیں" نامی شخص کو کچھ زمیں بطور تحفہ عنایت کی اور یوں فریدارائیں اور اس کے خاندان کی رگوں میں ڈورتا خون یہاں کی مٹی میں جذب ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چھچھر قوم فرید آرائیں کی اولاد میں سے ہیں۔ بصیرپور جو غیر منقسم ہندوستان کے ضلع منٹگری کی قدیم تحصیل دیپال پور میں واقع تھا۔

> بصیرپور میں کبھی "وسیر" نامی قوم آباد تھی جس کے نام پر قصبہ "دسیر پور" کہلاتا تھا۔ جو بعد میں بدل کر آہستہ آہستہ بصیرپور ہو گیا۔ یہ قصبہ ایک فصیل اور چند برجوں پر مشتمل قدیم قلعہ تھا جس پر سکھ سردار حکومت کرتے تھے۔ اکثریت تجارت پیشہ ہندوؤں کی تھی مگر کافی تعداد میں چھوٹے زراعت پیشہ کسان بھی آباد تھے۔ ان کسانوں کا پہلا مسلمان جد امجد "چھچھر" نامی شخص تھا۔ جو جگدیورائے کا بیٹا تھا۔ اور مشرف بہ اسلام ہوا۔ اسی کے نام پر یہاں کے باشندے چھچھر کہلاتے ہیں۔ بصیرپور میں زیادہ تر چھچھر آباد ہیں۔[1]

حافظ محمد منظور حسین بصیرپوری کے دادا جان محمد جگدیورائے کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ جان محمد کا پورا خاندان بصیرپور میں زراعت کے پیشہ سے منسلک تھا۔ اُن کا تعلیم کی طرف رجحان نہ تھا۔ اکثر خاندان میں لڑائی جھگڑا اور مقدمہ بازی رہتی تھی۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب اکبر نے اپنے چچا سے زمین الگ کر لی اور خود کھیتی باڑی کرتے، تاہم زمین کی علیحدگی کے باعث چچا غضبناک تھے۔ ان کو بااختیار اور پھلتا پھولتا دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتے۔ ان نوجوانوں میں بھی بچپن میں سہے ہوئے ظلم وستم کا سخت رد عمل تھا اس لیے بات بات پر لڑائی جھگڑا ہو جاتا جس میں حسین کو طبعاً شریف النفس اور حافظ قرآن ہونے کے باوجود بھی شریک ہونا پڑتا۔ اکثر مقدمہ بازی چلتی رہتی۔ ایک مرتبہ ایسے ہی موقع پر جب خاندان کے کچھ لوگوں نے حسن جوان کا تیسرا بھائی تھا کو کسی معمولی بات پر مارنا شروع کر

دیا۔ حسن نے حفظ جان کے اضطراری عمل میں ایک شخص کو لاٹھی دے ماری جو کاری لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ کئی سال مقدمہ چلتا رہا۔

حافظ بصیرپوری کے والد ماجد حافظ محمد حسین نیک سیرت انسان تھے جو قصبہ کے مشہور عالم دین اور سلسلہ چشتیہ کے بزرگ مولوی محمد اکبر کی صالح صحبت میں رہنے کی وجہ سے ظلم و جبر اور فسق و فجور سے بہت دور تھے۔ البتہ ان کے خاندان کے دوسرے لوگ لڑنے جھگڑنے میں ماہر اور ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

> حافظ محمد حسین سب بھائیوں میں خوبصورت تھے اور ان کے والد جان محمد ان کے ساتھ بہت محبت کرتے جب بھی وہ ان سے ملنے آتا اس کو اپنی گود میں بٹھا کر قرآن سنتے اور جب تک وہ قرآن پڑھتا رہتا اس کے سر کو مسلسل چومتا رہتا۔ دوسری طرف چچا جب بھی موقع ملتا کام کاج کے بہانے اسے روک لیتے اور انکار پر خوب پٹائی کرتے مگر اس سے حسین کی ضد اور بڑھ جاتی۔ ۲

چچا کے ظلم و ستم کے پیش نظر حافظ محمد حسین نے گھر چھوڑا اور بھٹکتے ہوئے کراچی پہنچے اور بحری جہازوں پر سے زنگ کھُرچنے کی مزدوری پر تعینات ہوئے اور اس دوران عدن، بصرہ، بغداد اور کویت وغیرہ گھومنے کا موقع ملا جب واپس وطن پہنچے تو بڑے بھائی اکبر نے اپنی زمین الگ کر لی تھی اور کاشتکاری کرتا تھا۔ حافظ حسین سب بھائیوں میں زیادہ وجیہ اور حافظ قرآن ہونے کی وجہ سے لوگ اس کا احترام کرتے تھے۔

حسین کی اپنی تعلیم کے ارمان تو پورے نہ ہو سکے البتہ اس نے اپنی بیوی عائشہ کو پڑھانا شروع کر دیا۔ حسن اتفاق سے عائشہ بہت ذہین اور علم کی شوقین ثابت ہوئی۔ گھریلو کام کاج اور ذمہ داریوں کے باوجود اس نے تھوڑے عرصے میں ہی قرآن مجید ناظرہ پڑھ لیا اور کئی ایک چیدہ چیدہ سورتیں یاد کر لیں۔

> حافظ محمد منظور حسین کی والدہ نے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد پرائمری پاس کیا اور بصیرپور میں ہی ٹیچر تعینات ہو گئیں۔ ۳

آپ کی والدہ سادہ، نیک، شریف اور پردہ دار خاتون تھیں۔ وہ بہت محنتی اور ذہین تھیں۔ ان کے دل میں خوفِ خدا تھا۔ وہ عبادت گزار اور سلیقہ شعار تھیں۔ گھریلو معاملات کے ساتھ ساتھ کنبہ کے تمام انتظام و انصرام کو سنبھالا ہوا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں قصبہ بصیرپور ضلع منٹگمری کی قدیم تحصیل دیپال پور میں شامل تھا۔ ضلع منٹگمری (ساہیوال) کی حدود اس وقت بھی اتنی ہی تھی بلکہ زیادہ تھی جتنی اب ساہیوال ڈویژن کی جغرافیائی حدود ہے۔ اس لئے حافظ بصیرپوری کی والدہ کو ضلع منٹگمری میں مختلف مقامات پر بطور ٹیچر جانا پڑا۔ آپ کے والدین نے بیس سال کا عرصہ اپنے شہر سے باہر گزارا۔

اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کی والدہ محترمہ بہت دُور اندیش خاتون بھی تھیں۔ انھوں نے بہت سے

باقاعدہ کورس کئے ہوئے تھے۔ ان کی والدہ صحت مند اور چاق وچوبند جسم کی مالک تھیں۔ والدہ صاحبہ امور خانہ داری میں نہایت مہارت رکھتی تھیں۔ اِس حوالے سے بھی اُنھوں نے باقاعدہ کورس کئے ہوئے تھے۔ جن میں دھلائی رنگائی، کڑھائی، فرسٹ ایڈ اور دیگر امور خانہ داری کے باقاعدہ ڈپلومے شامل تھے۔ اپنی شاگردوں کو بھی سکھاتی تھیں۔ کھانا اتنا مزیدار تیار کرتی تھیں جو ایک مرتبہ کھالیتا عمر بھر یاد رکھتا تھا۔

اپنی والدہ کے بارے میں حافظ بصیرپوری خود لکھتے ہیں:۔

> والدہ صاحبہ کو میں نے ہمیشہ صحت مند اور چاق وچوبند پایا۔ کام کاج گھریلو ہوں یا سرکاری، ان کے آگے آگے دوڑنے لگتے تھے۔ انھوں نے باپ کا کردار بھی ادا کیا اور ماں کا بھی۔ قریبی رشتہ داروں ہوں یا قصبے کے دکھی لوگ، وہ ہر ایک کی خدمت اور مدد کے لئے کمربستہ رہتی تھیں۔ بیماروں کی عیادت، فوت شدگان کی تعزیت، بیوائوں، یتیموں اور غریبوں کی اعانت، بے سہارا گھرانوں کی نصرت اور پھر ساتھ ساتھ صوم وصلوۃ اور تہجد کی مداومت رات دن عبادت، شاگردوں پر شفقت اور اَوراد و وظائف کی عادت۔ غرض یہ کہ نیکی اور بھلائی کا کونسا پہلو تھا جس کے لئے ان پر اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت نہ تھی۔[۴]

حافظ بصیرپوری کے ننھیال موضع بوگی وال تحصیل فیروز پور کے رہنے والے تھے۔ آپ کے ننھیال میں آپ کی نانی اور ایک سوتیلے ماموں تھے۔ تقسیم ہندوستان کے وقت وہ بھی پاکستان آگئے آپ کی نانی بھی آپ کے ہاں آگئیں جو چند سالوں کے بعد ہی وفات پا گئیں۔ علاوہ اَزیں سوتیلے ماموں تھے جو بورے والا میں رہتے تھے جن کی بیٹی کے ساتھ آپ کی والدہ کی وفات کے بعد شادی ہوئی لیکن چھ ماہ بعد ہی علیحدگی ہو گئی۔ آپ کی والدہ قم معدہ کی مریضہ تھیں۔ یہ مرض آہستہ آہستہ بڑھتا گیا اور بعد ازاں جان لیوا ثابت ہوا۔ حافظ صاحب کی والدہ کو چیک اپ کے بعد جگر کا کینسر تشخیص ہوا اور علاج کروانے کے باوجود آپ کی والدہ ۱۹ ستمبر ۱۹۵۷ء کو خالق حقیقی سے جا ملیں۔

حافظ بصیرپوری نے خود تحریر فرمایا ہے (حافظ صاحب اپنی والدہ کے سانحہ ارتحال کا ذکر کچھ یوں فرماتے ہیں)

> والدہ کی رحلت ریٹائرمنٹ سے پانچ سال قبل تقریباً ۵۲ سال کی عمر میں ہوئی۔ بیماری کے ایام زیادہ تر رخصت میں گزرے۔ متواتر علالت کا زمانہ کم و بیش چھ ماہ کا تھا اور ان کی تاریخ وفات ۲۹ ستمبر ۱۹۵۷ء ہے۔ اُس وقت میری عمر چودہ سال دو ماہ تھی۔[۵]

آپ کے والدین کے ہاں آپ اور آپ کی ہمشیرہ خدیجہ کے علاوہ کوئی اولاد نہ ہوئی جس کی وجہ سے حافظ

بصیرپوری اپنے والدین اور بہن کے بہت ہی لاڈلے تھے۔ آپ کی بہن آپ سے بہت زیادہ پیار کرتی تھیں اور اپنی جان آپ پر نچھاور کرتی تھیں۔ موصوفہ عارفہ کاملہ تھیں۔ مسلک حنفی اور روحانی سلسلہ چشتیہ سے تعلق تھا۔ ولادت باسعادت مورخہ ۱۲اکتوبر ۱۹۲۷ء کو قصبہ بصیرپور میں ہوئی۔

> اسے ناظرہ قرآن کریم گھر پر ہی پڑھایا گیا اور چیدہ چیدہ سورتیں یاد کروائی گئیں۔ کچھ دینی اور فارسی کتب پڑھانے کے بعد ولدہ سے ہی سکول کی ابتدائی جماعتیں پڑھائی گئیں اور پھر ہائی سکول میں داخل کروایا گیا۔ اگرچہ خدیجہ کم سن تھی مگر حافظ صاحب قدیم اسلامی روایات کے پابند تھے۔ ایک پرانی سی ہرکولیس سائیکل پر اپنی بیٹی کو خود سکول لے جاتے اور خود ہی واپس لاتے [۲]

پندرہ سال کی عمر میں گورنمنٹ گرلز ہائی سکول ساہیوال سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ گھریلو ماحول مذہبی تھا اس لئے کالج میں داخلہ نہ لیا، ایف اے سے ایم اے فارسی تک تمام تعلیم پرائیویٹ طور پر مکمل کی اور تمام کے تمام امتحانات اعلیٰ نمبروں کے ساتھ پاس کیے۔

حافظ بصیرپوری کی والدہ نے جب اس مادی دنیا سے پردہ فرمایا اس وقت ان کی عمر محض چودہ برس تھی۔ ان کے بعد عزیزہ ہمشیرہ نے ہی آپ کی ذمہ داری سنبھالی اور ان کی تربیت کے لیے تمام عمر وقف کر دی۔ حافظ بصیرپوری کی تعلیم کا اکثر حصہ انہی کی کاوشوں کا مرہون منت ہے۔

حافظ بصیرپوری کی والدہ امور خانہ داری کے ساتھ ساتھ معاشی ضروریات کی ذمہ داریاں بھی پوری کرتی تھیں۔ یوں کہہ لیں کہ حافظ بصیرپوری کا روزگار اور ذریعہ معاش آپ کی والدہ کی تنخواہ ہی تھی لیکن والدہ کی وفات کے بعد سب نظام درہم برہم ہوگیا۔ روزگار تو چلا ہی گیا تھا اب گھریلو ذمہ داری سنبھالنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ آپ کی والدہ کی رحلت سے قبل آپ کی بہن ڈیرہ غازی خان میں بطور استاد تعینات تھیں جب والدہ نہ رہیں تو انہوں نے ملازمت چھوڑ کر گھر اور آپ کی ذمہ داری سنبھال لی۔ آپ کی بہن نے ہی آپ کی پرورش کی اور ماں کی طرح پالا۔ اُنھوں نے اپنی بہن، بھائی، دوست، کی تمام ذمہ داریاں نبھائیں اور آپ کو اس مقام لا کھڑا کیا جس کا اعتراف خود حافظ صاحب نے کیا ہے۔ "آپ کی بہن ناصرف بہن تھی بلکہ ماں بھی تھی، باپ بھی تھی، دوست بھی تھی، بھائی بھی تھی اور استاد بھی تھی۔ آپ کی بہن آپ کی زندگی تھی، سب کچھ تھی۔ آپ کی بہن کی جدائی نے آپ کو بہت بڑا صدمہ دیا۔..............."

حافظ بصیرپوری کی ہمشیرہ کی شخصیت میں بے پناہ کشش اور گفتگو میں بے مثال دل کشی تھی۔ دل تھے کہ کھنچے چلے آتے، آنکھیں تھیں کہ سیر نہ ہوتیں، باتیں تھیں کہ دل میں اُترتی جاتیں۔ یہ سب ان کے جذبہ ایثار و خلوص کا کرشمہ تھا۔ بہن کے پیار نے والدہ کی جدائی تو یاد نہ آنے دی لیکن بہن کی وفات نے والدہ کی جدائی بھی یاد

دلادی۔ اس دکھ اور غم کا اظہار مصنف نے اپنے شعروں میں بیان کیا ہے۔ ان اشعار کو مصنف نے اپنی کتاب ''جادۂ شوق'' میں شامل کیا ہے۔

چند آنسو! بیاد ہمشیرہ مرحومہ

کیا بتاؤں میں حال طبع علیل
وقت کوتاہ اور قصہ طویل
دل پہ بار حسرت ماضی
فکر فردا ہے دوش جاں پہ ثقیل
عیش دنیا سے دل ہوا ہے سرد
بزم عشرت ہوئی نظر میں ذلیل
خندہ گل بھی، اشک شبنم بھی
چشمک برق بھی فنا کی دلیل
بندہ ناتواں کدھر جائے
تو ہی بتلا دے مجھ کو رب جلیل

نام اور تاریخ پیدائش

ان کا اصل نام محمد منظور حسین ہے۔ حافظ قرآن ہونے کی نسبت سے حافظ اور بصیر پور سے تعلق کی بنیاد پر بصیر پوری کے نام سے کہلائے اور حافظ بصیر پوری کے قلمی نام سے شہرت پائی۔ وہ حضرت محمد نوراللہ نعیمی رحمۃ اللہ علیہ مشہور فقیہ کے شاگرد خاص تھے۔ اس نسبت سے وہ نوری کہلایا کرتے تھے۔

''۳۱جولائی ۱۹۴۳ء بروز ہفتہ شب معراج کی صبح اوکاڑہ کے قدیم قصبہ حجرہ شاہ مقیم میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ارائیں خاندان سے تھا۔ والد کا نام حافظ محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ چشتی قادری اور والدہ کا نام عائشہ تھا۔ ان کی ایک بہن (خدیجۃ الکبریٰ) تھیں جو حافظ بصیر پوری رحمۃ اللہ علیہ سے سولہ سال بڑی تھیں''۔[7]

گورنمنٹ ڈی ہائی سکول بصیر پور ضلع منٹگمری ریکارڈ کے مطابق حافظ صاحب کی تاریخ پیدائش ۳۱جولائی ۱۹۴۳ء درج ہے۔[8]

حافظ بصیر پوری عظیم معلم، پروفیسر، بہترین خطیب، صاحب طرز ادیب، مصنف، اور باکمال شاعر تھے۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کو بیک وقت تدریس، خطابت، اور نظم و نثر پر ملکہ ہو لیکن موصوف کی ذات میں یہ اوصاف مجتمع تھے۔

اسرار اعظمی حافظ بصیر پوری کے بارے لکھتے ہیں:۔

نابغۂ روزگا.......... علم کے خزینہ دار.......... فارسی کے استاد ذی

وقار .... عربی زبان وادب کے رمز شناس......... عمرِ عزیز
بیش تر دولتِ علم بانٹتے گزری......... شجر ثمر بار و سایہ دار....
مردِ خود آگاہ مگر پیکرِ انکسار ....کھلتا رنگ موزوں
خدوخال......... کشادہ جبیں، اثرِ سجود کی امیں ....آنکھیں
ناکِ مدینہ و نجف سے سرمگیں......... نورِ قرآں سے سینہ روشن،
جمالِ مصطفوی سے دل کا آئینہ روشن، تروتازہ، شب زندہ داروں سا چہرہ،
جس پر معصومیت مستزاد .... قدیم و جدید علوم پر گہری نظر
.... دانشِ نورانی سے بہرہ ور .... صاحب قلب سلیم،
طبعاً شفیق و حلیم .... وہ بہت ہی سعید ساعت اور قبولیت کی گھڑی
تھی جب والدین نے ان کا نام رکھا تھا......... منظور۹

اسی طرح ماہ نامہ نور الحبیب کے مدیر محمد محب اللہ ''نالۂ شب'' میں ''میری نظر میں'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں حافظ بصیرپوری کا تعارف کچھ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

حافظ بصیرپوری ایک بلند پایہ ادیب، شعلہ نوا خطیب، بہترین معلم اور ممتاز عالم دین ہیں بحیثیت انسان بھی وہ بہت پیاری شخصیت کے مالک ہیں۔ موصوف انتہائی مخلص، ہمدرد، منکسر المزاج اور اعلیٰ اوصاف کے حامل انسان ہیں۔ بلکہ سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں سموئے ہوئے ہیں۔۱۰

حافظ بصیرپوری کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کو اپنے حصار میں جکڑ کر ساتھ لیے چلتے ہیں اور ان کی دینی و دنیوی علم میں لگن و محبت قاری کو گرویدہ بنالیتی ہے۔ حافظ سنجیدہ اور خوش ذوق شخص تھے۔ خاموشی اُن سے خود گویا ہوتی تھی۔

ان کی کائنات حسن و عشق کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ محبت آشنا انسان کے طلاطم خیز جذبات کی وضاحت وہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ جب انسان کو محبت ہوتی ہے چاہے حقیقی ہو یا مجازی تو اس کی زندگی نثر سے نکل کر شوخ و شنگ اشعار میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ محبت کو زندگی اور کائنات کی انوکھی تشریح میں شعر کہتے ہیں۔ اس کی تحریروں کا حسن انتخاب ایسی ہی خصوصیات کا حامل ہے۔ حافظ بصیرپوری رحمۃ اللہ علیہ کی نظم تشبیہ و استعارے کے کلاسیکل انداز میں ایک ادبی فن پارہ ہے جس میں کلاسیکل رنگ غالبؔ و اقبالؔ کی طرح اُنھیں معاصر شعراٗ سے ممتاز کرتا ہے۔ حافظ بصیرپوری رحمۃ اللہ علیہ کی نثر میں مولانا ابوالکلام آزادؔ جیسی ادبیت اور مکاتیبِ غالبؔ جیسی شگفتگی سوز و ساز میں اُن کے کلاسیکل اسلوبِ نگارش کی غمازی کرتی ہے۔ حافظؔ بصیرپوری کی نظم و نثر

میں بیان و بدیع اور فصاحت و بلاغت جیسی اَدبی خوبیاں انتقادِ اَدبیات کے طلبأ کے لیے تحقیق کی راہیں ہموار کرتی ہیں۔ ان کے کلام میں غنائیت اور موسیقی و نغمگی پائی جاتی ہے۔ خواہ نظم ہو یا نثر ان کی تحریروں میں فن کے ساتھ ساتھ فکری طور پر خلوص، محبت، سچائی اور حقیقت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ علمی وادبی خدمات کی وجہ سے ار دو ادب میں ایک درخشاں ستارہ کی طرح حافظؒ منظور حسین بصیر پوری ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت تھے۔

نازـ ایم اے حافظؒ بصیر پوری کے بارے میں اس طرح لکھتی ہیں۔

> جناب حافظؒ بصیر پوری کی ذات مختلف صفات کی جامع ہے۔ وہ بیک وقت ایک مفکر بھی ہیں، مقرر بھی، ایک متبحر عالم بھی ہیں۔ حافظ قرآن بھی، ایک معلم بھی ہیں، مبلغ بھی، ایک مصنف بھی، مولف بھی، ایک ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی۔ اتنی مختلف صفات ایک ذات میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ علوم قدیمہ وجدیدہ پر یکساں دسترس رکھنے والے لوگ اب خال خال نظر آتے ہیں۔ اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی ذات ہر طبقے کے لوگوں کے لئے برابر کشش رکھتی ہے اور سب اس مجمع فضل و کمال سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔[۱۱]

بچپن

گھر کا ماحول مذہبی ہونے کے باوجود بھی حافظ بصیر پوری کے مزاج میں رومانویت فطری طور پر بھری پڑی تھی۔ ان کا بچپن اکیس ٹوآر (۲/۲۱-R، ضلع ساہیوال (سابق منٹگمری) کی گلیوں اور لہلہاتے کھیتوں میں گزرا۔ بچپن کی دھندلی یادیں آخری دم تک ان کے قرطاس ذہن پر منقش رہیں۔ چار سال کی عمر میں ان کی والدہ کا تبادلہ ہڑپہ ہوا وہاں قریب دو سال کا عرصہ بسر کرنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں حافظ بصیر پوری کے آبأ ہڑپہ سے ہجرت کر کے جب بصیر پور آئے۔ اس بارے میں خود حافظ بصیر پوری لکھتے ہیں۔

> ہڑپہ کی دو مسجدیں میرے تصور میں آتی ہیں ایک نسبتاً چھوٹی اور سفید رنگ کی تھی دوسری وسیع، بڑی اور زیر تعمیر تھی جس کے باہر ایک بڑا کنواں بھی تھا۔ پہلی مسجد میں اکثر اپنے والد (ابا جان) کی انگلی تھام کر نماز پڑھنے جاتا تھا کیونکہ والد صاحب باجماعت نماز پڑھنے کے عادی تھے اور مجھے ضرور ساتھ لے جاتے تھے۔ دوسری مسجد میں کبھی کبھی شاید جمعہ کیلئے لے جاتے تھے۔[۱۲]

پروفیسر حافظ بصیر پوری کی شخصیت ہمہ گیر خوبیوں سے معمور تھی۔ آپ قرآن کریم کے استحضار اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم سے پیار کی بدولت شیخ القرآن کے لقب سے معروف تھے۔ ہر وقت قرآن کریم سے جڑے

رہنے کی وجہ ان میں نورانیت اور روحانیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ ان کی شخصیت کے ظاہر اور باطن کو جمالیات کو بیان کرنے میں اقبال کا حسن بیان ہی کافی ہے۔

روئے تو ایمان من قرآن من
جلوہ داری دریغ از جان من
از زیان صد شعاع آفتاب
کم نمی گردد متاع آفتاب

وہ اپنے والدین کی ایک ہی نرینہ اولاد تھے اور یہی وجہ تھی کہ ان کا پورا خاندان کے ساتھ بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اپنے والدین کے نورِ نظر اور زندگی کا سہارا تھے۔ اپنی بہن کے پیارے اور دلارے تھے اس لئے ہر ایک کی آنکھ کے تارے تھے۔

اس کے بارے میں حافظ بصیرپوری خود رقمطراز ہیں:

اندرون خانہ اور بیرون خانہ مجھے پیار ملتا تھا۔ اس پختہ عالی شان مکان کے چوبی دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھ کر آنے جانے والوں دیکھنا مجھے یاد پڑتا ہے۔ مجھے بچپن میں اپنی بہن خدیجہ کو آپا جی اور والدہ کو امی جان اور اباجی کہنا سکھایا گیا۔ جن کو میں کبھی مختصر بھی کر لیتا تھا۔ آپی جی پڑھی لکھی اور باذق تھیں اس لیے ان کی سہیلیاں بھی ایسی ہی تھیں ان میں سے دو نام باجی ثریا اور باجی ناہید مجھے یاد ہیں۔ غالباً یہ دونوں بہنیں تھیں۔

> ان میں سے ایک جس کے رخسار پر چھوٹا سا زخم کا نشان تھا مجھے بہت تنگ اور شرمندہ کیا کرتی تھی۔ میری آپا مجھے ان کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے سکھلاتی تھیں کہ تم سلام کہنا۔ چنانچہ جب میں گھر میں داخل ہو کر پتلی سی مہین آواز میں سلام کہتا تو وہ میرے لب و لہجے کی نقل اتار دیتی جس سے شرمندہ ہو کر میں اپنی بہن کے برقع میں چھپ جاتا۔ میری آپی اور ان کے درمیان کبھی خوش گپیاں ہوتی تھیں اور کبھی کبھار کسی شعر کا تبادلہ .... اس بات کا احساس کہ شعر بھی کوئی اچھی چیز ہوتی ہے مجھے اس دور میں ہی ہو گیا تھا۔[۱۳]

حافظ صاحب بچپن میں غلہ منڈی بصیرپور اور ریلوے اسٹیشن کے قریب موجودہ ریلوے پارک والی خالی جگہ پر اپنے ساتھیوں سے گلی ڈنڈا، وانجو اور کھد وکھونڈی (ہاکی) کھیلتے۔ اس زمانے میں گیند تو پرانے چیتھڑوں اور پٹ سن کے دھاگوں سے بنائی جاتی تھی جس کی ان کو خصوصی مہارت تھی اور ہاکی کی بجائے کیکر کا لمبا ڈنڈا استعمال کیا جاتا تھا جو آگے سے مڑا ہوتا تھا۔ کھیل کے دوران آپ کی چستی، چالاکی، دھینگا مشتی، مار کٹائی اور لڑائی بھڑائی دوسروں سے کم نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے آپ کو ایک چاق و چوبند، مستعد کھلاڑی کے طور پر قبول کیا جاتا تھا۔ ان

کے کھیل دیہاتی ماحول کے ہوتے تھے۔ تاحال جدید مغربی کھیل ہمارے ہاں متعارف نہیں تھے سوائے فٹ بال اور والی بال کے۔ اس حوالے سے حافظ بصیرپوری اپنی خودنوشت .... "میں اور میرے" میں رقمطراز ہیں:

میرے والد مجھے پیار سے اکثر کندھوں کے اوپر بٹھا کر چلا پھرا کرتے تھے۔ ان کی عمر بھر کی کمائی تھا اور اکلوتا بھی تھا۔ میرے دوستوں کی طرح کھیلتے تھے اور مجھے بہلانے اور ہنسانے کیلئے انھوں نے طرح طرح کھیل ایجاد کیے ہوئے تھے۔ جن میں سے اکثر مجھے اب بھی یاد ہیں۔ میرے بھی لاڈ کے تین عرفی نام تھے۔ مجھے نہایت کم سنی میں ہی والدہ نے گھر میں کچھ نہ کچھ پڑھنا لکھنا شروع کروادیا تھا۔ چھ کلمے اور نماز وغیرہ تقریباً چار سال کی عمر میں مجھے اچھی طرح یاد تھے۔ پختہ فرش پر چاک سے کھیل کھیل میں گنتی لکھتے جانا اور پیچھے پیچھے ہٹتے جانا مجھے یاد آتا ہے۔ پہاڑے اور قاعدے وغیرہ بھی سکھائے گئے۔ پتہ نہیں پہلی یا دوسری جماعت میں داخل ہوا یا نہیں اور کہاں پاس کیں۔ بس یہ یاد ہے کہ مجھے سکول بھیجا گیا تو تیسری جماعت میں بیٹھا تھا۔[۱۴]

رسمی تعلیم کے لیے سکول میں داخلہ

حافظ بصیرپوری کے والدین اس دور کے پڑھے لکھے لوگ تھے جبکہ ان کی والدہ تو ایک استاد بھی تھیں یہی وجہ تھی کہ حافظ بصیرپوری کی ابتدائی تعلیم زیادہ تر ان کے گھر پر ہوئی۔ والدہ کے ساتھ ساتھ ہمشیرہ زیادہ تر انگلش، ریاضی، اردو اور فارسی پڑھاتی تھیں۔ آپا جی ہی کی بدولت وہ انگریزی، اُردو اور فارسی میں خاصے ماہر ہو گئے۔ حافظ بصیرپوری کی ہمشیرہ خود نہایت شستہ ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ فارسی اور اردو لٹریچر سے بہت شغف تھا۔ ہزاروں اردو اور فارسی کے اشعار اُنھیں زبانی یاد تھے۔ اگرچہ خود شعر تو نہیں کہتی تھیں لیکن اس زمانے میں ان کی ایک اہم خصوصیت اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ برمحل اور فی البدیہہ شعر کہنا بھی تھی۔

ادب میں ان کا میدان افسانہ نگاری تھا اور ان کے کچھ افسانے بعض ادبی رسائل کی زینت بھی بنے۔ ہمشیرہ کی تربیت سے حافظ بصیرپوری کا شعری لگاؤ حد سے بڑھ گیا تھا بلکہ کچھ نہ کچھ شعر لکھنے کا ملکہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ ساتویں جماعت میں حافظ بصیرپوری نے "آخری سلام" کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ حافظ بصیرپوری کی ہمشیرہ نے بوستان اور گلستان جیسی شہرہ آفاق کتابیں جو فارسی ادبیات کا سرمایہ ہیں، جماعت ششم ہفتم میں ہی حافظ بصیرپوری کو پڑھا دی تھیں۔ گھر میں ادبی رسائل کثرت سے آتے تھے۔ خاص طور پر "پھول" اور "تعلیم و تربیت" جیسے بچوں کے رسالے حافظ بصیرپوری کے لئے ان کے ایام طفولیت میں آتے تھے۔ ان سے حافظ صاحب میں زائد

مطالعہ کا شوق پروان چڑھا۔ حافظ بصیرپوری اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:۔

> مڈل پاس ہونے کے بعد مجھے 'حویلی لکھا' جا کر جماعت نہم اور سکول ہاسٹل داخل کروایا گیا کیونکہ بصیرپور میں صرف مڈل سکول تھا۔ ہائی سکول صرف دیپال پور یا حویلی لکھا میں تھا۔ اس وقت چوہدری عطاء الٰہی صاحب وہاں ہیڈ ماسٹر تھے۔ نہایت شفیق اور محنتی تھے۔ حویلی لکھا میں اجنبی ماحول کی وجہ سے میں سکول جانے سے گریز کرنے لگا۔ ایک قریبی رشتہ دار جو ہائی سکول دیپال پور کے ٹیچر تھے، کی مشاورت سے حویلی لکھا سے دیپال پور منتقل کروایا گیا۔ ہاسٹل نہ ہونے کی وجہ سے روزانہ گھر سے سکول جانا پڑتا تھا۔ خان حمید اللہ خان جو اردو فارسی کے استاد تھے اردو سپیکنگ خاندان کے تھے۔ اردو زبان استعمال فرماتے تھے۔ فارسی سے میرا لگاؤ پہلے ہی زیادہ تھا۔ اس لئے ان کا منظورِ نظر تھا۔ بسا اوقات مجھے کہتے تھے آؤ فارسی کا سبق کہلا دو، سرمایۂ اردو اور دستورِ ادب داخل نصاب تھے اور بہت اچھی کتابیں تھیں۔ ۱۵

اساتذہ کرام

حافظ صاحب اپنے سکول کے زمانہ کے جن اساتذہ سے خاص طور پر متاثر ہوئے ان اساتذہ میں اردو ریاضی کے استاد ماسٹر ولی محمد صاحب تھے۔ ویسے تو قادیانی تھے مگر اپنے عقیدہ کی تبلیغ نہ کرتے تھے۔ عادات و اطوار کے لحاظ سے اچھے انسان تھے۔ اچھی باتوں کی تلقین کرتے اور بری باتوں سے روکتے تھے۔ محنت، جانفشانی اور قابلیت کے لحاظ سے مکمل استاد تھے۔ شعری ذوق رکھتے تھے اور اپنے شاگردوں میں بھی یہی ذوق پیدا کرتے تھے۔ زمانہ طالب علمی میں انھوں نے علامہ اقبال کے بہت سے شعر لکھوائے اور یاد کروائے تھے۔ حافظ بصیرپوری کے ابتدائی ادبی ذوق میں یقیناً ان کا حصہ ہے۔ بیت بازی کرواتے تھے۔ اردو ریاضی کے بہترین استاد تھے۔ خط بہت اچھا تھا۔ طلباء کی خوش خطی پر زور دیتے تھے۔ اگر جماعت ہفتم میں بیت بازی ہوتی تو ان کی توجہ اور گھریلو ادبی تربیت کے باعث ساری جماعت ایک طرف ہوتی اور حافظ بصیرپوری تنہا، پھر بھی مقابلہ جیت جاتے۔ پروفیسر حافظ محمد منظور حسین اپنی کتاب خودنوشت سوانح عمری ''میں اور میرے'' میں لکھتے ہیں:

> ''ہمارے اساتذہ کرام میں اکثر عمر رسیدہ اور سنجیدہ لوگ تھے۔ جو مڈل جے وی یا میٹرک ایس وی ہونے کے باوجود قابل، محنتی، شریف اور دیانت دار تھے۔ اس وقت کے دستور کے مطابق طلبہ کو سزا دینا ان کا اخلاقی حق سمجھا جاتا تھا۔ جس پر کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش بہت کم

ہوتی تھی۔ یہ لوگ ہمیں اولاد کی طرح جانفشانی سے پڑھاتے اور ہمارے
دل میں ان کا خوف ہوتا۔ ٹیوشن کا رواج نہ تھا" ۱۶

تاریخ کے استاد چوہدری غلام محمد مرحوم تھے۔ اگرچہ دیگر مضامین میں بھی مستند تھے مگر تاریخ اور جغرافیہ پڑھانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ چوہدری صاحب میانہ قد اور سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے۔ کبھی کبھار مسکراتے تھے۔ ان دنوں زیادہ تر ننگے سر رہتے تھے اور ریش بریدہ تھے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد حضرت فقیہ اعظم مولانا محمد نوراللہ نعیمی رحمۃاللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔ مشت بھر داڑھی رکھی اور سر پر دستار باندھنے لگے۔ میٹرک ایس وی ہونے کے باوجود معلومات کا ذخیرہ تھے۔ انگلش فر فر بولتے تھے۔ دنیا بھر کے شہروں کا حدود اربعہ اور آنکھوں دیکھا حال سناتے تھے۔

ایک استاد محترم محمد عزیز صاحب تھے۔ قابلیت تو واجبی سی تھی مگر اپنے مخاطب کے سر پر سوار ہو جانے کا سلیقہ بہت تھا۔ اس سلیقے سے انہوں نے عمر بھر کام لیا۔ کچھ نہ کروا سکنے کے باوجود انسپکٹر آف سکولز کو منوا لیتے تھے کہ استاد نے بہت کام کروایا ہے۔

سائنس کے استادِ خاص خاں عبدالعلیم خاں صاحب تھے۔ اردو سپیکنگ گھرانہ تھا اور میاں بیوی پان کے رسیا تھے۔ زراعت اور کھیتی باڑی کا مضمون بھی ان کی ذمہ داری تھا۔ انہیں کے دم قدم سے سکول کے گراؤنڈ میں کچھ نہ کچھ کھیتی اگائی جاتی تھی اور کیاریاں رنگارنگ پھولوں سے بھری رہتی تھی۔

انگریزی کے مضمون کے لیے تین سالوں میں دو اساتذہ ایک ملک منور حسین صاحب تھے اور دوسرے چوہدری عبداللطیف صاحب۔ اول الذکر متانت و شفقت کا مجموعہ تھے خاصے وجیہ اور قدآور تھے۔ ایف اے پاس تھے۔ محنت سے پڑھاتے تھے۔ پیریڈ میں سخت مزاج معلوم ہوتے تھے بعد میں مشفق۔

مالی حالات و مصائب

حافظ بصیرپوری کے والدین اپنے ذاتی مسائل و مصائب کا شکار رہے اُن کے والد نے تمام عمر کوئی کاروبار نہ کیا، خاندان کی مالی حالت ناگفتہ بہ رہی۔ البتہ میٹرک کے بعد انھوں نے غلہ منڈی کی جامع مسجد میں اپنے سابقہ استاد حافظ عبداللہ صاحب مرحوم سے باقی ماندہ قرآن کریم حفظ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ حافظ صاحب نے اپنی معاشی ضرورت کے تحت پہلے کریانہ کی دکان بنائی۔ چھ ماہ تک دکان چلائی لیکن ناتجربہ کاری کی وجہ سے یہ کام نہ چل سکا۔ اس کے بعد تین چار ماہ تک حکمت کی تربیت بھی حاصل کی لیکن خلافِ مزاج ہونے کے باعث چھوڑ دی۔ کیونکہ ان کی ذات کے اندر علم و کمال کے جوہر مخفی تھے، دنیاداری میں کیسے پڑتے۔ کیونکہ ان کی ذات کے اندر علم و کمال کے جوہر مخفی تھے، دنیاداری میں کیا پڑتے۔

دارالعلوم حنفیہ فریدیہ میں داخلہ

والدہ کی وفات کے بعد آمدنی محدود ہو گئی اور کالج کے اخراجات نہ ہونے کے باعث داخل نہ کروایا گیا۔

مذہبی گھرانہ ہونے کی وجہ سے درس نظامی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے والد صاحب نے دارالعلوم حنفیہ فریدیہ میں داخل کروادیا جو اس زمانے میں بھی شہر کی اہم دینی درس گاہ تھی۔ یہاں سے عربی فاضل، صرف ونحو اور درس نظامی کی تعلیم حاصل کی۔ فقیہ اعظم شیخ محمد نوراللہ رحمۃاللہ علیہ کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا۔ مدرسہ میں فقیہ اعظم اور دیگر اساتذہ کرام سے بہت کچھ سیکھا۔ فقیہ اعظم کی ذاتِ بابرکات کی وجہ سے آپ میں اخلاقیات اور عشق رسول ﷺ پیدا ہوا۔ حافظ بصیرپوری کا دل دین کی طرف راغب ہوگیا۔ آپ میں ایک کامل مومن جیسی صفات پیدا ہوئیں۔ آپ ایک باعمل عالم و صوفیؔ با صفا، شعلہ نوا خطیب، صاحب طرز ادیب اور منفرد شاعر بن گئے۔ اہل علاقہ کے لیے آپ بے پایاں سرمایۂ حیات ہیں۔ آپ کی شخصیت پر جن لوگوں کا اثر ہوا ان کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے۔ جن کے زیر اثر آپ کی شخصیت پروان چڑھی۔

عشق مجازی

حافظ بصیرپوری کی شخصیت جمال و جلال کا حسین و جمیل امتزاج تھی، فکر میں جلال کے ساتھ ساتھ جمال بھی تھا۔ مگر فنی اعتبار سے ان کی نظم اور نثر دونوں میں جمال ہی جمال نظر آتا ہے۔ آپ مجاز کے تمام نشیب و فراز سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ ادبی مبالغہ آرائی اس درجہ زیادہ ہے کہ آپ کی تحریر پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا کہ آپ کے ہاں عشق مجازی ہی تھا۔ یہ محض ان کا اسلوب نگارش ہے۔ مگر اس داستاں میں حافظ بصیرپوری جمالیاتی انداز اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اردو ادب کی قدیم داستانوں کا اسلوب نظر آرہا ہے۔ جب کہ عملی طور پر ان کی شخصیت لب و رخسار کی شاعری سے ہٹ کر تھی۔ فن پر ان کی فکر غالب نظر آتی ہے۔ ذاتی طور پر آپ کی شخصیت کا جمال انہی کے شعر کی روشنی میں کچھ یوں ہے۔

تمھیں خبر ہے مری جاں، خدا کو بھی معلوم
کہ میرا پیار مقدس ہے ایک ماں کی طرح
تمہارا حسن ہے معصوم، میرا عشق ہے پاک
مگر ہمیں یہ سمجھتے ہیں "دیگراں" کی طرح

پروفیسر حافظ بصیرپوری اپنی آپ بیتی میں خود لکھتے ہیں:۔

"اسی زمانے میں ایک ایسی ہستی بھی زندگی میں داخل ہوئی جس کا بوٹا سا قد، چمبیلی سی رنگت، نرگسی آنکھیں، دراز پلکیں، سنہری بال، موتی سے دانت، دیسی گلاب سے رخسار جن پر تل قاتل، تبسم میں معصومیت اور شرارت کا عجیب سا امتزاج، لہجہ جل ترنگ، کم سخن، غنچہ دہن،

نازک بدن، فریقین کو محبت تھی مگر خلوت میں ملاقات مشکل تھی؛
جلوت میں بات مشکل۔ دیکھ لینا ہی راحت وصال تھا۔اوجھل ہوجانا
باعث حزن وملال۔ بعض لوگ کہتے ہیں ہر شاعر پر حاشیہ عشق گزرتا ہے
میں تو اس کا قائل نہیں۔ میرے خیال میں راز سخن واکرنے کے لئے
وہاں زخم ضروری ہے جیسے بھی پیدا ہوجائے۔ دل گداختہ لازمی ہے جس
صدمے سے بھی ہوجائے اگر لوگوں کی بات سچ ہے تو یہی ادھوری عشق
کہانی میرے عشق کا سب سے بڑا پہلا اور آخری حادثہ ہے"۔۱۷

حافظ بصیرپوری کی شخصیت پر مولانا محمد نور اللہ نعیمی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی بہن کا سب سے زیادہ اثر ہوا۔ جس کا ذکر خود مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے:۔

"میرے استاد پیر و مرشد اور ولی، نعمت فقیہ اعظم ابوالخیر مولانا محمد نور
اللہ نعیمی رحمۃ اللہ علیہ علم و عمل کی مسند کے صدر نشین اور زہد و تقویٰ
کے میدان کے مردِ گزیں تھے۔ کرامت کے جوئے رواں اور استقامت
کے کوہِ گراں تھے۔ کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی نورانی، روحانی شخصیت
اور دودھیا چاندی جیسی بارلیش معصوم صورت کے ساتھ بلا کی سادگی
تھی۔ نہ کوئی عبا و قبا کا تکلف، نہ کوئی فقیہانہ طمطراق، نہ کوئی واعظانہ
دھوم دھام، نہ کوئی خطیبانہ چھیڑ چھاڑ، بس مدرسانہ انداز اور ناصحانہ
ابلاغ، اردو میں بھی تقریر فرماتے اور پنجابی میں بھی"۔۱۸

حضرت نوراللہ نعیمیؒ کی صحبت نے آپ کے ظاہر و باطن کو منور کیا صوم و صلوٰۃ کے تو شروع سے ہی پابند تھے اس عظیم المرتبت مردم شناس اور مردم ساز انسان نے آپ کی راتوں کو تہجد سے آباد کیا اور دن کی روشنی کو تقویٰ کی روشنی عطا کی۔ آپ ایک بالغ نظر محسن و مشفق استاد اور مصلح کی طرح دل و دماغ پر جمے ہوئے تھے۔ وہم و گمان کے گرد و غبار کو ایک پھونک سے اڑا کر ساری ذہنی فضا صاف و شفاف فرما دیتے تھے۔

حافظ محمد منظور حسین کے بہت سے دوستوں کا ذکر بھی ہے۔ جس میں حاجی ظفر علی جوڑا اور جورا یا شیرا نامی لڑکا جو بہت شریر تھا اور شرارتیں کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا اور اساتذہ ان کی شرارتوں سے تنگ تھے۔ آپ کے ایک بچپن کے دوست اور ہمسائے چوہدری رشید احمد محکمہ بلدیات میں بطور انسپکٹر (چونگیات) ریٹائرڈ ہوئے ہیں کا خصوصی ذکر ملتا ہے۔ یاد رہے چوہدری رشید احمد صاحب شہر بصیرپور کے ہر دل عزیز اور نامور استاد گرامی محمد احمد عادل صاحب کے پدر بزرگوار ہیں۔

ازدواجی زندگی

حافظ بصیرپوری جیسے باذوق انسان کو زندگی میں کچھ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا ویسے تو انہیں بہت سی مشکلات کا سامان کرنا پڑا مگر ان کی ایک مشکل ازدواجی زندگی بھی تھی۔ ان کی تین شادیاں ہوئیں۔

پہلی شادی

پہلی شادی ۱۹۵۸ء میں رحمت بی بی سے ہوئی۔ یہ سوتیلے ماموں کی چھوٹی بیٹی تھی۔ رحمت بی بی عمر اور تن و توش میں آپ سے دوگنی اور سانولی تھی۔ حافظ بصیرپوری کے والد صاحب اور ہمشیرہ نے اسے بے جوڑ قرار دیا مگر آپ کے ماموں نے کہا گھر کی بیٹی ہے۔ گھر سنبھال لے گی۔ شاید اسی لئے حافظ صاحب کے والد اور بہن رضامند ہو گئے۔ پہلی شادی کا قصہ حافظ بصیرپوری خود یوں بیان فرماتے ہیں:

> شادی ہو گئی اور مسماۃ "رحمتے" میرے گھر تشریف لائیں۔ ان کو دیکھ کر میں نے فاضل فارسی کی کتابیں بیچ دیں اور پڑھنے سے صاف انکار کر دیا۔ آپ میری بیزاری کا اندازہ اس سے کر سکتے ہیں کہ ایک روز مجھے بخار تھا، بیگم صاحبہ میرے پاؤں دبانا چاہتی تھیں اور میں اسے لاتیں رسید کرتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی وہ مجھے منت سماجت کرتی کہ مجھے چھوڑنا نہیں، اور میں کہہ دیتا کہ نہیں چھوڑونگا۔ آپ جانتے ہیں کہ لوگ سچی بات منہ پر نہیں کہتے مگر جب بعض خواتین نے ایسے جملے میرے والد صاحب اور بہت کے منہ پر کہنے شروع کر دیئے کہ ہائے ہائے تم نے تو چاند کو گرہن لگا دیا، یہ تم نے ماں لا کر دی ہے یا بیوی؟ تو انہوں نے اسے میکے بھیج دیا۔ دو تین ماہ انتظار کے بعد اس کے والد یعنی میرے ماموں اور ان کا ایک بیٹا آئے اور طلاق کا مطالبہ کرنے لگے، میرے والدین نے طلاق دلوادی۔[۱۹]

دوسری شادی

۱۹۶۸ء میں قدرے سادگی کے ساتھ حافظ بصیرپوری کی دوسری شادی ہوئی۔ اس وقت حافظ صاحب کی عمر چوبیس سال تھی اور اس کی بیوی کی عمر ۲۴ سال تھی۔ حافظ صاحب کی دوسری بیوی ایم اے۔ بی ایڈ اور بہاولپور میں بطور استاد ملازمت کرتی تھیں۔ وہ ملازمت چھوڑ کر بصیرپور آنا نہیں چاہتی تھیں۔ دوسری شادی کے بارے میں حافظ بصیرپوری یوں رقمطراز ہیں:

> "ہم دلہن لے کر بصیرپور آگئے، شبِ زفاف میں تحفتاً ایک سونے کی انگوٹھی میں نے پیش کی، انہوں نے قبول کی، رونمائی ہوئی، بس اچھی ہی

تھی، وہ تو صرف شعر ہی ہوتے ہیں جن میں کہا جاتا ہے

ان سے امید رونمائی ہے
کیا نگاہوں کی موت آئی ہے

کچھ باتیں ہوتی رہیں، پھر اختلاط کی خواہش کا اظہار ہوا، ادھر سے اصرار، اُدھر سے انکار ہوا، بہت سے رد و کدح کے بعد وجہ پوچھی تو بعد از خرابی بسیار، بار بار اور لگاتار استفسار کے بعد صرف اس بات کا اقرار طلب کیا گیا کہ ہمیشہ آپ میری بات مانا کریں گے یعنی گھر میں صرف میری ہی چلے گی''۔۲۰

ایک بار بیگم صاحبہ کو دو سہیلیوں نے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا، ملاقات ہوئی، معلوم ہوا کہ دونوں ہی طلاق یافتہ ہیں، شاید حافظ صاحب سارا الیہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے اسی لیے یہ رشتہ زیادہ دیر چل نہ سکا۔

حافظ صاحب اپنے بیمار والد اور اکلوتی بہن کو چھوڑ کر بہاول پور جا نہیں سکتے تھے۔ یہ آپ کی اکلوتی بہن جس نے اپنے بھائی کیلئے سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ حافظ صاحب نے اپنی بہن کی خاطر اپنی بیوی کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی نہ ہو سکی۔ یوں ایک سال کی مدت میں ہی یہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ اس کی وجہ دونوں کا ایک دوسرے پر برتری ظاہر کرنا تھا جو ان کی خود دار طبیعت کو گوارا نہ تھا۔ حافظ صاحب کو اس شادی کے ٹوٹنے کی خلش عمر بھر رہی۔ حافظ بصیر پوری اپنی کتاب میں اس طرح لکھتے ہیں:

''ہماری ازدواجی عمر کم و بیش ایک سال تھی۔ اس عرصہ میں پانچ سے دس ملاقاتیں ہوئی ہوں گی۔ پہلی دو تین جلد پھر ایک دو ماہ کے وقفوں کے ساتھ۔ میں صرف ایک بار بہاول پور گیا تھا۔ مجھے اپنی کوتاہی اور قصور کا اعتراف ہے مگر کیا کرتا وہ جب بھی آتی بہاول پور میں میرے تبادلہ کا اصرار کرتی۔ میں بصیر پور کیلئے اصرار کرتا۔ دراصل وہ منٹگمری میں لوٹنا نہیں چاہتی تھی''۔۲۱

تیسری شادی

۱۹۶۹ء میں حافظ بصیر پوری کی تیسری شادی تایا کی بیٹی سے ہوئی۔ یہ حافظ بصیر پوری سے پندرہ سال چھوٹی تھیں، بہر کیف یہ سنجوگ کی بات ہے اور جوڑے تو اصل میں آسمانوں پر بنتے ہیں زمین پر تو ان کی ملاقات ہوتی ہے۔ ایسا ہی ہوا اور آخر یہ کامیاب شادی اس تایا زاد سے ہی ہوئی۔ جس کی خواہش حافظ صاحب کی آپا جی کو بھی تھی۔

''حالات کی نامساعدت کے باعث اب والد صاحب بھی راضی ہو چکے تھے۔ ان کا اندازہ مختلف نکلا۔ شادی کے بعد صرف ایک بار میکے گئی، صرف ایک دن کیلئے۔ بس پھر وہ ہماری تھی اور ہم اس کے۔ پڑھائی تو صرف میٹرک تک کی تھی۔ امتحان دینے کا موقع بھی میسر نہ آیا۔ اس نے میری اور میرے والد کی خدمت اور محبت کے

سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ لوگ طاقت ور اور مضبوط اعصاب اور دل و دماغ کے لوگوں کو مرد آہن کہا کرتے ہیں۔ میں اسے زن آہن کہوں گا۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں بچوں کی پیدائش وہ بھی یکے بعد دیگرے چھ بیٹوں اور دو بیٹیوں کی صرف دو سال کے وقفے سے ولادتیں گھر میں ہی ہوئیں۔ روٹین کے مطابق بغیر کسی خادمہ کے بچوں کی رضاعت اور تربیت کے ساتھ ایک نرم قسم کے نازنین شوہر کی دن رات چاہت، ایک بیمار تلخ مزاج سسر کی جو اتفاق سے تبخیر معدہ جیسے مرض کا اسیر اور ہر طرح سے دیکھ رہا تھا۔ شبانہ روز خدمت غرض عائلی زندگی کے ہر تقاضے اور ہر روایت سے یوں عہدہ برآ ہوتی تھی"۔ ۲۲

پہلی دونوں بیویوں سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ جبکہ تیسری بیوی سے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔

حافظ بصیر پوری خود اپنی تیسری بیوی کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری بیوی بہت محنتی، سلیقہ شعار، حوصلہ مند اور خدمت گزار تھی۔ مصنف اپنی ترقی کا سبب اپنی بہن کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی کو بھی قرار دیتے ہیں۔ جس کا ذکر انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح میں کیا ہے:

> اگر ایم اے۔ بی ایڈ حافظ قرآن، عالم دین، شاعر و ادیب، مقرر و ادیب اور روشن ضمیر ہو کر ایک پندرہ سال کی نیم خواندہ لڑکی بے لوث خدمت بے غرض محنت و مشقت کے باعث ایسا غلام ہو جائے کہ عمر بھر اس کا دھیان کسی دوسری عورت کی طرف نہ جائے تو اس کی کرامت سے کون انکار کی جرأت کر سکتا ہے۔ میں پورے ذہنی تحفظ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس نے اپنی پوری زندگی اپنی ذات کے لیے حج و عمرہ کے سوا اصرار کے ساتھ کوئی چیز مجھ سے طلب نہیں کی۔ البتہ میری بہن جو کہ اس کی بہن بھی تھی نند بھی تھی، ساس بھی اور استاد بھی، اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ وہ خود اس دنیا سے سیر ہو چکی تھی۔ اس کی ساری آرزوؤں اور امیدوں کا محور ہم اور ہمارے بچے تھے۔ گھریلو کام کاج، بچوں کی دیکھ بھال اور والد صاحب کا علاج سب اس کی توجہ اور تعاون سے چلتا رہا۔ والد صاحب کی خدمت اور چھوٹی بہن پر شفقت میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ان دونوں کی باہمی امانت اور رفاقت کے باعث میں دینی اور دنیوی عظمت کے تمام پروگراموں پر پوری ذہنی اور جسمانی فراغت کے ساتھ عمل پیرا رہا۔ ۲۳

حافظ محمد منظور حسین بصیر پوری اپنی ترقی اور کامیابی کا راز بھی دوسرے لوگوں کی طرح عظیم خاتون کو ہی قرار دیتے ہیں۔ اس عظیم خاتون کا ذکر انہوں نے اپنی خود نوشت میں یوں کیا ہے:

کہتے ہیں کہ ہر عظیم شخص کی عظمت میں کسی نہ کسی خاتون کی شخصیت کار فرما ہوتی ہے۔ اگر یہ بات درست ہے اور میرے خیال میں یقیناً درست ہے کیونکہ اس پر عظیم ہستیوں کے حالات و واقعات شاہد ہیں کہ میری تمام جدو جہد میں میری ہمشیرہ کے ساتھ ساتھ میری اہلیہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ میری کمسن اہلیہ اگر میرے لئے مسائل پیدا کرتی رہتی اور اس کے مطالبات کی فہرست طویل ہوتی رہتی تو میں بہن کی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی وہ کار ہائے نمایاں انجام نہ دے سکتا جو آج میرے لئے باعث اعزاز و افتخار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے بھی عمر بھر عملاً اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی مگر یہ حقیقت ہے اس نے اپنی شبانہ روز خدمت اور والہانہ محبت سے مجھے قید کیے رکھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر اپنے کرامات کے دروازے کھول دیئے" ۲۴

اولاد

حافظ بصیرپوری کے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بڑے بیٹے حافظ مسعود احمد صاحب ایم اے اردو اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں پروفیسر اور اچھے شاعر تھے۔ اتفاق سے انہیں ایسا سسرال ملا جو گرین کارڈ ہولڈرز تھے۔ دوسرے بیٹے حافظ منصور احمد نے ایم اے۔ ایم فل فارسی پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ پی ایچ ڈی تہران یونیورسٹی سے کی۔ وہ ان دنوں سرگودھا یونیورسٹی میں صدرِ شعبۂ فارسی ہیں۔ تیسرے بیٹے حافظ مشہود احمد نے پہلے کالج پنجاب یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا۔ آج کل حکومت پاکستان میں انکم ٹیکس کی نظامت کے نہایت اعلیٰ عہدے (ڈپٹی ڈائریکٹر اِن لینڈ ریونیو) پر فائز ہیں۔ چوتھے بیٹے حافظ مقصود احمد ایم اے۔ ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے اور نہایت جری اور بیباق سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین خوش الحان نعت خواں بھی ہیں۔ پانچویں بیٹے حافظ مشکور احمد صاحب ہیں۔ ایم اے ایجوکیشن فرسٹ ڈویژن میں پاس کر چکے ہیں۔ بہت اچھے قاریٔ قرآن ہیں۔ اکثر جامعہ کی مسجد میں دورانِ رمضان قرآن کریم وہی سناتے ہیں۔ فرض نمازوں کی امامت بھی ان کے ذمہ ہے۔ چھٹے بیٹے حافظ ایاز احمد نے ایم بی اے کے ساتھ ساتھ ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کر رکھی ہے۔ یوٹیلٹی سٹورز کارپوریشن میں ریجنل مینیجر ہیں۔ بڑی بیٹی ایم اے اسلامیات بی ایڈ اور چھوٹی بیٹی نے بی ایس سی کر رکھی ہے۔
حافظ منظور حسین بصیرپوری لکھتے ہیں:

> میری شادی کے چند روز بعد ہی مجھے خواب آیا کہ ایک غیر معتکف مسجد میں سر جھکائے بیٹھا ہوا ہوں اور میرے سامنے تین بزرگ دستار پوش صاحبان عباؤ قبا جن میں سے دو سیاہ ریش نوجوان اور درمیان میں ایک سفید پوش بزرگ تشریف فرما ہیں۔ وہ بزرگ فرماتے کہ ابھی آپ کے جسم سے آپ کے گناہوں کے مطابق شعلے بلند ہوں گے اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ شاید میرے دائیں بائیں کچھ لوگ بھی ہیں۔ جو سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ چند لمحوں کے بعد ایسا لگا کہ میرے جسم سے آگ کے شعلے بلند

ہو رہے ہیں۔ میں دل ہی دل میں خوف محسوس کرتے ہوئے کہتا ہوں
کہ سب سے زیادہ گنہگار ہوں اور میرے شعلے سب سے بلند ہوں گے۔
وہ سفید ریش بزرگ میرے دل کے خیال سے مطلع ہو جاتے ہیں اور
میری پشت پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں۔ فکر نہ کرو اللہ تعالیٰ رحم فرمائے گا اور
تمہیں بخش دے گا بلکہ تمہاری پشت سے تو چھ ولی ہوں گے۔ اس کے بعد
شعلے غائب ہو جاتے ہیں اور منظر بدل جاتا ہے۔۲۵

ملازمت

۱۱ ستمبر ۱۹۶۲ء میں حافظ بصیر پوری نے ڈی سی سکول میں بطور فارسی اُستاد سرکاری ملازمت کا آغاز کیا۔ پرائیویٹ طور پر ایف اے کیا۔ اس کے بعد گریجوایشن فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کی وجہ سے آپ کی فارسی سے انگلش ٹیچر پروموشن ہو گئی۔ ۱۹۶۵ء میں بی ایڈ کرنے سے ٹرینڈ انگلش ٹیچر بن گئے۔ اس طرح بصیر پور ہائی سکول میں واحد آپ بی ایڈ ٹیچر تھے جو کہ ٹرینڈ بھرتی ہوئے۔ بطور ٹرینڈ انگلش ٹیچر حافظ بصیر پوری نے ہائی سکول بصیر پور میں دس سال خدمات سرانجام دیں۔

آپ نے فارسی میں ایم اے کیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی پبلک سروس کمیشن کی طرف سے ۱۹۷۵ء میں فریدیہ ڈگری کالج پاک پتن میں بطور لیکچرار آپ کی تقرری ہوئی۔ تین سال فریدیہ کالج پاک پتن میں بطور لیکچرار کام کیا اور اس کے بعد ۱۹۷۷ء میں آپ کا تبادلہ گورنمنٹ کالج بورے والا میں ہو گیا۔ بورے والہ میں چار سال تک شب و روز بسر کئے اور اپنے فرائض منصبی کو بھی بطریق احسن نبھایا۔ ۱۹۸۱ء میں آپ کا تبادلہ بورے والا سے گورنمنٹ کالج دیپال پور میں ہوا۔ یہاں آپ نے بیس سال بطور لیکچرار خدمات سرانجام دیں۔ اسی کالج میں حافظ بصیر پوری نے تین سال بطور پرنسپل بھی ذمہ داریاں نبھائیں اور ۲۰۰۳ء میں اسی عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔

وہ اپنی نظیر آپ ہیں اور اپنی مثیل آپ
آنکھوں سے نہاں، دل میں عیاں، اپنی دلیل آپ

خدوخال:

آپ خوبرو اور نہایت وجیہہ چہرے کے مالک، جبیں بہت کشادہ، بڑی بڑی نشیلی سرمئی آنکھیں، گھنی داڑھی، نہ زیادہ لمبی اور نہ ہی چھوٹی، عین سنت کے مطابق۔ ان کا چہرہ ہنستا مسکراتا اور کھلتا رنگ، ان کے خدو خال بہت نشیلے، موزوں اور من بھاتے تھے۔ ان کا چہرہ بارونق اور نور قرآن سے روشن تھا۔ بقول محسن نقوی

میں نے دیکھا تھا اُن دنوں میں اُسے
جب وہ کھلتے گلاب جیسا تھا
اس کی آنکھوں سے نیند چھنتی تھی
اس کا لہجہ شراب جیسا تھا
لوگ پڑھتے تھے خال و خد اُس کے
وہ ادب کی کتاب جیسا تھا

قد پانچ فٹ دس انچ، طبعاً شفیق، حلیم، دردِ دل، خوف خدا اور عشق رسول ﷺ رکھنے والے انسان نواز خدا دوست، علم پرور اور سخن شناس شاعر وادیب تھے۔ حافظ بصیر پوری سچے مومن تھے بلکہ اس دور کے کامل ولی تھے۔ وہ انسان اور انسانیت کے ساتھ سچے دل سے محبت کرنے والے سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ پابندِ شرع، عابد اور زاہد اور باصفا صوفی جن کا ظاہر اور باطن انسان اور انسانیت کے لیے ہر دم کوشاں رہتا۔ درس و تدریس سے فراغت ملتی تو مالک حقیقی کی خوشنودی کے لیے اس کے ساتھ راز و نیاز میں لگے رہتے۔

قدیم اور جدید علوم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ فارسی سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا یہی وجہ تھی کہ آپ فارسی کے ذی وقار عالم اور استاد سمجھے جاتے تھے۔ وہ عربی زبان وادب کے بھی رمز شناس تھے۔ ان کا شمار عصر حاضر کے رومانوی شاعروں میں ہوتا ہے۔

حرمین شریفین سے واپسی کے بعد ان کی طبیعت مجاز سے ایسی اچاٹ ہوئی کہ پھر ہر طرح سے رشتہ روحانیت سے جڑ گیا جو مرتے دم تک قائم و دائم رہا۔ اب صرف عبادت و ریاضت ان کا معمول بن چکا تھا۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف خدا اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ اس لئے اب ان کے شب و روز درگاہِ خداوندی میں گریہ زاری میں گزرتے تھے۔ دنیا کی بے ثباتی پر مکمل یقین تھا۔

اورئینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی شعبہ فارسی کے نامور محقق اور استاد ڈاکٹر معین نظامی حافظ بصیر پوری کی شخصیت کو علم وادب کا مرقع قرار دیتے ہیں۔ وہ حافظ بصیر پوری کو اہل دین و دانش اور بہت سی خوبیوں کا منبع قرار دیتے ہوئے یوں بیان کرتے ہیں:۔

> حضرت علامہ حافظ منظور حسین بصیر پوری اہل دین و دانش، صاحب دل و نظر اور بھرپور علمی و عملی شخصیت ہیں۔ تدریس، خطابت اور تحقیق و تالیف میں ان کا والہانہ انہماک شعر و سخن سے ان کی گہری طبعی دل چسپی اور نثر نگاری میں ان کے اسلوب کی متانت اور جاذبیت مسلم ہے[۲۶]

اسرار اعظمی حافظ بصیر پوری کو علمی وادبی شخصیت قرار دیتے ہیں۔ وہ حافظ بصیر پوری کو علم و دانش کی

حامل ہمہ جہت شخصیت کے طور پر ظاہر کرتے ہیں:۔

حافظ نظر میں سماتے ہیں بلکہ نظروں کی راہ دل میں اتر جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ آقائے نامدار مدنی تاجدار علیہ الصلوۃ والسلام و علی آلہ الاطہار کی نظر کرم میں رہتے ہیں۔ بارگاہ عرش جاہ میں بار بار جاتے ہیں اور مہمانی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ رحمت لازوال سے صدقے پر صدقہ پاتے ہیں۔ ۲۷

ان کی شخصیت کی طرح ان کی تحریریں بھی جامعیت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ وہ ایک مفکر کی طرح سوچتے ہیں ایک مصنف کی طرح خیالات کی تالیف کرتے ہیں۔ ایک عالم دین اور حافظ کتاب مبین کی طرح قرآن و حدیث سے استشہاد لاتے ہیں۔ ایک شاعر کی طرح تخیل و جذبات کی چاشنی دیتے ہیں۔ ایک معلم کی طرح سمجھاتے ہیں اور ایک ادیب کے رنگ میں سپرد قلم کردیتے ہیں۔

ناز۔ایم۔اے حافظ بصیر پوری کی شخصیت بارے یوں رقمطراز ہیں:

ایک ایسی ہستی جسے عامۃ الناس مذہبی پیشوا مانتے ہیں۔ اصحاب دل شاعر خوشنوا جانتے ہیں۔ اور ارباب علم اپنا مقتدا گردانتے ہیں جو طلبہ کے حلقے میں مشفق استاد و رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ اہل قلم کے زمرے میں صاحب طرز ادیب اور تقریر کی دنیا میں خوش گو خطیب۔۔۔ کُنج حرم میں صوفی با صفاء مے کدۂ محبت میں رند بے ریا، منبر و محراب کی زینت، بیان وخطاب کی عظمت، عادات میں زیبائی، خیالات میں رعنائی، لباس میں سادگی، چال میں افتادگی، پیشانی صبح تاباں آنکھیں شام غریباں، شخصیت مقناطیسی، محبت دقیانوسی، ذات انجمن، بات چمن در چمن، شاگرد نواز دوست باش، زود آشنا اجنبیت پاش، محرم راز حقیقت و مجاز۔ واقف سر ناز و نیاز، عاشق بے چین، پروفیسر الحاج الحافظ محمد منظور حسین نوری نعیمی قادری بصیر پوری ابن الحاج الحافظ محمد حسین صاحب چشتی رحمۃ اللہ علیہ" ۲۸

بطورِ استاد خدمات

پروفیسر حافظ بصیر پوری کا تمام گھرانہ زیور تعلیم سے آراستہ و وابستہ رہا ہے۔ حافظ صاحب کی والدہ اور بہن نے اپنی تمام زندگی بچوں کی تعلیم و تربیت میں بسر کی اور آخری دم تک یہ خدمات سرانجام دیتی رہیں۔ اپنے اہل خانہ

کی طرح حافظ صاحب نے بھی عملی زندگی کا آغاز بچوں کی درس و تدریس سے ہی کیا۔ حافظ بصیرپوری نے ۱۹۶۲ء میں ڈی سی ہائی سکول بصیرپور میں بطور فارسی استاد منصب سنبھالا۔ ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بچوں کی دلچسپی میں اضافہ کرنے اور ان کی بہترین تربیت کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہے۔ ان کے تمام شاگرد تادم مرگ ان کے گرویدہ رہے اور مرنے کے بعد ان کے کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

جامعہ نوریہ نعیمیہ کا قیام

حافظ بصیرپوری مشرقی مزاج کے آدمی تھے۔ انھوں نے خود اپنی ذاتی جدوجہد سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ اپنے استادِ محترم اور پیر و مرشد کی صحبت کی برکت سے خدمت دین اور مسلمان نوجوانوں کی تعمیر سیرت ان کی زندگی کا مقصد رہا۔ اس مقصد کے حصول کیلئے دینی و دنیوی علوم کی نشرواشاعت کے لئے ادارہ جامعہ نوریہ نعیمیہ کی جامع مسجد غلہ منڈی بصیرپور میں بنیاد رکھی جس کا مقصد حفظ قرآن، درس قرآن و حدیث اور تبلیغ اسلام تھا۔ اس میں کافی حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے۔ اس ادارہ کا نام اپنے پیر و مرشد کی مناسبت سے نوریہ نعیمیہ رکھا۔ اس ادارہ قابل قدر خدمات انجام دیں۔ حافظ بصیرپوری رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں سے پوری دل جمعی سے تدریسی اور تبلیغی ذمہ داریاں ادا کرنے کی توفیق حاصل ہوئی چنانچہ انہوں نے محض اللہ کی رحمت سے اپنی فطرت کے مطابق بھرپور کام کیا۔

نوریہ کالج

شہر میں سکول کی سطح پر ٹیوشن سنٹر "آشیانہ" کی شکل میں تھے لیکن کوئی بھی ادارہ کالج کی سطح کا نہ تھا۔ حافظ صاحب نے ۱۹۶۸ء میں نوریہ کالج کی بنیاد رکھی۔ اس کالج میں سال اول یعنی گیارہویں کلاس سے بی اے لیول کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ پہلی فرسٹ ایئر کلاس دس بچوں پر مشتمل تھی۔ یہ تمام بچے عملی میدان میں کامیاب زندگیاں گزار رہے ہیں۔ حافظ صاحب نے ان کی آبیاری خدمت خلق کی نیت سے کی۔ ان طلبا میں کئی پروفیسر بھی ہیں اور تعلیمی میدان میں اپنا نام پیدا کر رہے ہیں۔ ان کے شاگردوں میں دو نام زیادہ اہم ہیں۔ امجد علی شاکر اور منظور اختر (تحسین فراقی)۔ ان میں ایک نام حافظ محمد نوراللہ ہے۔ حافظ صاحب کے بہت ہی قریب رہا۔ اس کی تعلیم و تربیت میں حافظ صاحب کی بھرپور شفقتوں کا حصہ ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ٹرپل ایم۔ اے کرنے کے بعد ریڈیو پاکستان اسلام آباد میں سینئر پروڈیوسر سے ترقی کر کے پروگرام مینیجر کے عہدے تک پہنچے۔ جب تک حافظ صاحب بصیرپور میں رہے یہ کالج چلتا رہا۔ اس کے بعد حافظ صاحب بطور لیکچرار پاک پتن چلے گئے جس کی وجہ سے کالج بند ہو گیا کیونکہ آپ کی مصروفیات زیادہ ہو گئیں اور گھر سے دوری بھی کالج بند ہونے کا سبب بنی۔

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روح انسانی

جامعۃ المنظور اسلامک اکیڈمی کا قیام

۱۴ اپریل ۱۹۸۶ء کو بصیر پور میں "منظور اسلامک اکیڈمی" کی بنیاد رکھی۔ ایک ہائی سکول جو رجسٹرڈ اور لاہور بورڈ (انٹر میڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ) سے الحاق شدہ ہے۔ اس ادارہ کے ریکٹر اور پرنسپل کے فرائض آپ کے بیٹے کے سپرد ہیں۔ یہ اکیڈمی جو کہ اب جامعۃ المنظور کے نام سے جانی جاتی ہے، اس علاقے کی تعلیم میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ درس گاہ پوری تحصیل میں اپنی شناخت آپ ہے۔ اس کے قیام کیلئے حافظ صاحب نے دن رات محنت کی اور اپنا سب کچھ اس کی تعمیر میں خرچ کر دیا۔ اس کے قیام میں شب و روز کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اپنی مالی معاشی، ذہنی و جسمانی اور اخلاقی صلاحیتیں سب اس ادارے کیلئے وقف کر دیں۔

اس ادارے میں انٹر و ڈگری کلاسز کے تمام مضامین مثلاً آرٹس، سائنس کمرشل کمپیوٹر پڑھائے جاتے ہیں۔ طلبا و طالبات کے لیے پوسٹ ڈگری کلاسز ایم اے (عربی و فارسی) اسلامیات، اردو، انگلش، اکنامکس جاری ہیں۔ اس کے علاوہ پروفیشنل کلاسز کا اجراء بھی کیا گیا یعنی بی۔ ایڈ، ایم ایڈ، ایل ایل بی۔ یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو کے لیے تعلیم کے یکساں مواقع موجود ہیں۔ اس کے علاوہ (فاضل عربی و فارسی) اردو، پنجابی، درس نظامی، ناظرہ قرآن کریم، تجوید و قرأت، فارسی صرف و نحو، دورہ قرآن، دورہ حدیث، ادب، فقہ، تفسیر، تقابل ادیان، سیرت النبی ﷺ کے علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ ان تمام دینی و دنیوی علوم کے ساتھ ساتھ تربیتی کورسز بھی کروائے جاتے ہیں۔ ان کورسز میں کتابت، اردو، عربی، انگریزی، فائن، آرٹس، شاعری، باغبانی، تعمیر، دستکاری، حسن قرات، نعت خوانی، اردو و عربی تقریری و تحریری مقابلوں کا انعقاد بھی متوازی بنیادوں پر کرایا جاتا ہے۔

یہ ادارہ اب بھی اس علاقے کی آن بان شان ہے۔ دینی و دنیوی علوم کے ساتھ تمام دوسرے علوم و فنون کے فروغ میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ اہل علاقہ کے تمام طلباء طالبات اس سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ اپنی علمی تشنگی کو پورا کر رہے ہیں۔ دنیاوی علوم کے ساتھ دینی علوم اور اشاعت اسلام کیلئے بھی اپنی ذمہ داریاں نبھا رہا ہے۔

اس ادارہ میں پی ٹی شو اور ڈرل کے علاوہ دستکاری کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ کرسی بننا، چارپائی بننا، باغبانی، مصوری، شاعری تحریر و تقریر جیسے سب مشاغل کی عملی مشق کروائی جاتی ہے۔ کھیلوں کے سالانہ مقابلے منعقد ہوتے ہیں اور زیر تعلیم بچے بچیاں انعامات حاصل کرتے ہیں۔ قائداعظم ڈے، اقبال ڈے، پاکستان ڈے باقاعدہ منائے جاتے ہیں۔ بلکہ ۱۴ اگست جیسے قومی تہواروں پر رنگا رنگ تفریحی پروگرام بھی پیش کئے جاتے ہیں جن میں طلبہ مزاحیہ ڈرامے اور قوالیاں، سائنسی شعبدے اور عجوبے دیکھ کر خوب داد دیتے ہیں۔

ابتداء میں کم از کم ہر ماہ ایک جلسہ عام اور سالانہ عظیم الشان کانفرنس منعقد کرکے اس میں مشائخ عظام، قرائی کرام، نعت خوانان، خوش الحان، علمائے ذیشان اور عام اسلامیان پاکستان کو مدعو کیا جاتا ہے۔ ۲۰۰۰ء میں مصر کے نامور قاری عبداللہ امین الجزار کی آمد ادارے کے لیے ایکیادگار ہے۔

اس محفل قرأت میں مولانا غلام علی اوکاڑوی نے بھی علم و فضل کے موتی بکھیرے۔ کوئی نہ کوئی بہت بڑا

مقبول سیاستدان بھی بلایا جاتا ہے۔ طلبہ میں سے حفاظ کرام اور دیگر دینی طلبہ کی دستار بندی ہوتی ہے اور اسناد تقسیم کی جاتی ہیں۔ شعبۃ البنات میں طالبات کو بھی خاتون مہمان سے سندات و انعامات دلوائے جاتے ہیں چنانچہ اس ادارے میں سابق وزیر اعظم نواز شریف، سابق وزیر تعلیم و بلدیات، خزانہ و پارلیمانی امور محمد یسین وٹو مرحوم، سابق وزیر اعلیٰ پنجاب میاں منظور احمد خاں وٹو اور بہت سے دیگر وزرا، ایم این اے، ایم پی اے حضرات وقتاً فوقتاً تشریف لاتے اور طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں۔

ادبی سفر

نویں کلاس میں حافظ بصیرپوری نے اپنی پہلی غزل کہی۔ ۱۹۶۹ء میں جب آپ کی عمر محض چھبیس سال تھی آپ کا پہلا مجموعہ کلام "افق شام" شائع۔ حافظ بصیرپوری کی ادبی زندگی کا آغاز چودہ برس کی عمر میں ہوا۔ ان کی شاعری جدید و قدیم روایت کا حسین امتزاج ہے۔ انہوں نے ہر اہم صنف سخن اور موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ حافظ بصیرپوری کے کلام میں غزلیات، نظمیں، قطعات، مثنویاں، قصائد، مرثیے، نعتیں، سلام و ملی، وطنی اور قومی نظمیں، عشق حقیقی اور معرفت کے مضامین کے علاوہ طنز و مزاح کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ چند ایک پنجابی نظمیں بھی ملتی ہیں۔ جب کہ فارسی میں بھی قابل قدر کلام موجود ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ ایک درسٹائل شاعر اور ادیب تھے۔

دینی خدمات

حافظ بصیرپوری کی شخصیت میں حسن قرآن اس درجہ کمال تک تھا کہ صرف ۔۔۔۔ سال کی ۔۔۔۔ عمر میں قرآن کریم تراویح میں سنانا شروع کر دیا۔ حافظ صاحب نے قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں پہلا مصلیٰ چک ۱۲۳ نہر مراد میں سنایا اور وہاں کے امام و خطیب مولوی ظفر احمد صاحب کی تقریر اور تعظیم و توقیر سے خاصا متاثر ہوئے۔ بصیرپور میں ایک باوقار عالم دین مولانا محمد نور اللہ نعیمی رحمۃ اللہ علیہ بھی موجود تھے اور ان کا مدرسہ بھی دینی خدمات انجام دے رہا تھا جبکہ حافظ بصیرپوری باقاعدہ جمعہ میں بھی شریک ہو کر علمائے دین کی تقریریں بھی سنتے تھے۔ اس کے باوجود حافظ صاحب کے دل میں مولوی بن جانے کا شوق نہ تھا۔ اگلے سال دوسرا مصلیٰ پیر و مرشد مولانا نور اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کے مطابق پپلی پہاڑ میں جا کر سنایا، گو حافظ صاحب کم سن تھے لیکن آپ کا قرآن مجید پختہ تھا۔ اس وجہ سے ان کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہاں کا امام مسجد حافظ بصیرپوری کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی وہ قبلہ حضرت صاحب کے معتقد تھے۔ دوسرا انھیں حافظ صاحب کے بارے تاکید کی گئی تھی۔ تیسرا حافظ صاحب پڑھے لکھے اور معزز زمیندار گھرانے کے فرد بھی تھے۔

اس دور کی یادوں کو حافظ بصیرپوری نے شعروں کی زینت بنایا ہے اور خوبصورت انداز میں اپنے جذبات و احساسات ذوق و کیفیات کو بیان کیا ہے۔

جب باد بہاری کے جھونکے اس گل کی یاد دلاتے ہیں
سو بار کریں گے یاد اسے کیوں لوگ ہمیں سمجھاتے ہیں

دوسری ایک طویل نظم جو پہلی پہاڑ میں لکھی تھی اور ادھر سکول میں بھی سنائی تھی

ہر شے پہ اک نکھار ہے پہلی پہاڑ میں
ہمدم عجب بہار ہے پہلی پہاڑ میں

حافظ بصیر پوری نے اپنے پیر و مرشد کے کہنے پر رمضان المبارک کے آخری تین دن دار العلوم حنفیہ فریدیہ بصیر پور کی جامعہ مسجد نور میں نماز تراویح پڑھائی۔ آپ کے پیر و مرشد نے ان کی آواز کو پسند فرمایا۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۸۳ء تک حافظ بصیر پوری نے ہی دار العلوم حنفیہ فریدیہ میں نماز تراویح کی امامت کی حالانکہ اس عرصہ میں قبلہ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک چھوٹے بھائی، ایک بھتیجے اور ایک نواسے نے بھی قرآن کریم یاد کر لیا تھا۔ بعد ازاں حضرت صاحبزادہ صاحب محمد محب اللہ نوری نے حافظ صاحب کو اجازت دے دی۔

۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۸ء میں حافظ بصیر پوری مدینہ منورہ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے چنانچہ انھوں نے اس عرصے میں مسجد نبوی میں قرآن سنایا۔ وہاں اس زمانے میں سرکاری تراویح کے اختتام پر نماز باجماعت میں قرآن کریم سنانے کی اجازت تھی۔ تاہم اس کی جرأت کم ہی کوئی کر پاتا تھا کیونکہ ملکوں ملکوں کے حفاظ وہاں موجود ہوتے تھے۔ اس کے باوجود حافظ صاحب کو لقمہ لینے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔

۱۹۹۳ء کے بعد حافظ بصیر پوری اپنے تعلیمی ادارہ جامعۃ المنظور کی مسجد میں قرآن پاک سناتے رہے۔ جس کی تکمیل و تشکیل کا کام ۱۹۸۶ء میں شروع ہوا تھا اور اب مسجد بھی مکمل ہو چکی تھی۔ جمعہ بھی شروع ہو چکا تھا اور کلاسز بھی۔ حافظ صاحب نے اپنے ادارے میں دس بارہ مصلّٰی سنانے کے بعد امامت اپنے بیٹے حافظ مشکور احمد کے سپرد کر دی۔

جب حافظ بصیر پوری ملتان میں بی ایڈ کر رہے تھے تو خواجہ بہاؤالدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ کے سجادہ نشین نواب صادق حسین قریشی اور ان کی سطح کے بعض دیگر علمائے کرام نے مل کر توحید کانفرنس منعقد کروانے کا فیصلہ کیا۔ مذہبی فرقے توحید کے عقیدہ پر متفق تھے جس میں ہر فرقے اور مسلک کے علماء نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مفتی محمد حسین نعیمی، مظفر علی شمسی، مولانا عبد القادر روپڑی اور دیگر علمائے کرام تشریف لائے۔ اس کانفرنس کا سپاسنامہ حافظ بصیر پوری نے لکھا۔

۱۹۷۷ء میں جب اہل سنت کے سیاسی قائدین کی راہنمائی میں تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ بڑے زور شور سے چلی اور ملتان قاسم باغ سٹیڈیم میں آل پاکستان سنی کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں اس وقت کے ملکی اور بین الاقوامی میڈیا کی رپورٹ کے مطابق شرکاء کی تعداد قریباً ۵ لاکھ بتائی گئی تھی۔ حافظ بصیر پوری کو اس کانفرنس کے سٹیج پر ایک فی البدیہہ نظم پڑھنے کا موقع ملا۔ جس میں یہ قطعہ بھی شامل تھا۔ یہ نظم ان کے مجموعہ کلام

"نالہ شب" میں ہے۔

نظام مصطفٰی ہم سنیوں کو جان سے پیارا ہے
یہی خواہش ہماری، تقاضا یہ ہمارا ہے
خدا پر ہے توکل اولیاء کا سہارا ہے
بہاؤالحق والدیں، رکن عالم نے پکارا ہے
تو ہم لبیک کہہ کرآج ان کے پاس آئے ہیں
خلوص و عجز کے ہدیے بھی اپنے ساتھ لائے ہیں۲۹

شہر میں ان دنوں دو دینی و روحانی مراکز موجود تھے۔ دارالعلوم حنفیہ فریدیہ بصیرپور اور جامعہ مسجد غوثیہ غلہ منڈی بصیرپور اور باقی مراکز اُس وقت وجود میں نہیں آئے تھے۔ ایک اور مرکز خواجہ محمد اکبر رحمۃاللہ علیہ کا دربار تھا مگر وہاں لوگ صرف عرس پر جمع ہوتے تھے۔ نماز جمعہ بھی نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ سجادہ نشین صاحب اس وقت تک پاکستان میں نماز جمعہ کے قائل نہیں تھے۔ حافظ صاحب مسجد غوثیہ میں خطیب تھے۔ اس لئے ان دونوں مراکز میں شیخ مولانا محمد نوراللہ نعیمی رحمۃاللہ علیہ ایک بلند پایہ عالم تھے۔ عوام الناس کسی بھی مسئلہ کے حل کے لئے انہی سے رجوع کرتے۔ یہ عرصہ تقریباً چوبیس سال پر محیط تھا۔ یہ عرصہ شہر اور گردونواح میں حافظ کی دینی حیثیت کو مستحکم کرنے کا باعث بنا۔ حافظ اپنے استاد اور پیر و مرشد کے بعد دینی تقاریر اور خطیبانہ مقاصد کے لئے مرجع عوام و خواص رہے۔ والد صاحب کے سلسلہ عالیہ چشتیہ میں خواجہ محمد اکبر رحمۃاللہ علیہ کے بیعت ہونے کی وجہ سے حافظ کے گھر میں بزرگان دین سے عقیدت اور رغبت پائی جاتی تھی۔ دوران خطابت حافظ صاحب غلہ منڈی بصیرپور کی جامع مسجد میں طلباء کو دورۃالقران اور درس نظامی کی تدریسی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ حضرت فقیہ اعظم رحمۃاللہ علیہ کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے مختلف مشائخ اور علماء کی قربت بھی نصیب رہی۔ حافظ صاحب رحمۃاللہ علیہ صوم و صلوٰۃ کے تو پابند تھے ہی لیکن آپ کو خدا اور رسول ﷺ کا قرب خاص بھی حاصل تھا۔ حافظ صاحب کو قبلہ مولانا نوراللہ رحمۃاللہ علیہ کی اجازت سے دلائل الخیرات کی بھی اجازت تھی۔ یہ دونوں وظائف دلائل الخیرات اور دعائے مغنی جو کہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کا خاص وظیفہ تھا، حافظ صاحب کے روزانہ کے معمولات میں شامل تھے اور تادم آخری جاری رہے۔ حافظ صاحب کو دارالعلوم کا شاعر سمجھا جاتا تھا۔ دارالعلوم کے ہر جلسہ میں ان کی تقریر، نظم یا خطاب ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنے استاد و مربی حضرت قبلہ محمد نوراللہ نعیمی رحمۃاللہ علیہ کی ایما پر جماعۃالحضرت اسلامک یونیورسٹی جو کہ بیس ایکڑ پر محیط تھی اور پیر صاحب آف دیول شریف بنوار ہے تھے۔ وہاں انہوں نے شمولیت کی اور وہاں اس وقت کے صدر پاکستان ایوب خان سے بھی ملاقات ہوئی۔ حافظ بصیرپوری اپنے پیر و مرشد کے منظور نظر اور مشیر خاص تھے۔ حافظؔ بصیرپوری سے دارالعلوم کے ہر معاملہ میں مشاورت لی جاتی تھی حتیٰ کہ کسی خاص واہم معاملہ میں بھی سب سے زیادہ اہمیت ان کے مشورہ

کو دی جاتی تھی۔ عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر جلوس کے اعلیٰ اہتمام و انتظام کا بندوبست بھی حافظ بصیرپوری ہی کرتے تھے۔ اس دن کے پروگرام کو بھی ترتیب دینا ان کے ذمہ تھا۔

حافظ بصیرپوری نے سب سے پہلے غلہ منڈی بصیرپور کی جامع مسجد میں تین روزہ محفل شبینہ کا آغاز کیا۔ یعنی تین راتوں میں خصوصی طور پر قرآن مجید ختم کروایا جاتا اور سامعین کے لئے پر تکلف سحری کا انتظام بھی کرایا جاتا اور آج تک جاری ہے۔ حافظ بصیرپوری نے غلہ منڈی میں بزم غلامان مصطفیٰ ﷺ تشکیل دی۔ جس کے تحت ہر سال ایک عظیم الشان محفل نعت و قرأت قبلہ فقیہ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں کروائی جاتی چنانچہ ان محافل میں جناب محمد علی ظہوری، اختر سدیدی، قاری زبیدالرسول مرحوم، قاری محمد اکرم سیمابی، سلیم صابری، تاج الدین تاج اوکاڑوی، عبدالستار نیازی آف فیصل آباد، محمد اعظم چشتی، قاری منظور احمد آف خان پور، جناب رضا زیدی آف لاہور، محمد عامر آف لاہور، محمد یوسف میمن آف کراچی اور بزرگ نعت خواں جناب سید منظور الکونین آف واہ کینٹ راولپنڈی اور جناب شہریار قدوسی آف کراچی شرکت کرتے اور عشاق رسول کے دل و جان کو معطر اور دین و ایمان کو منور کرتے۔ حافظ صاحب نے بے مثال قرآن کانفرنسیز منعقد کروائیں۔ سعودی عرب کے قاری استاذ القرأ قاری محمد ابراہیم مدنی، اور مصر کے قاری و مقری جناب عبداللہ الامین الجزار، سید القرأ جناب ڈاکٹر قاری عبدالرحمٰن شمسی، زینت القرأ جناب حجاج رمضان الہنداوی، جامعۃ الازہر مصر کے استاذ القرأ سعید متولی عبدالعال المتولی بھی تشریف لائے اور حسن قرأت کا ایسا سماں باندھا جس کی یاد اہل علاقہ کے دل کو اس وقت تک بے قرار رکھے گی جب تک دوبارہ ایسی حسن قرأت کانفرنس منعقد نہیں ہوتی۔ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ادارے میں ہر سال کئی طلباء حفظ و قرأت کے علاوہ تاریخ، اردو، اسلامیات اور عربی کے ساتھ درس نظامی کے بعض مضامین مثلاً صرف و نحو، فارسی، دورۃ القرآن، دورۃ الحدیث حاصل کرکے فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ حافظ بصیرپوری نے غلہ منڈی کی مسجد غوثیہ اور پھر جامعۃ المنظور (منظور اسلامک اکیڈمی) کی جامع مسجد میں طویل عرصہ تک امامت کی۔ حافظ بصیرپوری نے بچیوں کے لئے تعلیم و تربیت اور حفظ کا بھی بیت القرآن کے نام سے بندوبست کر رکھا تھا۔ بہت زیادہ تعداد میں بچیاں بھی دینی تعلیم سے آراستہ ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ جامع مسجد غلہ منڈی سے آپ نے اپنے ادارے کی مسجد کی امامت اور اس اکیڈمی کا انتظام و انصرام سنبھال لیا۔ تقریباً عرصہ بیس سال سے منظور اسلامک اکیڈمی میں دینی تعلیم کی اشاعت، تبلیغ اسلام، دین کے متعلق تمام مسائل اور قرآن و حدیث کی تفسیر اور درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اپنے بیس سال عبادت و ریاضت میں گزار دیئے۔ لوگوں کی اصلاح میں اپنی زندگی صرف کی۔ اپنے شب و روز اور مالی وسائل بھی لوگوں کی فلاح و بہبود اور تبلیغ اسلام کی خاطر صرف کر دیئے۔ آپ نے اپنی زندگی خدا اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کی خاطر گزار دی۔

اخلاق و کردار

حافظ بصیرپوری کی شخصیت اتنی ہمہ جہت تھی کہ ان کے محاسن کو کسی یوں چند صفحات میں سمونا ممکن

نہیں ہے۔

حافظ بصیر پوری دین کا حقیقی علم رکھنے والے اور اہل اللہ کی صحبت سے فیضیاب ہونے والے عالم باعمل اور صالح انسان تھے۔ ان کا ظاہر اور باطن ایک تھا۔ وضع نستعلیق، اشجع، سر گرم و مستعد، غیرت مند اور بہاڈر انسان تھے۔ حافظ صاحب دل کے غنی، ہاتھ کے سخی اور دردِ دل رکھنے والے مخلص اور بے لوث انسان تھے۔ ان میں ہمدردی اور غم خواری کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔

حافظ بصیر پوری اعلیٰ اخلاق و کردار کے مالک بہت دل نواز، دل افروز، پُر وقار اور ہمہ جہت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حُسنِ صورت کے ساتھ ساتھ حُسنِ سیرت سے بھی نوازا تھا۔ ان کی شخصیت دینی غیرت و حمیت، خلوص و للّٰہیت، جرأت و استقامت، شہامت، بسالت، قول و عمل میں یکسانیت، کرم و مودّت، نظامت و نفاست، مطالعہ کی وسعت، محنت و لگن، سادگی و بے تکلفی، ذوقِ مہمان نوازی، خوش مزاجی، خوش گفتاری، دل داری و ملن ساری، قدر دانی و رتبہ دانی و رتبہ شناسی الغرض فاضلانہ، کریمانہ، اور مومنانہ مکارم اخلاق کی مرقع تھی۔

حافظ بصیرپوری ملت اسلامیہ کا حقیقی درد رکھنے والے مفکر، ادیب، شاعر اور فلسفی تھے۔ وہ دوستوں کے دوست، خوش باش، خوش لباس، خوش گفتار، خوش اطوار، خوش رفتار، خلیق و ملن سار اعلیٰ کردار، وضع دار، مرنجان مرنج طبیعت اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ خوف خدا رکھنے والے انسان تھے۔ یہ ان کی کرامت اور حسن قبول ہے جو کہ اُن کی تصانیف سے زیادہ مقبول ہوا اور ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر تقسیم ہو چکا ہے۔ اس پر مستورات بالخصوص کثرت سے عمل پیرا ہوتی ہیں بلکہ عرب و عجم سے اس کی مانگ اور طلب کے خطوط اور پیغام آتے ہیں۔

غیر مطبوعہ تصانیف

مندرجہ بالا تصنیفات کے علاوہ بھی کچھ کتب زیر طباعت ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد مارکیٹ میں آجائیں گی۔

رسالہ نافعہ

ایک ایسا رسالہ نافعہ جس میں تصوف، عشق الٰہی اور درویشی کے مطول و مفصل مباحث کی بجائے دین و دانش کے اسرار و فکر و سلوک کے رموز کا عطر کشید کر کے رکھ دیا گیا ہے کہ رہروان شریعت و طریقت اور سالکان جادہ معرفت و حقیقت کے لئے خضر راہ ثابت ہوا۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

سفر نامہ بغداد

۵ فروری تا ۱۵ فروری ۲۰۱۴ء حضرت حافظ بصیرپوری اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ عراق کی زیارت عازم سفر ہوئے۔ "سفر نامہ بغداد" یہ بغداد کا سفر نامہ ہے۔ اس میں شہر کی تاریخی، جغرافیائی، مذہبی، سیاسی

حالات و واقعات قلم بند کیئے گئے ہیں۔ اس میں (غوث صمدانی، شہباز لامکانی، قندیل نورانی) شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے فضائل و مناقب اور ان کے شہر بغداد کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بغداد کی تاریخی و مذہبی اہمیت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

خود نوشت سوانح عمری (میں اور میرے)

یہ جناب حافظ بصیر پوری کی خود نوشت سر گزشت ہے۔ کم و بیش ایک ہزار صفحات پر مشتمل مصنف کی بہتر سالہ زیست کی داستان ہے جس کا ورق ورق اشک فشاں اور سطر سطر خونچکاں ہے۔ کتاب کا نام بظاہر نہایت سادہ مگر عام روش سے ہٹ کر اور نہایت جامع و بلیغ ہے۔ "میں" سے ان کی رودادِ حیات آشکار ہے اور "میرے" سے مراد ان آباؤ اجداد، خویش و اقربا، بچپن کے دوست اور ہم جماعت، مشائخ، والدین، اساتذہ، بھائی بہن۔ عمر بھر کے دوست و احباب شاگرد، رشتہ دار، مخالف، ہمسائے، ہمکار، لڑکپن، شباب، کہولت، او وار کے پیارے یار، اغیار حتیٰ گھر بار، در و دیوار، مختلف دیار و امصار کے سفر میں غمخوار و غم گسار کا آئینہ دار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ساری کتاب میں غم والم کی ایک لہر جاری ہے مگر اس میں بھی جھوٹ نہیں کہ جابجا آنکھوں سے آنسو رواں اور ہونٹوں پر تبسم رقص کناں ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ابا جان، امی جان آپا جان، استاد قرآن، اور پیر و مرشد کے فیضان کے بیان کے وقت الفاظ و تراکیب میں سوز و گداز، عجز و نیاز، اور ادب و احترام کا غیر معمولی خیال رکھتے ہیں مگر جن سے انہوں نے دکھ اٹھائے ہیں ان میں بھی اکثر کا نام لئے بغیر اشاروں کنایوں کی زبان سے کام لے کر اطمینان سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایک ضخیم کتاب کے باوجود انہیں اپنے قصور کا اعتراف ہے۔

ہر ایک بات زبان پر نہ آسکی باقی
کہیں کہیں سے سنائے ہیں ہم نے افسانے

حافظ بصیر پوری رحمۃ اللہ علیہ کا وصال پُرملال

حافظ بصیر پوری عرصہ دس سال شوگر اور دل کے عارضہ میں مبتلا رہنے کے بعد ۳۱ اگست ۲۰۱۶ء بروز بدھ فجر کی سنتیں ادا کرکے معمول کے مطابق وظائف میں مشغول تھے۔ اچانک روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔ آپ کی عمر تہتر سال ایک ماہ تھی۔

پس ماندگان میں ایک بیوہ، چھ صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرماکر جنت الفردوس میں بلند مقام پر فائز کرے۔

حافظ بصیر پوری کے رخصت ہونے کی وجہ سے بزم علم و عمل اور محفل ادب و دانش سونی ہو کر رہ گئی ہے۔

میرزا مظہر جانانِ جاناں اسی بات کو یوں بیان کرتے ہیں

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حوالہ جات

۱۔ حافظ بصیرپوری، درختِ صحرا، (خودنوشت) غیر مطبوعہ وکمپوز شدہ، مملوکہ حافظ مشہود احمد، ص، ا
۲۔ ایضاً ص، ۲
۳۔ ایضاً، ص، ۱۲
۴۔ ص، ۷۴، ۷۵
۵۔ ایضاً، ص، ۷۷
۶۔ ایضا، ص، ۲۱
۷۔ ایضا، ص، ۲۸
۸۔ مقالہ، حافظ پروفیسر محمد منظور حسین بصیرپوری۔۔احوال وآثار، ص،
۹۔ حافظ منظور حسین بصیرپوری، اس دیار میں، بصیرپور، مکتبہ گہوارۂ ادب، ۲۰۰۷، ص، تعارفِ صاحبِ کتاب۔
۱۰۔ حافظ بصیرپوری، نالۂ شب، بصیرپور، مکتبہ گہوارۂ ادب، ۱۹۹۲ء، ص ۱۰
۱۱۔ حافظ بصیرپوری، پروفیسر، مقالات و تقاریر دامن گلچیں، لاہور، اکبر بک سیلرز زبیدہ سنٹر، ۴۰ اردو بازار، ۲۰۱۶ء، ص، ۹
۱۲۔ حافظ بصیرپوری، درختِ صحرا، (خودنوشت) غیر مطبوعہ وکمپوز شدہ، مملوکہ حافظ مشہود احمد، ص، ۳۱
۱۳۔ ایضاً، ص، ۳۱
۱۴۔ ایضاً، ص، ۳۶، ۳۷
۱۵۔ ایضا، ص، ۷۰
۱۶۔ ایضاً ص، ۵۵
۱۷۔ مقالہ، حافظ پروفیسر محمد منظور حسین بصیرپوری۔۔احوال وآثار، ص،
۱۸۔ حافظ بصیرپوری، درختِ صحرا، (خودنوشت) غیر مطبوعہ وکمپوز شدہ، مملوکہ حافظ مشہود احمد، ص، ۵۴۳
۱۹۔ ایضا، ص، ۱۰۴، ۱۰۵
۲۰۔ ایضاً، ص، ۲۴۷
۲۱۔ ایضاً، ص، ۲۴۸
۲۲۔ ایضاً، ص، ۲۵۵
۲۳۔ ایضاً، ص، ۲۵۵

۲۴۔ ایضاً، ص، ۲۵۶، ۲۵۷

۲۵۔ ایضاً، ص، ۲۵۷

۲۶۔ ایضاً، حافظ بصیر پوری، اس دیار میں، بصیر پور اوکاڑہ، مکتبہ گہوارۂ ادب، ۲۰۰۷، فلیپ۔

۲۷۔ ایضاً، حافظ منظور حسین بصیر پوری، اس دیار میں، بصیر پور، مکتبہ گہوارۂ ادب، ۲۰۰۷، ص، تعارفِ صاحبِ کتاب۔

۲۸۔ ایضاً، حافظ بصیر پوری، پروفیسر، مقالات و تقاریر دامن گلچیں، لاہور، اکبر بک سیلرز زبیدہ سنٹر، ۴۰ اردو بازار، ۲۰۱۶ء، ص، ۹

۲۹۔ ایضاً، حافظ بصیر پوری، نالۂ شب، بصیر پور، مکتبہ گہوارۂ ادب، ۱۹۹۲، ص، ۱۱۷

باب سوم

پروفیسر حافظ بصیرپوری کی شاعری فلسفہ جمالیات کی روشنی میں

اُفقِ شام

حافظ بصیرپوری کی شاعری کی پہلی تصنیف ''اُفقِ شام'' ہے۔ ۲۰۴ صفحات پر مشتمل کتاب میں حمد، نعت، نظم سمیت شاعری کی متعدد اصناف پیش کی گئی ہیں۔ یہ کتاب بھی مکتبہ گہوارہ ادب، بصیرپور ضلع ساہیوال سے شائع کی گئی ہے۔ زیرِ نظر نسخہ میں کہیں پر بھی اشاعت درج نہیں کیا گیا۔

حافظ منظور حسین بصیرپوری المعروف ''حافظ بصیرپوری'' ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں ان کا شمار عصر حاضر کے نامور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی تمام عمر دین و ادب کی خدمت میں گزاری زبان و ادب پر ان کی گرفت سے انکار ممکن نہیں، وہ ایک وسیع المطالعہ اور وسیع القلب انسان تھے۔ نثر کی طرح شاعری میں بھی ان کا اپنا ایک منفرد انداز اور جداگانہ اسلوب ہیں۔ وہ ایک روایت پسند شاعر کے طور پر سامنے آئے ہیں اور انہیں عام طور پر سہل ممتنع کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔

ان کی شاعری میں رومانویت بھی ہے اور غم و سوز بھی ہے ان کی شاعری کا بیشتر حصہ غزلوں پر مبنی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں نظم لکھنے پر بھی اسی قدر عبور ہے جس قدر انہیں نثر اور غزل پر دسترس ہے۔ ان کی شاعری کا زیادہ تر حصے کو قلبی واردات کہا جائے گا۔

ان کے اشعار سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی ان دیکھے محبوب کے لیے کلام رقم کیا گیا ہے۔ ان کی شخصیت اور ان کا کام ایسا ہے کہ وہ کسی محبوب کے لیے تو شاعری نہیں کر سکتے، بطور مبلغ ان کا کام غیر معمولی ہے اور ان کی علمی قابلیت اس بات پر گواہ ہے کہ ایسا شخص کسی سطحی قسم کی شخصیت کا مالک نہیں ہو سکتا اور شاعری کے لیے یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ لازمی طور پر وہ کسی دیکھے یا ان دیکھے محبوب کے لیے ہی کی گئی ہو۔

شاعر معاشرے کا ایک حساس فرد ہوتا ہے اور وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور اپنے معاشرے کی اچھائیاں اور برائیاں اپنے شعر میں بیان کرتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شاعر اپنی شاعری کے ذریعے بھی تبلیغ کا فریضہ انجام دیتا ہے اور اس سے لوگوں کو بیدار کرتا ہے، اردو ادب میں اس کی سب سے بڑی مثال ہمارے قومی شاعر علامہ اقبال ہیں۔ شاعر کے مبلغ ہونے کے بارے میں مولانا الطاف حسین حالی اپنی تالیف مقدمہ شعر و شاعری میں یوں رقم طراز ہیں:

> شعر سے جس طرح نفسانی جذبات کو اشتعالک ہوتی ہے اسی طرح
> روحانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں اور انسان کی روحانی اور پاک خوشیوں

کو اس کے اخلاق کے ساتھ ایسا صریح تعلق ہے جس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ شعر اگرچہ براہِ راست علم اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن ازروئے انصاف اس کو علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔ اسی بناء پر صوفیہ کرام کے ایک جلیل القدر سلسلہ میں سماع کو جس کا جزوِ اعظم اور رکن شعر ہے وسیلۂ قربِ الٰہی اور باعث تصفیۂ نفس و تزکیۂ باطن مانا گیا ہے

یورپ کا ایک محقق کہتا ہے کہ مشاغل دینوی میں انہاک کے سبب جو قومیں سو جاتی ہیں شعر ان کو جگاتا ہے اور ہمارے بچپن کے ان خالص اور پاک جذبات کو جو لوثِ وغرض کے داغ سے منزہ اور مبرا تھے، کو تروتازہ کرتا ہے۔ [1]

حافظ بصیرپوری چونکہ اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی پر بھی بے پناہ عبور رکھتے تھے اور شاعری کا مطالعہ بھی بکثرت تھا اس کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں میر سے لیکر علامہ اقبال شعرا کا کلام زیرِ مطالعہ رہا اور فارسی میں مسعود سعد سلمان لاہوری سے عصر حاضر تک کے تمام نامور شعراء کے کلام سے مستفید ہو چکے تھے اس لیے ان کا شعر کہنا ایک فطری سا عمل تھا۔

وہ دین اسلام کے اعلیٰ پائے کے مبلغ تھے اس لیے ان کے کلام میں نثر کی طرح جمالیاتی عناصر کا پایا جانا ایک لازمی بات ہے کیونکہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو اپنی حقانیت اور اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کے بنیاد پر جمالیات کی اعلیٰ ترین روایت کا مالک اور امین ہے۔

حافظ بصیرپوری کی شاعری میں ہمیں ایسی کئی چیزیں ملیں گی جس کی مثال اس سے قبل شاید چشم دھرنے کم ملاحظہ کی ہوں گی، ان کا یہی انداز انہیں دوسرے ہم عصر شعرا سمیت اساتذہ کی مجلس میں بھی منفرد و ممتاز کرتا ہے، جیسا کہ ان کی غزل ایک مقطع ملاحظہ کیا جائے:

خدائے حافظؔ، دعائے حافظؔ، برائے حافظؔ قبول فرما
ترا کرم دیکھ کر جو نکلی، صدائے حافظؔ قبول فرما [2]

شاعری میں وزن، ردیف، قافیہ وغیرہ کی بندشیں اس کا حسن دوبالا کرتے ہیں، شاعری بنیادی طور تخیل کی بنیاد پر جنم لیتی ہے اور تخیل جتنا عمدہ اور مضبوط ہو گا شاعری میں جمالیات عناصر اسی قدر زیادہ ہوں گے۔ مولانا الطاف حسین حالؔی کا کہنا ہے کہ وزن اور بحر شاعری کے لیے اہم ہے۔ شاعر کا تخیل جتنا بلند ہو گا شعر کا معیار اسی قدر بلند ہو گا۔ "کائنات کے مطالعے سے ان کی مراد جزئیات نگاری اور منظر نگاری ہے۔ یعنی اس طرح منظر کشی کی جائے کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز کو نظرانداز نہ کیا جائے۔ اور دنیا کے وسیع موضوعات کو شعروں میں پرو دیا جائے اور

"تفحص الفاظ" یعنی مناسب بلکہ بہترین الفاظ کا استعمال جو شعر کے ابلاغ کو خوبصورت بنادے۔

شاعری کی مختلف اصناف ہیں۔ غزل پابند نظم، آزاد نظم، نظم معرا وغیرہ۔ غزل اور پابند نظم قافیہ اور ردیف کی پابند ہوتی ہیں۔ اور ردیف اور قافیہ کا مناسب انتخاب شعر کے ابلاغ میں حسن پیدا کرتا ہے، مولانا حالی کہتے ہیں کہ "قافیہ" بھی وزن کی طرح شعر کا حسن بڑھادیتا ہے۔ جس سے کہ اس کا سننا کانوں کو نہایت خوشگوار معلوم ہوتا ہے اور اس کے پڑھنے سے زبان زیادہ لذت پاتی ہے"۔

تخیل کی تعریف میں مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

> سب سے مقدم اور ضروری چیز جو کہ شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے قوت تخیلہ یا تخیل ہے جس کو انگریزی میں (Imagination) کہتے ہیں۔ یہ قوت جس قدر شاعر میں اعلی درجی کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجہ کہ ہوگی اور جس قد یہ ادنی درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری ادنی درجہ کی ہوگی۔ یہ وہ ملکہ ہے جس کو شاعر ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لے کر نکلتا ہے اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر شاعر کی ذات مں یہ ملکہ موجود ہے اور باقی شرطوں میں جو کہ کمالِ شاعری کے لیے ضروری ہیں کچھ کمی ہے تو وہ اس کمی کا تدارک اس ملکہ سے کر سکتا ہے لیکن اگر یہ ملکہ فطری کسی میں موجود نہیں ہے تو اور ضروری شرطوں کا کتنا ہی بڑا مجموعہ اس کے قبضہ میں ہو وہ ہر گز شاعر کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔[۴]

اس میں کوئی شک نہیں کہ محاسنِ شاعری کا یکجا ہونا شاعری کا حسن بھی ہے اور کمال بھی۔ شعر کی جمالیات جن عناصر میں پنہاں ہے ایک شاعر کے لیے ان کا ادراک ضروری ہے۔

حسنِ شعر دو اہم محاسن وزن اور تخیل کا پابند ہے۔ لیکن اس میں ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ تخیل حقیقت سے جتنا قریب ہوگا شعر کا حسن اتنا ہی دیر پا اور جاوداں ہوگا۔ مجازی اشعار بھی بسا اوقات بلند تخیل کی وجہ سے بہت بلند مرتبہ پر فائز کیے جاتے ہیں لیکن ایسا کم ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بجانہ ہوگا کہ حقیقت کو وزن اور خیال کے سانچے میں ڈھالنا ہی حسنِ شعر ہے۔

حافظ بصیر پوری کے ہاں تخیل کی کمی نہیں ہے حافظ کے کلام میں ایک خوبصورتیبہ ہے کہ وہ بہترین تخیل کے ساتھ بات کو بہت ہی آسان اور عام فہم طریقہ سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ردیف، قافیہ بھی ملتا ہے اور کچھ کلام غیر مردف بھی ہے، تلمیح بھی ہے اور تضاد و تکرار بھی تشبیہ کو بھی کام میں لایا گیا ہے اور استعارہ سے بھی شعر کو جمال بخشا ہے۔

کتاب "شامِ افق" کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی ایک حصہ جس میں اردو کلام ہے اور دوسرا حصہ جس کو "بادۂ طہور" کے نام سے شروع کیا گیا ہے اس میں کچھ کلام فارسی کا بھی شامل کیا گیا ہے۔

اردو شاعری میں استفہامیہ انداز کی شاعری بہت کم شعراء کے حصے میں آئی ہے۔ غالب کے بعد اقبال کے یہاں اس کا اہتمام ملتا ہے۔ حافظ بصیر پوری نے اپنی کتاب شامِ افق کی ابتدا "حمد" سے کی ہے اور اس کا آغاز استفہامیہ شعر سے ہی کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں کتاب میں بہت سارا استفہامیہ کلام ملتا ہے، یہ ہنر اور جمال بھی ہے اور غالب و اقبال کی پیروی بھی ہے۔

استفہامیہ انداز

حافظ کے کلام میں ایک انفرادیت اور جمال یہ ہے کہ وہ ایک ہی شعر میں کئی خوبیاں جمع کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل حمد کا شعر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اساتذہ کی پیروی میں شعر استفہامیہ ہونے کے ساتھ ساتھ سہل ممتنع کی بھی عمدہ مثال ہے۔

کس کی ہے زمیں؟ تیری، کس کا ہے زماں؟ تیرا
ہم نے تو جہاں دیکھا قبضہ ہے وہاں تیرا
بلبل کو محبت ہے گل سے تو بھلا کیوں؟
اے حسنِ ازل جلوہ گل سے ہے عیاں تیرا[۴]

کتاب مذکورہ میں استفہامیہ انداز کے شعروں کی کافی تعداد موجود ہے

نہ ایک بار بھی ہوں دو بدو تو کیونکر ہو؟
میں چپتا ہوں کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو؟
گر آبرو کا تجھے پاس تھا کہا ہوتا؟
ملی جا خاک میں اب آبرو تو کیوں کر ہو؟
میں چاہتا ہوں کروں ترکِ عشق اے حافظؔ
نہ آئے باز دلِ عشق خو تو کیوں کر ہو؟[۵]

آنکھوں میں اشک، لب پہ فغاں، دل میں سوزِ غم
یہ کون ہے جو تیرے لیے بے قرار ہے؟[۶]

مایوس کس لیے ہو مرے ہم صفیر آج؟
گر تم کہوں تو زورِ فغاں آزمائیں ہم؟
نا آشنائے مہر سے امیر التفات
اس دل کو دستِ یاس سے کیسے بچائیں ہم
ملنا ترا ہے وہم مسلسل میرے حبیب
کب تک چمکتے چاند کو غزلیں سنائیں ہم۷

ایک تھا درد آشنا چھوڑ کے وہ بھی چل دیا
اب دل آتشیں قبا تیر لگی بجھائے کون؟
عشق میں بے نیازیٔ حسن ہے شرطِ اولیں
حسن اگر ہو باوفا عشق کو آزمائے کون؟۸

کون سیاہی گھول رہا ہےوقت کے بہتے دھارے میں؟
کس نے شب کی مانگ میں اے دل نور کا چھینٹا مارا ہے؟
اڑتے لمحوں کے دامن میں کس کیباد کی خوشبو ہے
پلکوں کی دیوار پہ روشن کس کی آنکھ کا تارا ہے؟۹

استفہامیہ شاعری پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مقامات پر بات محض قلبی واردات کی نہیں کہیں کہیں ہمیں حالات و واقعات سے پریشانی اور تاسف کا تاثر بھی ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کچھ اشعار آج کل کے حالات کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہوں، حافظ بصیرپوری ایک ادیب و مقرر ہی نہیں تھے ان کی زندگی میں ایک جمیل و عمدہ پہلو ان کا ایک باصفا صوفی ہونا بھی ہے، ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے زہد و تقویٰ اور نگاہ باطن شناس سے کچھ ایسا دیکھا یا محسوس کیا ہو کچھ ایسی صورت یا کوئی ایسی علامات ملاحظہ کی ہوں جن کے پیشِ نظر انہوں استفہامیہ انداز میں مندرجہ ذیل اشعار کہے

امید کے تپتے صحرا میں اور یاس کے ریگستانوں میں
ان خون کے بہتے دھاروں کا انجام نہ جانے کیا ہوگا؟
گر میرا نشیمن جل جائے، اے برق تو کوئی بات نہیں
ہاں رنج یہ ہے گلزاروں کا انجام نہ جانے کیا ہوگا؟

آغازِ محبت میں ہم نے دن رات تڑپتے دیکھا ہے
اے عشق تیرے بیماروں کا انجام نہ جانے کیا ہوگا؟۱۰

ایک خیالی اور نادیدہ محبوب کے بارے میں بھی سوالیہ انداز اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مجھ کو مجبور کر نہ یوں ناصح
دل پہ کب اختیار ہے اپنا
آپ چاہت سے خود گریزاں ہیں
ورنہ الفت شعار ہے اپنا
اپنا ملنا بھی کوئی مشکل ہے
گھر سر رہگزار ہے اپنا
یوں کہیں اب تو لوگ ہنستے ہیں
کس کو آج ہے اعتبار ہے اپنا۱۱

اگر سوال قائم کرنا چھوڑ دیا جائے تو زندگی میں انجماد کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ زندگی اس لیے ہے کہ اسے جیا جائے اور زندگی میں ہم جن غلط رویوں کا سامنا کرتے ہیں ان پر سوال بھی قائم کیا جائے۔ سوال سے جہاں انسان گھبراتا ہے وہیں، اس سے بصیرت اور دانش کے سوتے بھی پھوٹتے ہیں۔

استفہامیہ رنگ میں کی جانے والی شاعری میں کبھی شاعر طنز اور تعریض کرتا ہے۔ جس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کائنات کو تجسس اور تشکیک کی روشنی میں دیکھا ہے، جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شاعری پڑھنے یا سننے والے کے ذہنوں میں بھی تجسس کا مادہ پیدا ہوتا ہے، حافظ بصیر پوری کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کریں ان کا جمال و حسن و خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں دنیا میں بسر کی جانے والی زندگی جو ہم محض دنیا کے حصول کے جیتے ہیں اور آخرت کے لیے صرف عمر کے آخری حصے میں جا کر سوچتے ہیں:

لیے چلتا ہوں اے دل تجھ کو بزم یار میں لیکن
نہ جانا چھوڑ کر پھر مجھ کو سوئے دلربا سمجھے؟
گزاری زندگی حافظؔ بتِ کافر کی چاہت میں
لٹا کر تم متاعِ دیں جو سمجھے بھی تو کیا سمجھے۱۲

ہمہ وقت حافظ ایک معلم، مصنف، مبلغ، شاعر، اور باصفا صوفی ہیں اور عشق حقیقی سے سربلند پھرتے ہیں

غزل ہو یا نظم، انشائیہ ہو یا پھر نثر حافظ صاحب حرف و حکایت پر بھرپور دسترس ہے وہ صرف ایک لفظ لاتے ہیں اور شعر کا مطلب و مزاج ہی بدل جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر میں استفہام، جستجو، خبر اور اطلاع کو ایسے جمع کیا ہے کہ طبیعت پر ایک نشاط طاری ہوتا ہے، اس شعر کا جمال یہ بھی ہے کہ اس کو عشق حقیقی اور مجازی دونوں میں دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

حافظؔ تلاشِ یار میں پھرتے ہو دور دور
تو بے خبر ہے؟ ارے وہ یہیں تو ہیں۔۱۳

سہل ممتنع

حافظ بصیرپوری کے ہاں ہمیں بہت سے جمالیاتی عناصر اور شاعری کی بہت سی صنعتیں ملتی ہیں، ان کے اسلوب کی ایک خصوصیت اور خوبصورتی یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ مشکل الفاظ کا استعمال نہیں کرتے شاعری ہو یا نثر انہیں اپنی بات کہنے کا ہنر بخوبی آتا ہے ایسی بہت سی باتیں جو دوسرے لوگوں نے مشکل یا مختلف انداز میں بیان کی ہیں بصیرپوری صاحب ان کو بہت ہی آسان الفاظ اور سہل پیرائے میں کم از کم الفاظ میں بھی بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ غزل ہو یا نظم حافظ صاحب کسی بھی صنف میں بہت زیادہ مرصع گفتگو نہیں کرتے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ حافظ صاحب نے کتاب کا آغاز ہی سہل ممتنع سے کیا ہے مثال کے طور پر حمد کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہاں چشم بصیرت ہی سمجھے گی حقیقت کو
ہر شے میں نشاں دیکھے بے نام و نشاں تیرا
بس اک یہ تمنا ہے جب وقت اجل آئے
ذاکر ہو زباں میری مذکور بیاں تیرا۱۴

زندگی میں انسان کو دو ہی قسم کے حالات پیش آتے ہیں اول اچھے اور دوسرے برے یا آسان اور مشکل کہہ لیں لوگوں کے معاملات میں یا کوئی آپ کو یاد رکھتا ہے یا پھر بھلا دیتا ہے ان معاملات کو دیگر شعرا نے بھی یقیناً بیان کیا ہوگا لیکن جس قدر آسان اور عام فہم اور عام روزمرہ کی زبان میں نثر کی طرح شعر میں حافظ بصیرپوری نے بیان کیا ہے اس کا کیا ہی کہنا، ملاحظہ ہو:

میں نہ کہتا تھا تم بھلا دو گے
دیکھا! آخر بھلا دیا تم نے۱۵

سادگی میں جو حسن ہے اس کا پرستار زمانہ ہوتا ہے، کہا جاتا ہے کہ زندگی کا اصل حسن و جمال سادگی میں ہی ہے۔ محبت میں پیام و پیامبر ہی سب کچھ ہوتا ہے اور ایک صاحب دل کے لیے اس پیام کا دستیاب نہ ہونا بھی ایک مصیبت ہوتی ہے، اس پیامِ یار کی عدم دستیابی کا ذکر حافظ بصیر پوری نہایت سہل انداز میں یوں کرتے ہیں:

مژدۂ زیست قلب نے پایا نہیں ہنوز
یعنی پیام یار کا آیا نہیں ہنوز
اس گردشِ فلک نے مرا دل مٹا دیا
دل سے خیال یار مٹایا نہیں ہنوز[۱۶]

جب ہم سے کوئی روٹھ جاتا ہے تو اس کو منانے کے لیے بہت سے جتن کیے جاتے ہیں کئی مراحل اور کئی مشکلات سے گزرتے ہیں کس کس طرح سے مضمون باندھے جاتے ہیں مگر یہاں تو بات بہت ہی سادگی اور عام سے لفظوں کو جوڑ کر روزمرہ کے اندازِ گفتگو میں ہوئی ہے یہاں طبیعت کی اداسی کا بیان بھی بہت ہی سادہ سے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جس سے اہلِ دل اور اہل ظرف تشنگی کو محسوس کر سکتے ہیں، طرزِ بیان کا یہ حسن و جمال ملاحظہ ہو:

ساقی ذرا نگاہِ عنایت کی مستیاں
ساغر میں دے ملا کہ طبیعت اداس ہے
حافظؔ اسے کہیں کہ تری بے رخی کی خیر
اے دوست! مان جا کہ طبیعت اداس[۱۷]

شاد باد اے دل کہ وہ جانِ بہار آہی گیا
مدتوں کی بے قراری کو قرار آہی گیا[۱۸]

کتاب مذکورہ میں شاعر نے جا بجا اپنے محبوب کی بے رخی کو بیان کیا ہے اور اس کے لیے کوئی اشارہ کنایہ، تشبیہ یا استعارہ استعمال نہیں کیا بلکہ اپنی شکایت، یا اپنا گلہ شکوہ سادہ الفاظ میں بیان کر دیا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہیں:

تم جو چاہو تو آزما دیکھو
ہم کسی سے دغا نہیں کرتے
ہم کوئی مدعا نہیں رکھتے
اس لیے ہم دعا نہیں کرتے
یہ الگ بات ہے کہ ہیں رسوا
ہم کسی کا برا نہیں کرتے
کوئی صیاد سے کہے حافظؔ
اتنے صدمے دیا نہیں کرتے ۱۹

شاعری اصل میں ایک خبر ہوتی ہے جس سے ہمیں کچھ حالات کا علم ہوتا ہے اور کچھ قلبی وارداتوں کچھ جذبوں اور کچھ خیالات وغیرہ کا ان سب معلومات کا حصول کبھی تو ہمیں تشبیہ و استعارہ سے ہوتا ہے اور کبھی براہ راست کبھی بات کو ڈھکے چھپے الفاظ میں کیا جاتا ہے اور کبھی عام فہم الفاظ میں جیسا کہ سہل ممتنع کا شعر

جب محبت ہے سعی لاحاصل
اس کا حاصل ہے جان سے جانا
حسنِ ظاہر کو جب نہیں ہے بقا
پھر عبث ہے اسی پہ اترانا ۲۰

اسی طرح حافظ بصیرپوری اپنے باتوں اور قلبی وارداتوں کو کبھی غزل میں بیان کرتے ہیں اور کبھی بصورت نظم لاتے ہیں جیسے ''فریبِ آرزو'' کے عنوان سے لکھی جانے والے نظم کا ایک خوبصورت بند

تجھ میں آشوبِ غم کا نہ تھا حوصلہ
میرے دل میں بھی تابِ جدائی نہ تھی
کیا خبر تھی کہ تم یوں بدل جاؤ گے
جیسے مجھ سے کبھی آشنائی نہ تھی ۲۱
آپ مل جائیں تو نوازش ہے
آج آئیں تو مہربانی ہے ۲۲

محبت کرنے والے کو اگر جواب میں محبت ملتی ہے تو اس کو خوش قسمتی کہا جاتا ہے اور اگر اسے جواب میں جانو کے جواب ہو جائے تو یہ ایک مشکل صورت ہوتی ہے شاعر کیطرف سے جذبوں کا اظہار کرنا اور کسی طرح کی مشکل کہنا بھی ایک فن ہوتا ہے اور اس سے بڑا فن مشکل کو آسانی کے ساتھ کہنا ہے۔ حافظ بصیر پوری کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ بڑی بڑی باتوں کو بہت ہی سادہ اور عام فہم الفاظ میں اس طرح کر جاتے ہیں جیسے یہ کوئی بہت ہے سطحی بات ہو اور اس سے کوئی مسئلہ در پیش نہیں، سہل ممتنع کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں

کوئی پابندِ وفا ہو یہ ضروری تو نہیں
وہ بھی چاہے جسے چاہو یہ ضرور تو نہیں
ان کی آنکھوں سے ملے تمہیں پیار کا پیغام ملے
میری بے تاب نگاہو یہ ضروری تو نہیں۲۳

ہم نہیں تھے تو عید آتی تھی
ہم نہ ہوں گے تو عید آئے گی۲۴

حافظ صاحب کے ہاں ایک جذبہ یا ایک شوق بہت جگہ ملتا ہے اور یہ کسی سے ملنے کی خواہش ہے، اس خواہش کا اظہار مختلف الفاظ اور طریقہ کار سے کیا گیا ہے، اس سے قبل بھی اشعار میں انہوں نے کسی کے ملنے کی خواہش کی اور مندرجہ ذیل اشعار بھی کچھ اسی شوق کا اعادہ کرتے ملتے ہیں

آپ چاہت سے خود گریزاں ہیں
ورنہ الفت شعار ہے اپنا
اپنا ملنا بھی کوئی مشکل ہے
گھر سرِ رہگزار ہے اپنا
کل تک زندگی رہے نہ رہے
موت کا انتظار ہے اپنا
یوں کہیں اب تو لوگ ہنستے ہیں
کس کو آج اعتبار ہے اپنا۲۵

تم دعاؤں کو بھی دغا سمجھے
ہم سزاؤں کو بھی عطا سمجھے۲۶

اسی طرح ان کی شاعری میں ہمیں ایک اور خوبصورت صنعت بھی ملتی ہے جس کو صنعت تضاد کہا جاتا ہے صنعت تضاد کے اشعار ملاحظہ ہوں

اے طلبگارِ بقا ناپائیداروں سے نہ کھیل
کہکشاں سے، چاند سے، سورج سے تاروں سے نہ کھیل۲۷

کتاب "اُفقِ شام" میں پاسبان وطن کے نام سے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے ایک نظم پیش ہوئی ہے ویسے تو پوری نظم ہی مرقع جمال ہے اس نظم کا پہلا بند ملاحظہ کریں کہ ہی خوبصورت جذبے کے ساتھ لفظوں سے جیسے حسن اور ترنم بکھیرا گیا ہے، بند کی آخری لائن میں زمین اور آسمان کو کس طرح بیان کیا ہے کہ طبیعت پر ایک نشہ اک نشاط ساطاری ہو جاتا ہے، انہوں نے اپنے وطن کے پاسبانوں کو کس مرتبہ پر فائز کیا ہے ملاحظہ ہو:

اے وقارِ ملک و ملت، اے وطن کے پاسباں
تیری صورت سے ٹپکتا ہے جلالِ خسرواں
تیری ہیبت سے ہے لرزاں لشکرِ ہندوستاں
جسمِ باطل پر رہیں گے تیری ضربوں کے نشاں
تیرے قدموں کی زمیں کو چومتا ہے آسماں۲۸

چھوٹی بحر میں لکھی جانے والی مترنم نظموں کو جب تضاد بیان ہوتا ہے تو اس کی خوبصورتی کو ایک نیا جمال میسر آتا ہے

تو حسن کا غرور ہے میں عشق کا نیاز
میں تلخیوں کا گیت ہوں تو راحتوں کا ساز
تو آتشِ فراق ہے میں ہجر کا گداز
میں دردِ لا دوا ہوں، مداوا کہوں تجھے

میں آرزوئے موت ہوں تو زیست کی امنگ
میں اک بریدہ شاخ تو دنیائے آب و رنگ
اے نازنین، حبیب دل آرا و شوخ و شنگ
ہاں سازِ انبساط کا نغمہ کہوں تجھے۲۹

لمبی بحر میں بھی اشعار ملتے ہیں جس سے شاعر کے کمال فن اور فن پر اس کی دسترس کا ثبوت ملتا ہے، لمبی بحر میں متضاد لفظوں کو جوڑنا اور اس سے پھر ایک خبر کا سامنے لانا بھی ایک عمدہ ہنر ہے جو کسی کہنہ مشق شاعر کے ہاں ہی پایا جا سکتا ہے ایک مثال ملاحظہ ہو

جفا اب وفا ہے، دغا اب صفا ہے، سزا اب جزا ہے دعا اب خطا ہے
بھلا تو بتا یہ جو حالت بپا ہے، یہ ظلمت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے؟۳۰

جس طرف دیکھئے ہے مسرت عیاں، رنج و کلفت کا اب مٹ گیا ہے نشاں
ایک تسکین قلب و نظر جانِ جاں، رخ سے پردہ ہٹا کر دکھانے لگا۳۱

مجھ کو فنا تجھے دوام، ساقی نہ چل سکے گا کام
دے کے مئے ازل کا جام، مجھ کو بھی لازوال کرے۳۲

میں ابد تلک رہوں گا تری واپسی کا طالب
میں ازل سے دے رہا ہوں تجھے درد زا صدائیں۳۳

ہے غمزہ و دل میں بھی عجب چشمک پنہاں
کرتا ہے یہ انکار وہ اصرار کرے ہے۳۴

صنعت تکرار

شاعری کا حسن و جمال تکرار لفظی بھی اور ہمارے شعرا اس صنعت کا استعمال بھی کرتے آئے ہیں حافظ بصیر پوری کے ہاں بھی صنعت تکرار کا استعمال ملتا ہے جس نے نہ صرف معنی ابھر کا سامنے آتے ہیں بلکہ روانی اور تسلسل نے بھی خوب لطیف احساس پیدا کیا ہے

دلدار و دلفریب و دل آرام و دلربا
خوش خو و خوش خرام و خوش انداز و خوش ادا
دل چاہتا ہے کہ دوں محبت کا دیوتا
میں کشتۂ وفا ہوں مسیحا کہوں تجھے۳۵

جو ہاتھ پھیلائے اہلِ حاجت، خدایا در پر ترے ہیں آئے
کوئی بھی ان سے نہ اہل حاجت بغیر حاجت روائی جائے
خدائے حافظ، دعائے حافظ، برائے حافظ، قبول فرما
ترا کرم دیکھ کر جو نکلی، صدائے حافظ قبول فرما۳۶

الوداع، کالج کے اے دلکش نظارو! الوداع
اے خزاں سے بے خطر رنگیں بہارو! الوداع
دوستو اور ہمدمو! غم خوار یارو! الوداع
اے دلِ فرقت رسیدہ کے سہارو! الوداع۳۷

یہ زندگی کا ررواں
رواں دواں رواں دواں
اے یہ مصلحت نہیں
کہ تم کہیں ہو میں کہیں۳۸

اے سر زمینِ محترم
قسم مجھے تری قسم
مرے خدا کا ہے کرم
کہ دم بہ دم قدم قدم
مرے وطن کا کارواں
ہوا ہے اب رواں دواں
وہ منزلیں جو تھیں نہاں
ہیں اب قریب بے گماں۳۹

کھلا ہے شیر زادۂ تحمل
ہے دامنِ صبر پارا پارا
ہے اجڑا اجڑا دیار دل کا
بساؤ آکر اسے خدارا
تمہیں خبر ہے کہ پھر رہا ہوں
میں دشت خلوت میں مارا مارا ۴۰

تلمیح

شاعری کا ایک حسن و جمال تلمیحات کا استعمال بھی ہے ہر شاعر کے ہاں ہمیں تلمیحات کا استعمال ملتا ہے لیکن بعض اوقات یہ سب کچھ محض ردیف و قافیہ کی غرض سے کیا جاتا ہے لیکن مصنف موصوف نے کسی جگہ اس قسم کا کوئی عمل نہیں کیا، جناب آدم علیہ السلام کے جنت سے نکالے جانے کے واقعہ کو مندرجہ ذیل شعر میں کس خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے

کرتا ہوں میں اقلیم وفا تجھ پہ تصدق
جنت تو مرے باپ کی ٹھکرائی ہوئی ہے ۴۱

"پاسبانِ وطن کے نام" کے عنوان سے لکھی گئی ایک نظم میں اپنے سپاہیوں کے حوصلے بلند کرنے اور ان کے جذبات ابھارنے کی غرض سے جو اشعار قلم بند کئے ہیں وہ نہ صرف فنی اعتبار سے معیاری ہیں بلکہ تخیل و خیال کے لحاظ سے بھی اپنی مثال کم رکھتے ہیں اس نظم کے ایک بند میں جس طرح سے ملائک و حور کو باندھا ہے اس نے امنگوں اور جذبوں کو ایک نئی جہت اور روشنی و جذبہ عطا کیا ہے:

تیری شانِ پیش قدمی پر ملائک ہیں نثار
حور کے چہرے کا غازہ، تیری راہوں کا غبار
تجھ پہ قرباں چشم پرنم، قلبِ مضطر، جانِ زار
تیرے قدموں پر نچھاور میرے حصے کی بہار ۴۲

محبت میں ناکامی اور ناکامی کا درد اس مضمون کو دیگر شعرا نے بھی بیان کیا ہے اور اس میں طرح طرح سے غم واندوہ بیان کیا ہے مگر جیسے یہاں حافظ بصیر پوری نے اس مضمون کو بیان کیا ہے اور اس کو منصور حلاج کے واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے یہ بہت ہی عمدہ اور خوبصورت طرز بیان ہے:

پھر کوئی جلوہ گر ہوا دل میں
پھر وہ منصور سوئے دار آیا۴۳

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت خضر کو طویل ترین عمر عطا کی گئی ہے اور وہ پانیوں پر مامور ہوتے ہیں اس کے ساتھ بہت سی کہانیاں وابستہ ہیں جن میں سے ایک حضرت خضر کا طویل عرصہ سے زندہ ہونا ہے۔ اس بات کو شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

قیدِ حیات کے سوا پی کے خضر کو کیا ملا؟
آبِ حیات کی طرف دستِ طلب بڑھائے کون؟۴۴

قرآن نے ظالموں کی بربادی کا عندیہ دیا ہے اس کو شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

ظالموں کو فلاح نہیں ہو گی
ہم نے ام الکتاب میں دیکھا۴۵

جناب حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے اللہ رب العزت کو دیکھنے کی خواہش ظاہر اور اللہ رب العزت نے فرمایا کہ اے موسیٰ تم مجھے نہیں دیکھ پاؤ گے اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے اور اللہ نے اپنی تجلی پیش کی جس سے کوہ طور جل کر خاکستر ہو گیا، اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر لکھتے ہیں:

کیا تقاضا تھا اے کلیم! ترا
پھر ملا کیا جواب میں دیکھا؟
کس کو تابِ تجلی رخ دوست
جس نے دیکھا نقاب میں دیکھا۴۶

شاعر وسیع المطالعہ ہونے کا ثبوت بھی ہمیں ان کے کلام میں ملتا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے بازار مصر میں فروخت کے واقعہ کو بھی ایک جگہ قلم بند کیا گیا ہے:

جدائی خواب کو شرمندۂ تعبیر کرتی ہے
جدائی مصر کے بازار میں تشہیر کرتی ہے

جدائی بے گنہ کو موردِ تعزیر کرتی ہے
جدائی پدر کو آگاہِ فصلِ عیر کرتی ہے۴۷

حضرت خضر کا ذکر ایک اور جگہ یوں کیا ہے:

دو چار گام مختصر
چلا بصورتِ خضر۴۸

حافظ بصیر پوری کے شاعری میں مندرجہ بالا اصناف کے علاوہ ایک صنف سخن "غیر مردف" غزل کی بھی ملتی ہے یہ الگ سے ایک ہنر اور خوبصورتی ہے، بعض احباب کا خیال ہے کہ ابتدائی دور کی شاعری میں ایسا کلام بھی موزوں ہو جاتا ہے جس میں ردیف کا اہتمام نہیں ملتا لیکن کچھ کا خیال ہے کہ غیر مردف کلام بھی ایک ہنر ہے اور کلام کے اعتبار سے کبھی ردیف کی ضرورت نہیں ہوتی۔

غیر مردف غزلوں کی مثال ہمیں دوسرے شعرا کے ہاں بھی ملتی ہے، ماضی قریب میں اردو کے سب سے بڑے شاعر فیض احمد فیض کے ہاں بھی اس روایت کی مثال موجود ہے، ان کی ایک غیر مردف غزل ملاحظہ ہو:

تُجھے پکارا ہے بے ارادہ
جو دل دُکھا ہے بہت زیادہ
نَدیم ہو تیرا حرفِ شیریں
تو رنگ پر آئے رنگِ بادہ
عَطا کرو اِک ادائے دیریں
تو اشک سے تر کریں لبادہ
نہ جانے کس دن سے منتظر ہے
دلِ سرِ رہگزر فتادہ
کہ ایک دن پھر نظر میں آئے
وہ بام روشن، وہ در کشادہ
وہ آئے پُرسش کو، پھر سجائے
قبائے رنگیں، ادائے سادہ۴۹

ذیل میں دی جانے والی چند مثالیں غیر مردف غزل کی ہیں، فنی اعتبار سے بعض جگہ پر کلام غیر معروف بحروں میں بھی ملتا ہے ان میں سے ایک غزل ملاحظہ فرمائیں:

وہی میں ہوں وہی حرماں، وہی احساسِ تنہائی
مجھے غم سازگار آیا، مجھے راحت نہ راس آئی
میں انجام محبت سوچتا ہوں کانپ اٹھتا ہوں
کہ میں ہوں گا تماشا اور جہاں ہوگا تماشائی
زمانہ ہوگیا دیکھے ہوئے تجھ کو مگر اب بھی
نفس سوزاں، نظر ویراں، دلِ نالاں تمنائی
مجھے رسوا کیا غم خوار نے اغیار کے آگے
وفاؤں کا صلہ پایا، مروت کی جزا پائی
چلو حافظ نکل جائیں شبستانِ محبت سے
کہ اس گھر میں نہیں کچھ بھی بجز سامانِ رسوائی ۵۰

اسی طرح ایک اور غزل دیکھیں:

ہوئے سرد ارماں سلگتے سلگتے، مٹی آرزوئیں مچلتے مچلتے
چلی تیرہ و تار آندھی الم کی بجھا زندگی کا دیا جلتے جلتے
ترا منتظر جب یہ قلبِ حزیں تھا، غم و رنج و ہجراں مراہم نشیں تھا
تنِ زار تھا، تختۂ آتشیں تھا، کٹی رات کروٹ بدلتے بدلتے
ذرا قلب حافظ حفاظت سے رکھنا، میریہ امانت دیانت سے رکھنا
میں ڈرتا ہوں اے بے خبر پھینک دوگے کہیں تم مرا دل مسلتے مسلتے ۵۱

ایک جگہ حافظ صاحب یوں لکھتے ہیں:

کھلا ہے شیرازۂ تحمل
ہے دامن صبر پارا پارا
قسم مجھے آہِ نارسا کی
نہیں ہے ضبطِ فغاں کا یارا

تمہیں وہ دن یاد ہوں گے جبکہ
تمہیں تھا میں زندگی سے پیارا۵۲

دل کی حسرت پوری ہوتی اس کے بھی ارمان نکلتے
کاش وہ رکھتے پاس وفا کا مل کر جاتے چلتے چلتے
وصل کی خوشیاں دم بھر پائیں، ہجر کی کالی راتیں آئیں
دو گھڑیوں کے پیار کے بدلے عمر کٹے گی جلتے جلتے
حافظ جب تک ان کا کرم تھا رنج و محن تھے نہ درد و الم تھا
وہ نہ بدلتے تو کیا غم تھا دنیا والے لاکھ بدلتے۵۳

تشبیہ

عام فکری شاعری کی نسبت رومانوی شاعری کی عمارت کا ایک بنیادی ستون تشبیہ ہے اور شاعری کا حسن تشبیہات سے دو چند ہو جاتا ہے۔ میرؔ ہوں یا غالبؔ، آتشؔ ہوں یا ذوقؔ، فیضؔ ہوں یا علامہ اقبال، تشبیہ کی روایت ہمیں ہر ایک شاعر کے ہاں ملتی ہے۔ حافظ بصیر پوری نے بھی اپنے کلام میں عمدہ تشبیہات کے ساتھ کلام پیش کیا ہے:

آجیوں دل میں فروزاں ہے تری یاد کا دیپ
سطح تالاب پہ خاموش کنول ہو جیسے
چشم پرنم میں ہے اس طرح ترا عکس
آبِ جمنا میں کھڑا تاج محل ہو جیسے۵۴

پاسبانانِ چمن کو میری جانب سے سلام
ہم نشینانِ چمن کو میری جانب سے سلام
عندلیبانِ چمن کو میری جانب سے سلام
اس گلستانِ ادب کے گلعذارو! الوداع۵۵

پہا

ں کے ذرے فلک کی رفعت پہ مثلِ حور ضوفشاں رہیں گے
جنہوں نے کسبِ ضیا کیا وہ چراغِ بزمِ جہاں رہیں گے
یہاں سے اربابِ علم کے کارواں ہمیشہ رواں رہیں گے
یہ مدرسۂ فریدیہ ہے کہ علم و عرفاں کا کارخانہ۵۶

سیاقۃ الاعداد

دیگر صنعتوں کے طرح ایک خوبصورت صنعت سیاقۃ الاعداد کی مثال بھی کتاب میں موجود ہے:

مونسو، ہمدمو، دوستو، ساتھیو
اک مسافر کی دو چار باتیں سنو۵۷

حافظ بصیر پوری اعلی پائے کے شاعر تھے انہوں نے غزل کے ساتھ نظم میں بھی طبع آزمائی کی لمبی بحروں کے ساتھ چھوٹی اور نہایت مترنم بحروں میں اشعار اور نظمیں کہیں، انہوں نے مختلف اصناف مثلاً حمد و نعت کے علاوہ مختلف تہواروں پر بھی نظمیں اور غزلیں لکھیں، حمد و نعت ایک اعلی پائے کا جمالیاتی کلام ہوتا ہے کیونکہ اس میں خدا اور محبوب خدا کے اوصاف حمیدہ بیان کئے جاتے ہیں اس لیے یہ سراسر مرقع جمال ہوتا ہے اس میں جمالیات کے تمام ہی عناصر کسی نہ کسی صورت موجود ہوتے ہیں، شاعر نے اپنی کتاب کا آغاز مندرجہ ذیل حمد سے ہی کیا ہے۔ یہاں حمد کے کچھ اشعار نقل کیے گئے ہیں۔

حمد

کس کی ہے زمیں؟ تیری، کس کا ہے زماں؟ تیرا
ہم نے تو جہاں دیکھا قبضہ ہے وہاں تیرا
ہے کارگہِ دوراں، بین یدی الرحمٰن
ہر جاں پہ تسلط ہے، اے خالقِ جاں تیرا
آفاق میں ظاہر ہیں آیت جہانداری
آیات بتاتی ہیں، سارا جہاں تیرا
اعلان ہے فی انفس پھر دعویٰ لاتدرك
سمجھے کوئی محرم بھید سر نہاں تیرا
بس ایک یہ تمنا ہے جب وقت اجل آئے
ذاکر ہو زباں میری مذکور بیاں تیرا
مانا کہ نہیں کچھ بھی، ہے زمزمہ خواں تیرا۵۸

حمد کے بعد کتاب میں آقائے دو جہاں ﷺ کے لیے دو نعت شریف اور جناب سرورِ دو عالم علی نبی ﷺ کے یوم پیدائش بارہ ربیع الاول پر انتہائی پر جمال اور لطیف و عمدہ کلام پیش کیا گیا ہے:

لائق ہے اسی شاہ کو کونین کی شاہی!
جو خلق کا مطلوب ہے، محبوبِ الٰہی
تھا جس کی رسالت کا بھی اقرار بتوں کو
دی جس کی صداقت کی درختوں نے گواہی
وہ حامد و محمود، حمود اور محمد
کی جس نے خداوند کی تحمید کماھی
ہے عرش بریں جس شہِ لولاک کی مسند
مہمانِ خدا، جادۂ قوسین کا راہی
حافظؔ کو ذرا دامنِ رحمت میں چھپالو
پکڑیں نہ اسے حشر میں دوزخ کے سپاہی۵۹

طورِ حریم حسن کی خاطر نسیم جا
لے کے پیام سوئے رسولِ کریم جا
اس روضہ پر کہ جو ہے بہشتِ نعیم جا
تو جا بواسطۂ الف، لام، میم جا
کہنا کہ اک فقیر پریشاں و بے قرار
با چشمِ اشکبار، بادامانِ تار تار
روتا تھا زار زار کھڑا وقتِ نیم شب
کہتا تھا اے شہِ عجم، شاہنشہِ عرب
تخلیق کائنات کے باعث حبیب رب
تجھ پر نثار جاؤں مرے ہاشمی نسب
اس وقت جب کسی کا سہارا نہیں مجھے
یوں تجھ سے دور رہنا گوارا نہیں مجھے

اک بار روضہ دیکھ لوں جالی کو چوم لوں
پھر بختِ سازگار پہ کچھ دیر جھوم لوں۶۰

آقائے دو جہاں ﷺ کے یوم پیدائش پر بھی بہت ہی عمدہ اشعار پیش کئے گئے ہیں کو پڑھتے ہی طبیعت جھوم جھوم اٹھتی ہے اور ذہن و قلب سرشار و شادماں ہو جاتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں

کس کی آمد کا یہ روز ہے ہم نشیں دلربا کون تشریف لانے لگا
رقص کرنے لگے ہیں مکینِ حرم خود حرم کو بھی ہے وجد آنے لگا
اک فہیم آگیا، ایک علیم آگیا، اک رحیم اور دریتیم آگیا
جس کے صدقے میں دریا بفرطِ سخا موتیوں کے خزانے لٹانے لگا
جس طرف دیکھئے ہے مسرت عیاں، رنج و کلفت کا اب مٹ گیا ہے نشاں
ایک تسکینِ قلب و نظر جانِ جاں، رخ سے پردہ ہٹا کر دکھانے لگا
اے رسولِ خدا، مالکِ دو سرا، صدقہ اپنی عطا کا نظر کر ذرا
اب ترا امتی حافظؔ بے نوا، نغمۂ نعت سے دل لبھانے لگا۶۱

شہید کربلا جناب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے بھی حافظ صاحب کا قلم رکتا نہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ الفاظ لکھے نہیں جا رہے گویا اتر رہے ہیں یا ان کے قلب پر القا کئے جا رہے ہیں

دل میں ہے آج کس کا ورد؟ لب پہ ہے آج کس کی بات؟
جس پہ نثار جان و دل، نازاں ہے جس پہ حق کی ذات
ملکِ وفا کا تاجدار، توسنِ عشق کا سوار
شہرِ بقا کا شہریار، شاہ جہانِ ممکنات
مظہرِ شانِ کبریا، راکبِ دوشِ مصطفیٰ
رونقِ باغِ مرتضیٰ، جانِ بہارِ کائنات
صبحِ ازل سے ہے ملا جس کی نگاہ سے فروغ
گلشنِ فاطمہؓ کے گل، لختِ دلِ شہِ رسُل
تجھ پہ ہزار ہا درود، تجھ پہ کروڑہا صلوات

حافظِ امت رسول، صدقۂ عصمت بتول
اہل حرم کے حال پر ایک نگاہِ التفات۶۲

ان عظیم ہستیوں کے ذکر خیر کے علاوہ حافظ بصیر پوریؒ نے علامہ اقبال، قائد اعظم محمد علی جناح کو بھی نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے، نعت رسول مقبول ﷺ کے بعد مصنف نے سب سے پہلے جناب حضرت قائد اعظم علیہ الرحمۃ کو سلام پیش کیا ہے شخصیات میں قائد کے بعد علامہ اقبال کے لیے اشعار ہدیہ کئے گئے ہیں:

قائد اعظم تری آمد تھی احسانِ خدا
تجھ سے واضح ہو گیا سعی و عمل کا مدعا
بایقین و بامروت، باخلوص و باصفا
تیرے آنے سے ہوا قلب پریشاں کو سکوں
تو سراپا عزم و استقلال کی تصویر تھا
تو مجسم آدمیت کی حسیں تفسیر تھا
تو مسلمانوں کے خوابوں کی نئی تعبیر تھا
تو مدبر، مجاہد، حاملِ شمشیر تھا
جس نے جاری کر دیا آکر رگِ باطل سے خوں۶۳

ملکِ پاکستان کے معمار کی باتیں کریں
رہنمائے ملتِ خوددار کی باتیں کریں
ملتِ بیضا کو جس نے درسِ آزادی دیا
قوم کے اس مونس و غمخوار کی باتیں کریں
آؤ میدانِ عمل میں سعیٔ پیہم کے لیے
چھوڑ کر گفتار اب کردار کی باتیں کریں
مدعائے شاعری ہے مدحِ قائد دوستو!
کیا ضرورت ہے کہ زلف یار کی باتیں کریں۶۴

اپنے اکابرین سے محبت اور احسان مندی کا طریق و اسلوب ہے کہ لوگ اپنے محب و عزیزان قوم و ملت

کے لیے نیک جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور یہ روایت ہر ہر ملک میں پائی جاتی ہے، حافظ بصیر پوری نے جہاں حضرت قائد کو دو جگہ نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ ان کے یوم پیدائش کو بھی یاد رکھا اور اس پر بھی اشعار کی صورت قائد کو ہدیہ تبریک پیش کیا، اس کتاب میں ایک دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ مصنف موصوف نے رسول کریم ﷺ کے لیے بھی دو نعت پیش کیں اور ان کے یوم پیدائش پر بھی نظم لکھی۔ ان کے بعد جناب قائد کے لیے بھی دو جگہ کلام پیش کیا اور ان کے یوم پیدائش پر بھی نظم پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب مصنف موصوف حضرت قائد علیہ الرحمۃ کے ساتھ کس درجہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ یوم قائد پر نظم سے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

غلاموں کی دعاؤں کا ہوا ہے اب اثر پیدا
پھلا نخل تمنا ہوگئے برگ و ثمر پیدا
وہ جس کے دم سے رونق ہے گلستانِ قیادت میں
وقارِ حسنِ گلشن، قائدِ کامل نظر پیدا
وہ یکتا پاسباں اپنا، یگانہ مہرباں اپنا
وہ میر کارواں اپنا، ہوا ہے راہبر پیدا
زمانے میں بہت سے لوگ اب بھی نام پائیں گے
مگر ایسا نہ ہوگا پھر کوئی اب نامور پیدا۶۵

حافظ صاحب نے دیگر شخصیات کے ساتھ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کو یاد کرتے ہوئے ان کے لیے ''حکیم الامت کی یاد میں'' کے عنوان سے بیس اشعار پر مشتمل نظم پیش کی ہے جو اس بات کی مظہر ہے کہ موصوف جناب حکیم الامت سے کس درجہ محبت و عقیدت رکھتے تھے۔

اے محرمِ حقیقت اے شاعرِ یگانہ
دل میں ہے یاد تیری، لب پر ترا افسانہ
کافی گزر چکا ہے تجھ کو گئے زمانہ
کانوں میں گونجتا ہے پھر بھی ترا ترانہ
جب دودِ آہِ دل سے تاریک تھیں فضائیں
اور چل رہی تھیں ہر سو مسموم سی ہوائیں

مغرب سے اٹھ رہی تھیں تہذیب کی گھٹائیں
تھا ننگِ آدمیت وہ دورِ آمرانہ
اقبال لوٹ آوا تم کو قسم وفا کی
لو اب بھلا بھی دو گر ہم نے کوئی خطا کی
پھر آج ہے ضرورت ہم کو تری نوا کی
آکر بلند کرو پھر نالۂ شبانہ
حافظؔ یہ مانتا ہے تو اپنا رہنما تھا
اک پیکرِ عمل تھا اک مرکز وفا تھا
کویں جا بسے لحد میں تم نے تو خود کہا تھا
شاہیں نہیں بناتا غاروں میں آشیانہ۶۶

حافظ بصیر پوریؒ نے اپنی شاعری میں قومی اور مذہبی تہواروں کی اہمیت اور افادیت کو اجاگر کرنے کے لیے نظمیں پیش کی ہیں تاکہ لوگوں کو ان دنوں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے اور ان ایام کی حقیقت کو سمجھ کر اپنا اپنا فرض بطریق احسن ادا کرنے کے قابل ہو سکیں، حافظ بصیر پوریاقبال کی طرح لوگوں کو غفلت کی نیند سے جگانے کے لیے اپنی سی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے عید، رمضان اور شب برات وغیرہ پر نظمیں لکھ کر ان ایام کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔

شب برأت

میں مانتا ہوں آج کی ہے رات عیش بار
لیکن ہے وجہ کلفتِ دلہائے بے قرار
اے دوست دیکھ اہل زمانہ غریق عیش
مجھ کو بھی دیکھ گوشۂ خلوت میں اشکبار
حیران ہوں میں دیکھ کر یہ رنگِ اختلاف
کچھ لوگ محوِ نار ہیں کچھ مستِ کوکنار
ایسے بھی ہیں کہ نالۂ شب ہے جنہیں پسند
اک وہ جو محوِ خواب ہیں اک محوِ انتظار
حافظ خدا ہی رکھے مرے اس دیار کو
یوں اٹھ گیا جو اہل شریعت کا یاں وقار۶۷

اسلام نے ہمیں سال بھر میں دو عیدیں عطا کی ہیں اور ہر مومن کے لیے یہ دن بہت ہی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں ان کی اہمیت بارے متعدد احادیث نبوی موجود ہیں اسلام کی خوبی ہے کہ وہ دوسروں کو اپنی خوشیوں میں شریک کرنے کا درس دیتا ہے اور اس کی عملی صورتیں پیش کرتا ہے، عید کا دن محض اہل زر کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کے لیے اہل زر کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ اپنے سے کمزور لوگوں کو عید کی خوشیوں میں شامل کرنے کے لیے نماز عید سے قبل فطرانہ ادا کریں تاکہ دوسرے لوگ بھی آپ کی طرح عید کی خوشیوں میں شامل ہو سکیں، حافظ صاحب نے اپنی نظم عید الفطر کا آغاز بھی اسی بات سے کیا ہے

عید الفطر

عید کا دن ہے، صبح فطرانہ
شوق کا بھر چکا ہے پیمانہ
لوگ ہیں محوِ شغلِ خوش باشی
عیش کا دے چکے ہیں بیعانہ۶۸

شاعر دوسری جگہ عید آنے اور خوشیاں منانے کے لیے ترغیب دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہے:

وہ عید کا چاند آیا نظر عید مناؤ
خوشیوں سے ملو، پھول چنو، دھوم مچاؤ
جو ہم پہ ستم ڈھائے گئے ان کو بھلاؤ
گزرے ہوئے لمحوں سے کہو یاد نہ آؤ۶۹

مذہبی تہواروں کے بعد قومی تہوار جن میں ستمبر کی جنگ اور یوم آزادی وغیرہ ہے ان کا ذکر جمیل بھی ملتا ہے، یوم آزادی کے موقع پر "اجتماعِ یوم آزادی پر" کے عنوان سے لکھی گئی چھوٹی بحر میں کیا ہی مترنم نظم لکھی ہے پڑھتے پڑھتے طبیعت پر ایک طرح سے نشہ سا طاری ہو جاتا ہے، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے رگ و پے میں بجلیاں سے دوڑ رہی ہوں ایسا خوبصورت اور مترنم کلام کم کم ہی ملتا ہے

مجھے بتاؤ ہم نشیں! فضائیں کیوں ہیں عنبریں
وہ آسماں یہ سرزمیں ہیں آج کیوں حسیں حسیں

ہے مسکرا رہی فضا ہوائیں بھی ہیں مشک زا
ہے اہل دل کا جمگھٹا نظر کے دام جا بجا
کہاں میں شاعر حزیں کہاں کلام دل نشیں
یہ آسماں ہے یا زمیں اے میں ہوش میں نہیں
جہاں میں اب مرا وطن، ہے مثلِ شمعِ انجمن
چمن میں جس طرح سمن، سمن میں جیسے بانکپن
خدا کرے یہ گلستاں یہ امن و صلح کا نشان
یہ ارتقا کا ترجماں سدا رہے حسیں، جواں۷۰

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کا دن دشمن وطن کو کبھی بھول نہیں پایا، اس نے ہمیں کمزور جان کر اپنی فوجوں کے ساتھ اس طرف رخ کیا تو پاک فوج کے عزم و ہمت اور ان کی پیشہ وارانہ مہارت نے دشمن کی وہ حالت کی کہ آج تک ہندوستان کی فوجوں پر خوف کا لرزہ طاری ہے۔ اس دن کی مناسبت سے حافظ بصیر پوری لکھتے ہیں:

پکارا ہے تمہیں طاغوت نے ہشیار ہو جاؤ
جنودِ کفر سے پھر برسرِپیکار ہو جاؤ
کرو پھر یاد تازہ سرفروشانِ مدائن کی
صف آرا برمثالِ خالد و ضرار ہو جاؤ
جلادو برقِ خاطف کی طرح اشرار کا خرمن
رگِ باطل کی خاطر تیغ جوہردار ہو جاؤ
چلا دو وسعتِ ہندوستان میں خون کی لہریں
سرِ باطل پہ تیغِ مرتضیٰ کا وار ہو جاؤ۷۱

حافظ صاحب موصوف اقبال کی طرح لوگوں میں علم و شعور کی آگہی کے لیے علم کی اہمیت اجاگر کرتے ملتے ہیں، اپنی ایک نظم درسِ عمل میں ان کی شخصیت ایک مبلغ کی طرح نظر آئی ہے، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کے اندر لطیف جذبات رکھنے والا ایک حساس انسان ہے، وہ شعلہ بیاں مقرر بھی ہے اور منبرِ رسول ﷺ کا وارث بھی ایک شفیق استاد کی شخصیت سے تعارف بھی انہیں صفحات میں موجود ہے۔ وہ حصول علم کے لیے ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں اور ذوق و تجسس کی عدم دستیابی پر ملامت کرتے بھی نظر آتے ہیں

رہِ حیات پہ دیکھو وہ رہزنوں کے ہجوم
تم آپ خضر بنو، اپنی رہبری کے لیے
چراغِ علم کو لے کر رہِ عمل پہ چلو
کہ علم رہبرِ کامل ہے اجنبی کے لیے
ثبات عزم و یقیں ہو تو جادہ پیمائی
کلید فتح ہے تسخیرِ زندگی کے لیے
نہ تجھ میں ذوقِ تجسس نہ تجھ میں شوقِ طلب
نہ تیرے پاؤں میں طاقت ہے رہروی کے لیے
تو خود ہی توڑ چکا اپنے بال و پر ورنہ
خدا نے عرش بنایا ہے آدمی کے لیے۷۲

"اُفقِ شام" میں کئی موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی ہے اور ان میں سے متعدد موضوعات عمومی نوعیت کے ہیں جن کی مثالیں دیگر شعرا کے ہاں بھی ملتی ہیں یہ موضوعات تخیل کے اعتبار سے شاعر مذکور کو دوسرے شعرا سے ممتاز و منفرد کرتا ہے۔ شاعر ایک حساس طبیعت انسان ہے اور اپنے ارد گرد معاشرتی ناہمواریوں کو ناصرف دیکھتا اور محسوس کرتا ہے بلکہ اس پر اپنے جذبات کا اظہار بھی کرتا ہے۔

معاشرے کا المیہ ہے کہ استاد کا رتبہ و مقام ہمارے ہاں وہ نہیں رہا جس کا وہ متقاضی ہے، خاص کر دینی تعلیم دینے والے معلّمین کا تو حال ہی برا ہے۔ شاعر نے اپنی نظم میں تمام اساتید کے حوالے سے معاشرے کے اس المیہ کو محسوس کیا اور اس پر "معلم کی کہانی اپنی زبانی" کے عنوان سے نظم لکھی جس میں معاشرے کی بے حسی اور درد ٹپکتا ملتا ہے۔

سنو گے گر ساؤں وقم کے معمار کا قصہ
شکارِ غربت و افلاس کا، لاچار کا قصہ
اسیرِ گردشِ افلاک کا بیمار کا قصہ
لو سن لو مجھ سے تم میرے ہی حالِ زار کا قصہ
غبار آلود کالے رنگ کی اک شیروانی ہے
وہی ہمدم مرے اچھے دنوں کی جو نشانی ہے
ہوئی شلوار بوسیدہ یہ ٹوپی بھی پرانی ہے
مگر تنخواہ کے لب پر حدیثِ لن ترانی ہے

بڑی مدت رہِ دفتر کی میں نے خاک چھانی ہے
کلرکوں کی جبیں سے پھر بھی ظاہر سرگرانی ہے
زباں پر رات دن وردِ خداوندا! خدایا! ہے
مجھے ٹیچر بنا کر تونے اچھا آزمایا ہے
غرض کچھ ان دنوں ایسی اجیرن زندگانی ہے
کہ میں نے اپنے دل میں ڈوب کر مرنے کی ٹھانی ہے
بجا ہے ان دنوں رسوا ہوں میں سارے زمانے میں
ولیکن گوہرِ قابل ہوں قدرت کے خزانے میں
مرے جوشِ عمل کا معترف سارا زمانہ ہے
مرا ہر قول درماندہ دلوں پر تازیانہ ہے
میں خضرِ راہ ہوں ٹوٹے سفینوں کا کنارا ہوں
مگر حیراں ہوں کیوں ان دنوں خود بے سہارا ہوں[۷۳]

آیت قرآنی کا استعمال

شاعر موصوف کے ہاں ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے اشعار کے مضامین اور موضوعات کو مکمل اور بہتر بنانے کی غرض سے عربی الفاظ کا استعمال کیا ہے جس نے شاعر کے زبان و ادب پر گرفت کا مدلل ثبوت بھی مہیا کیا ہے اور ان کی حسِ ذوق و حسِ جمالیات کا پتا بھی دیا ہے

ہے کارگہِ دوراں، بَیْنَ یَدَیِ الرَّحْمٰن
ہر جاں پہ تسلط ہے، اے خالقِ جاں تیرا[۷۴]

بابائے قوم حضرت قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ کے لیے لکھی گئی نظم میں میں حافظ صاحب نے حضرت قائد کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ رب العزت انہیں اپنے اولیا کرام میں شامل کرے، "اللہ کے ولیوں کو نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ حزن" قرآن کی آیت کے مصداق، نظم کا آخری مصرع ہے

حق کرے تجھ کو شریکِ زمرہ لَا یَحْزَنُوْن[۷۵]

حضرت قائد کے لیے دوسری نظم میں بھی قرآن کی آیت کا ایک ٹکڑا ذکر کیا ہے

سمجھتا تھا رموزِ آیہَ اِنَّ الْمُلُوك
محرم اسرار کے افکار کی باتیں کریں۷۶

ایک جگہ قرآن کریم کی آیت مبارکہ شعر میں یوں پیش کرتے ہیں

بخت مرا لے آیا مجھ کو بے قدروں کی نگری میں
ورنہ کس نے عاقل دیکھا جاتا ظلمت خانے کو
جَآءَالْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کہہ کر دیکھو کون اٹھے
کون گرائے گا بت شکنو آزر کے بت خانے کو۷۷

اقبال کی طرح مسلمانوں کے سوئے ہوئے ضمیر کو جگانے کی کوشش میں مسلسل مصروف نظر آتے ہیں اور اسی کی طرح قرآن و حدیث سے تنبیہ کرتے نظر آتے ہیں

تجھے زاہد ملا ہے مژدۂ لَاتَقْنَطُوْا لیکن
رسائی کس کے نالوں کی بتِ نامہرباں تک ہے۷۸

انگریزی الفاظ کا استعمال

زبان کوئی منجمد چیز نہیں ہے یہ ہمیشہ ارتقا میں رہتی ہے اور اس میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہے ہر زبان دوسری زبان کے الفاظ اپنے اندر سمونے کی اہلیت رکھتی ہے اور اردو میں یہ وصف بدرجہ اتم موجود ہے۔ شاعر نے اردو، عربی وغیرہ کی تراکیب کے ساتھ انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے

ادھر ہیں لبوں پہ محبت کے نغمے
اُدھر ہر زبان پہ ہیں الفاظ ویلکم (wel come)۷۹

مذکورہ کتاب کو جس طرح سے مرتب کیا گیا ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے جو کچھ محسوس کیا لکھا، اور جو کچھ بھی لکھا اس کو قاری پر پیش کر دیا، اور جو اشعار اچانک سے (ارتجالًا) ہوئے ان کو بھی اسی طرح درج کر دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ بصیر پوری اپنا سب کچھ قاری اور ناقد پر چھوڑ گئے ہیں یہ رویہ مصنف کی شخصی جمالیات پر دلیل اور ان کے کشادہ دل و کشادہ ذہن ہونے کی طرف مبینہ اشارات ہیں۔ کتاب میں کچھ قطعات بھی درج کیے گئے ہیں اور آخر میں چند صفحات پر کچھ کلام فارسی کا بھی موجود ہے، عصر حاضر میں اس طرح سے دو زبانوں میں کلام جمع کیے جانے کی دیگر مثالیں شاید مکمل طور پر نہ مل سکیں۔

قطعات

حافظ بصیر پوری جانے انجانے زندگی کے بارے میں بہت گہرا فلسفہ اور مشاہدہ پیش کرتے ہیں، اور اس کے لیے وہ کوئی بہت مشکل الفاظ اور اصطلاحات کا سہارا نہیں لیتے بلکہ وہ بات بہت ہی عام اور سادہ الفاظ میں کرتے نظر آتے ہیں

قطعہ

پنجۂ حادثات میں دل ہے
زندگی موت کے مقابل ہے
بے کسی زیست کا مقدر تھی
بے بسی زندگی کا حاصل ہے ۸۰

گلوں سے خطاب و سوالیہ انداز کیا ہی خوبصورت طرز ہے یہ محبت، اخلاص یہ چاشنی اور یہ رچاؤ اور الفاظ کا چناؤ عصر حاضر میں حافظ کے ہاں خاص ہے

قطعہ

صحنِ چمن کے تازہ شگفتہ، حسین گلو
کیوں رنگ اڑ گیا ہے تمہارا جواب دو
میں نے تو کھو دیا ہے کہیں حاصل حیات
تم بھی کس کے لیے یوں اداس ہو ۸۱

گو کہ حافظ بصیر پوری غزل و محبت کے شاعر ہیں ان کے ہاں احساس، ذوق اور تخیل کی کمی نہیں ہے ان کے لفظوں کے چناؤ سے طبیعت میں کچھ جلال و انقلاب محسوس نہیں ہوتا لیکن شاعر جس قدر بھی چاہے وہ اپنے اندر کے جذبات اور ان جذبوں کا مظہر چھپانے کی قدرت نہیں رکھتا، باوجود کہ وہ ایک استاد، ادیب، شاعر مبلغ اور باوصف صوفی تھے پھر بھی وہ اپنی زیر لب آواز سے ملک میں ہونے والی ناانصافی، بدعنوانی اور ناکام خارجہ پالیسی کے ساتھ کشمیر پر ہندوستان کے غاصبانہ قبضے کی دھائی دیتے نظر آتے ہیں

ہے گرچہ وطن موردِ آلام و مصائب
اس باغ کو تاکے ہے اگر برقِ نوائب
رہزن ہیں بنے گرچہ سبھی قائد و نائب
پاتے ہیں سزا ایک ہی یاں عاصی و تائب

تم کو تو نہیں اس سے غرض موج مناؤ
مجبور سے ، معذور سے، مظلوم سے انساں
ہیں گریہ کناں، اشک فشاں، بادمِ سوزاں
جن کے رخ پہ گرد سے حسرت ہے نمایاں
تم کو تو مبارک ہوں سبھی عید کی خوشیاں
آفت زدہ مخلوق سے دامن کو چھڑاؤ
بھارت میں مسلماں ہیں اگر خوار ابھی تک
ہیں دامِ برہمن میں گرفتار ابھی تک
کشمیر پہ ہے قبضۂ اغیار ابھی تک
ناموس ہے وقفِ شبِ کفار ابھی تک
اس کی نہ کرو فکر فقط عیش اڑاؤ
ہے قوم کی عصمت تو وہاں ہدفِ ملامات
ہے روز فزوں اس پہ وہاں تلخیٔ اوقات
وہ گرچہ رہے منتظرِ روز مکافات
تم عیش کرو اور رہو مستِ خرابات
ہاں ساز بجے، رقص کرو، جھومتے جاؤ
یارو! یہ مرے داغِ نہاں دیکھتے جاؤ
اٹھتا ہوا داغوں سے دھواں دیکھتے جاؤ
حق بات پہ کٹتی ہے زباں دیکھتے جاؤ
پھر بھی میں یہ کردوں گا بیاں دیکھتے جاؤ
سوزِ دلِ مظلوم سے یہ ملک بچاؤ ۔۸۲

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ کتاب کے آخری چند صفحات میں فارسی کلام بھی شامل کیا گیا ہے، فارسی کلام کا آغاز بھی حمد باری تعالیٰ سے کیا گیا ہے، اور ایک ہی جگہ خدا اور رسول ﷺ دونوں ہستیوں کے سامنے اپنا مدعا رکھتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ

''میں اللہ نے نام سے آغاز کر رہا ہوں جو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے اور سب سے اعلیٰ بھی وہی ہے اور سب سے برتر بھی اسی کی ذات گرامی ہے، ہر چیز اس کی قدرت کی کاریگری ہے کیا جن و کیا انسان۔

اگلے بند میں شاعر کہتا ہے کہ اے صبا کہ میرا پیام لے کر جناب محمد مصطفیٰ کے پاس جاؤ اور ان سے عرض کرنا کہ سرورِ دو جہاں، اپنے اس حقیر فقیر بندے کو فراموش نہ کیجئے گا۔ میں تو مدینہ کے دستر خوان کا پروردہ اور آپ کا غلام ہوں، اگر کل مجھے دوزخ کی طرف لے جایا گیا تو میں آپ کا ہاتھ تھام لوں گا۔

بحمداللہ شروع کردم
بنام قادر و برتر یگانہ
شہے کز نقشِ کلکِ قدرتِ او
ہمہ جن و بشر اہلِ زمانہ

صبا برساں پیامم مصطفیٰ را
حبیب کبریا خیرالوریٰ را
بگو اے شہ گہے تشریف فرما
مگر کردی فرامش ایں گدا را

منم پروردۂ خوانِ مدینہ
غلام شاہِ مردانِ مدینہ
مرا ببرند فردا چوں بدوزخ
بگیرم دستِ سلطانِ مدینہ ۸۳؎

جس طرح اردو زبان میں مصنف اپنے جذبات و محبت کا اظہار کرتے ہیں اسی طرح فارسی میں بھی اپنی محبت و فکر کا اظہار بہت ہی عمدہ اور خوبصورت انداز میں کرتے ہیں:

نظر دارم ولے منظر نہ دارم
دلے دارم ولے دلبرندارم
تو رخ بنماو بستاں ایں دلِ من
کہ من نقدے ازیں برتر ندارم ۸۴؎

حافظ بصیر پوری کا شمار بلا شبہ اردو ادب کے اساتذہ میں ہوتا ہے ان کی شاعری اور نثر اس دور میں لکھی

جانے والی شاعری اور نثر میں ہر طرح سے انفرادیت کی حامل ہے

(ب) ''نالۂ شب''

حافظ بصیر پوری کی شاعری کا دوسرا مجموعہ ''نالۂ شب'' پہلی بار ۱۹۸۰ء جب کہ دوسری بار ۱۹۹۲ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ ۱۵۲ صفحات پر مشتمل کتاب بھی مکتبہ گہوارہ ادب، بصیر پور ضلع ساہیوال سے شائع ہوئی۔

شاعری کا دائرہ عام طور پر معاشرہ و عمل اور حیات انسانی کے گرد گھومتا ہے۔ حافظ بصیر پوری کے اس دوسرے مجموعہ کلام میں پہلے مجموعہ کی طرح بہت سی اصناف ملتی ہیں مگر اس میں غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ان کے ہاں عام موضوعات کے ساتھ خاص موضوعات کو بھی بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔

حافظ بصیر پوری نے اپنی شاعری میں زندگی کا بہت گہرا اور قریبی مطالعہ پیش کیا ہے، وہ زندگی کے رویوں اور چہروں کو دھندلا نہیں دکھاتے۔ ان کی شاعری زندگی کا نہایت شفاف آئینہ ہے۔ وہ اپنی شاعری کے کینوس پر جو شعری چہرے بناتے ہیں ان میں دلکشی ہے ان میں ایسا جمال ہے جو بار بار دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے اگر کوئی شعر مکرر نہ پڑھنے کی خواہش ہو تو وہ میرے خیال میں اچھا شعر ہے۔ ان کی شاعری محض موزوں و مرتب کلام نہیں۔ اس میں بدرجہ اتم شاعری کا حسن و جمال ہے ان کی شاعری انشائی حسن لیے ہوئے ہے۔ ان کی شاعری کھری ہے۔ وہ اس عہد کے اچھے شعراء کی صف کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں صوری و معنوی جھول نہیں۔ عہد حاضر کے کتنے ہی ایسے شاعر ہیں جو ایک عمر سے شعر کہہ رہے ہیں، مگر ان کے ہاں زبان و بیان اور فکر و خیال کا جھول نظر آتا ہے، کسی شاعر کا مشہور ہو جانا اس کے بڑے شاعر ہونے کی گواہی نہیں۔ بڑا شاعر وہی ہوتا ہے جس کی شاعری عروضی و فنی اور زبان و بیان کے جھول سے مبرا ہو۔ حافظ بصیر پوری کے یہاں عروضی و فنی اور زبان و بیان کی پختگی ہے۔ موشگافی کے لیے تو بہت گنجائش ہوتی ہے۔ اچھے سے اچھے کلام میں نقص نکالا جاسکتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے ان ی شاعری زندگی کا شفاف آئینہ ہے اور شاعر موصوف عہد حاضر کے خوش بیان اور ہنر مند شاعر ہیں ان کی شاعری اپنی توانائی کے باعث زندہ ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ ان کی شاعری ایسی کیف آفریں ہے جو دل و دماغ کو فوراً گرفت میں لے لیتی ہے اور اسی سے ان کا شاعرانہ مقام اور مرتبہ ظاہر ہوتا ہے۔

استفہامیہ انداز

شاعر اور شاعری کا مقام و مرتبہ اور اس کا صوری اور معنوی حسن و جمال سے کیا جاسکتا ہے، حافظ بصیر پوری اپنے عہد کے ان شعرا میں سے ہیں جن کے ہاں اساتذہ کی روش و روایت پائی جاتی ہے، ان کی شاعری میں جمالیات حسن بدرجہ اتم موجود ہے۔ غالب اور اقبال کی طرح ان کے ہاں تخیل کی بلندی بھی ہے اور وہ اپنے انداز کلام کو استفہامیہ انداز میں پیش کرتے ہیں جس سے شعر کی شعریت اور حسن جمال مزید نکھر کر سامنے آتا ہے اور قاری کو مسحور کرتا جاتا ہے۔

حافظ بصیر پوری بنیادی طور پر سہل ممتنع کے شاعر ہیں وہ بہت ہی عام سی بات کو بھی بہت ہی عمدہ اور عام فہم سادہ الفاظ میں بیان کرتے ہیں اور انداز بیان ایسا ہے کہ ان سے قاری اک نئی راہ پر بھی چل نکلتا ہے جیسا کہ یہ اشعار۔

کتنا آسان نظر آیا تھا لگانا دل کا
کتنا مشکل ہوا جاتا ہے بچانا دل کا
ہاتھ کیوں عشق بتاں سے نہ اٹھایا ہم نے
ہائے اب کام نہ آئے پچھتانا دل کا
اُس سے کیا ہوگی عنایت کی توقع حافظؔ
جس نے اک بار سنا نہ فسانہ دل کا[۸۵]

دل کی کیفیات کا بیان شاعری میں عمومی ملتا ہے، ان کیفیات کو لفظوں میں اس طرح بیان کرنا کہ قاری کا احساس اسے جلد یا بدیر کہیں عام زندگی میں محسوس کرے، اس صورت کا کسی سلیم الحواس قاری کے ہاں اجاگر کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے، قاری کے دل میں اترنے کی خواہش تو ہر کسی کے ذہن کو قلب میں ہوتی ہے مگر یہ مقام و مرتبہ ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتا یہ کام اہل ہنر کا ہی ہوتا ہے، یہ اہل ہنر ہیں کہ اپنی بات سے قاری کا ذہن و قلب جکڑلیں، اس کی مثال ملاحظہ فرمائیں:

اے دل بتلا تنہائی میں اکثر تجھے کیا ہو جاتا ہے؟
کیوں تیز دھڑکنے لگتا ہے کیوں درد سوا ہو جاتا ہے؟
یاد ان کی جب آتی ہے دل میں اک آگ لگاتی ہے دل میں
طوفان اٹھاتی ہے دل میں اور حشر بپا ہو جاتا ہے
اے دوست شناسائی کیسی؟ اب تیری مسیحائی کیسی؟
جب درد گزرتا ہے حد سے تب آپ دوا ہو جاتا ہے[۸۶]

انسانی فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے لیے کسی چارہ گر کی تلاش میں رہتا ہے اور یہی تلاش اسے زندگی کے اندھیروں سے اجالوں اور روشنیوں سے ظلمت میں کھینچ لے جاتا ہے۔ انسانی خواہشات اکثر انسان کی بربادی کا ہی باعث بنتی ہیں لیکن حافظ بصیر پوری ان آرزوؤں سے دبے پاؤں یوں بڑھ جاتے ہیں جیسے ان کا وجود ہی گم ہو گیا ہو، یعنی وہ اپنی خواہشات میں اپنے وجود کی حقیقت میں گم نہیں ہو جاتے اسی موضوع کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

اس درد لادوا کا مداوا کہیں جسے
وہ چارہ گر کہاں کہ مسیحا کہیں جسے
آباد ہے وہ چشم غزالیں کی یاد سے
اپنے تصورات کی دنیا کہیں جسے
حافظؔ وہ دوست آج ہے آمادۂ وفا
اب دل کہاں سے لاؤں کہ شیدا کہیں جسے۸۷

ذہن قلب میں پیدا ہونے والے خیالات اور ان کے نتیجے میں سامنے آنے والے حالات پر قابو رکھنا ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے، حافظ زندگی میں کسی جمود کے قائل نہیں ہیں ان کی محبت حقیقت پر مبنی ہے، وہ ایکبا صفا صوفی ہیں، ایک اعلی درجے کے مبلغ بھی وہ سوال ہی سے جواب تلاش کرتے ہیں اور اسے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سوال بھی رہتا ہے اور سلیم الحواس قاری کے لیے جواب بھی موجود رہتا ہے، وہ دنیا کو ایک عام انسان کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ایک اچھے سالک کی طرح اس سے دامن بچا کر بھی گزر جاتے ہیں۔

غفلت شعار بھولنے والے ذرا بتا
کیا چیز بن گئی تھی رکاوٹ نباہ میں
حافظ سکوں ملا جو مجھے میکدے میں آج
مسجد میں تھا ملا نہ کسی خانقاہ میں۸۸

فلسفہ و سلوک کا بنیادی سلسلہ سوال سے ہی شروع ہوتا ہے اسی لیے اقبال کے ہاں بھی ہمیں استفہامیہ شاعری ملتی ہے، دنیا میں آگے بڑھنے کے لیے جن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ان میں پہلے نمبر پر سوال ہی ہوتا ہے، یہ سوال ہی ہے جو ارتقا کے وجود کا باعث ہے اگر سوال نہ ہو تو سلسلہ حیات و ممات شاید تھم کر رہ جائے۔ حافظ کے ہاں تعریف و توصیف بھی ملتی ہے اور صوفیوں کی طرح مذمت و ملامت بھی ملتی ہے مگر یہ مذمت و ملامت براہ راست کسی کی طرف انگلی اٹھا کر نہیں کی گئی، حافظ صاحب کے اسلوب میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ مذمت و ملامت کرتے ہیں یا تنقید اس کا ہدف و نشانہ و اشارہ اپنی ذات ہی کی طرف رکھتے ہیں اور یہ جمالیات کا حسن و معراج ہے شعر ملاحظہ ہو۔

اک بے وفا سے پیار کیا ہم نے کیا کیا؟
اس دل کو داغ درد کیا ہم نے کیا کیا؟

دل دے کے ہم درد لیا دل فگار سے
گھاٹے کا کاروبار کیا ہم نے کیا کیا؟
مٹی کا تھا کھلونا یہ دل ٹوٹ تو گیا
اب اس کو شرمسار کیا ہم نے کیا کیا؟
حافظ خطیب شہر تھا ذی احترام تھا
اس کو بھی بے وقار کیا ہم نے کیا کیا؟۸۹

دنیاکے بے ثباتی اور اس کے چند روزہ ہونے کے بارے میں بہت سے لوگوں نے اشعار کہے اور اسی موضوع کو حافظ صاحب نے بھی اپنے لفظوں میں سوالیہ انداز میں برتا اور ایک نیا انداز اور نیا مفہوم نئی طرز نگارش سے آشنا کیا ہے۔ایک عالم دین و مبلغ و صوفی با صفا ہونے کے ناطے وہ لوگوں کو دنیاکے چند روزہ اور عارضی ہونے کی طرف بلاتے ہیں اور اس کے لیے منطقی اور فلسفیانہ انداز یعنی استفہامیہ طرز تکلم اختیار کرتے ہیں اور فیصلے کا اختیار قاری پر چھوڑتے ہیں یہی ایک عمدہ تخلیق کار کی نشانی ہے اور یہی جمالیات کا اعلیٰ ترین زینہ ہے اور سنت خداوندی کی پیروی کا بھی عمدہ نمونہ ہے بند ملاحظہ فرمائیں:

افسوس! آج محفل یاراں اجڑ گئی
ان کیف و انبساط کی عیدوں کا کیا بنا؟
وہ قہقہے فضاؤں میں تحلیل ہو گئے
پیہم مسرتوں کی نویدوں کا کیا بنا؟
وہ کشتگانِ خنجرِ ہجراں کہاں گئے
تیغ فراق تیرے شہیدوں کا کیا بنا؟
وہ الفت و خلوص کے پیمان کیا ہوئے؟
اے دل بتا وفا کی امیدوں کا کیا بنا؟۹۰

حافظ کے ہاں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ ان کی شاعری کو حقیقی اور مجازی دونوں رنگوں میں دیکھا جا سکتا ہے اور اس کے اشعار قاری کو رکنے اور سوچنے پر مجبور کرتے چلے جاتے ہیں۔شاعر کا کمال ہے کہ وہ ہر ہر جگہ پر محتاط نہیں ہے کسی جگہ پر بیباق بھی نظر آتا ہے اور یہ بیباقی اپنے خدا کے لیے ہے، وہ عام مولویوں کی طرح اللہ رب العزت کا تعارف جبار و قہار کی صفت سے متصف نہیں کروا رہا، یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اللہ والوں کا کام ہر وقت محض اس کے جبر و قہر سے ڈرانا ہی نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی وہ اس پروردگار کی اعلیٰ صفاتِ رحم و کرم کو بھی سامنے رکھتے ہیں اسی طرح کا مضمون مندرجہ ذیل اشعار سے ملتا ہے۔

کیوں آج وہ پھرتے ہیں سرِ گورِ غریباں
کیسے انہیں یاد آئے یہ لاچار ہزاروں؟
بے خوف قیامت ہوں یہی سوچ کے حافظؔ
اک بخشنے والا ہے گنہگار ہزاروں۹۱

کسی بھی شاعر کے ہاں ہمیں ایہام، غلو و مبالغہ کی بہتات ملتی ہے مگر حافظ بصیرپوری ایک ایسے زود حس انسان ہیں جن کے ہاں یہ صنعتیں بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں، عام شعرا کی طرح ان کے ہاں درد دل کی جگہ عام طور پر انسان اور انسانیت کا درد ملتا ہے، وہ اپنے پیغمبر کی تعلیمات کے مطابق لوگوں کو راہ خدا کی طرف گامزن کرنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں اور لوگوں کی دنیا سے محبت کو وہ ایک اور طرح سے ہی بیان کرتے ہیں، وہ اہل نظر کی طرح ظاہر کو باطن پر ترجیح دیتے ہیں اور باطنی اوصاف کو جلا بخشنے کے خواہشمند ہیں، وہ ہمارے توجہ براہ راست نہیں دلا رہے بلکہ سوالیہ انداز میں بات اٹھاتے ہیں تاکہ بات سمجھنے میں آسانی ہو سکے کیوں کہ انسانی فطرت ہے کہ وہ سوال پر زیادہ غور کرتا ہے۔

اجڑا ہوا چمن ہے بہاراں کو کیا ہوا؟
ہر سو دھواں ہے محفل یاراں کو کیا ہوا؟
سنسان روش روش ہے تو ویراں گلی گلی
سونا پڑا ہے شہر نگاراں کو کیا ہوا؟
اب کے تو روز ہجر بھی کھل کر نہ رو سکے
میں سوچتا ہوں موسم باراں کو کیا ہوا؟۹۲

دل کی کیفیات کو لفظوں کے کوزہ میں بند کرنا بھی ایک ہنر اور جمال ہے اور ان کیفیات کو سوالیہ انداز میں لانا ایک مہارت ہے جس کا ملکہ ہر کسی کے ہاں نہیں ملتا، دل کی دھڑکنوں کا بے ترتیب ہونا کسی کی عدم موجودگی میں اس کا وجود کا گمان ہونا رومانویت کا ایک جزو ہے اور یہ جزو بھی حافظ کی شاعری میں موجود ملتا ہے، حافظ بصیرپوری اس فن سے بھی آشنا ہیں کہ کب کہاں اور کیسے مجاز کو حقیقت سے منسلک کر دیا جائے:

زباں خموش ہے، چشم اشکبار کیا کہنا؟
بیان درد و غم انتظار کیا کہنا؟

ہوا کی چاپ پہ ان کا گماں گزرتا ہے
یہ حسنِ ظنِ دلِ بے قرار کیا کہنا؟
دلوں کی سینہ زنی، دھڑکنوں کی بے نظمی
یہ اضطراب دمِ وصلِ یار کیا کہنا
قدم قدم پہ نمازیں، قدم قدم پہ سجود
جبینِ شوق و رہِ کوئے یار کیا کہنا؟۹۳

حافظ کی شاعری میں یہ کمال ہے کہ اس کو حقیقت اور مجاز دونوں میں دیکھا جائے تو ایک جیسا ہی احساس ابھرتا ہے۔ وہ عشق حقیقی سے مجازی اور مجازی کے حقیقی کی طرف مسلسل سفر میں نظر آتے ہیں بعض مقامات پر اشعار کے عام مطالعہ سے لگتا ہے جیسے کوئی عام جذبات و محبت کے اشعار ہیں مگر جب رک کر ذرا غور کیا جائے تو محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ مسافر حقیقی عشق کی شاہراہ پر گامزن ہے۔

میں نے یہ مانا کہ تو تھا چشمۂ آبِ حیات
میں تری محفل سے اٹھ کر تشنہ کام آیا تو کیا؟
ہاتھ میں جنبش نہیں پاؤں میں طاقت نہیں
اب وہ آہوئے رمیدہ زیرِ دام آیا تو کیا؟
دید کی خواہش نہیں حافظؔ نظر میں دم نہیں
لے کے ماہِ تام اب جلوۂ عام آیا تو کیا؟۹۴

ایک نظم میں استفہامیہ بندش کی خوبصورتی ملاحظہ ہو

اپنا بھی نقصان کیا تھا
باغ مرا ویران کیا تھا
کتنے گزرے سال مہینے
اب تک بھول نہ پایا جی نے
جانے اب کس حال میں ہوگا
کس سِن کس سال میں ہوگا؟

جب بھی موسم گل آتا ہے!
دل پر تیر لگا جاتا ہے ۹۵

ہر دور اور ہر معاشرے میں حساس افرادِ معاشرہ اس بات کو شدت سے محسوس کرتے ہیں معاشرہ مادہ پرست ہے اور اپنی غرض کے لیے ہی ملاقات و بات چیت کرتے ہیں بہت سے شعرا اس مضمون کو براہ راست بیان کرتے ہیں جس سے بات کی افادیت کا اندازہ پوری طرح نہیں ہو پاتا مگر حافظ صاحب لوگوں کی اس بے اعتنائی اور بے مروتی کو استفہامیہ انداز میں بیان کر کے اس بات اہمیت کو مزید بڑھا دیتے ہیں، اس طرزِ بیان سے سلیم الحواس قاری سوال پر غور ضرور کرتا ہے اور کسی شاعر کا ہنر و فن یہی ہوتا ہے کہ وہ جس بات کو بیان کرے لوگ اس پر غور و فکر کریں حافظ بصیر پوری اپنی اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں، وہ لوگوں کی مادہ پرستی کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ے یوں تو کہنے کو بہت سے مہرباں ہیں شہر میں
دردِ الفت بانٹنے والے کہاں ہیں شہر میں ۹۶

سہل ممتنع

حافظ بصیر پوری کا کلام روایت پر بھی مبنی ہیں اور نیم جدید فکر و اسلوب سے بھی مزین ہیں۔ ان کی غزلوں کے افکار میں رومان اور معاشرہ و عمل شامل ہیں۔ ان کا شمار سہل ممتنع کے شعراء میں ہوتا ہے۔ عام فہم سادہ طرز بیان انہیں کسی بھی شاعر سے منفرد و ممتاز کرتا ہے، بات حقیقی ہو یا مجازی حسن جاناں کا ذکر ہو ہجر و وصال کا قصہ وہ ہر بات بہت ہی آسانی سے کہہ گزرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اس دوسرے مجموعہ کلام کا آغاز "مناجات" سے کیا ہے، پوری نظم محبت کی چاشنی لیے ہوئے ہے اور سہل ممتنع کا ایک عمدہ نمونہ بھی کہنا چاہیے، مثال ملاحظہ ہو:

تو سہارا ہے بے سہاروں کا
تو ہی مونس ہے سوگواروں کا
تو ہے ہمدرد درد مندوں کا
تو ہے غمخوار غم کے ماروں کا
تو ہی نغمہ ہے نرم موجوں کا
تجھ سے ہے شور آبشاروں کا

تیری نکہت ہے باغ عالم میں
نام چلتا ہے گو بہاروں کا
سینکڑوں ترے در کے سائل ہیں
کام بنتا ہے پر ہزاروں کا[97]

کسی بھی مسلمان کے لیے زیارات حرمین شریفین اور زیارات مدینہ سے بڑھ کر کوئی اور سعادت نہیں ہو سکتی اور ان زیارات کا ہر ہر لمحہ اور ہر ہر پل مرقع حسن و جمال ہے۔ یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جو زندگی میں کبھی ذہن و قلب سے محو نہیں ہو پاتے، ان زیارات کا حال و قصہ صرف وہی بیان کر پاتے ہیں جن کے اندر جمالیات کی چنگاری نہیں بلکہ اس کے شعلے آسمان کو چھوتے ملتے ہیں۔ حافظ بصیر پوری کی نظم "باب جبریل فی المسجد النبوی" بھی سہل ممتنع کی ایک عمدہ مثال ہے:

دیکھو بابِ کرم کشادہ ہے مانگ لے جس کا جو ارادہ ہے
یہ وہ در ہے جہاں رسولوں کو بھی تمغائے استفادہ ہے
جو بھی پایا ہے ان کی بخشش ہے جو ملا ہے انہی کا دادہ ہے
دل میں الفت کی مے چھلکتی ہے ساغرِ چشم پر زبادہ ہے
یہاں بصیرت بھی ہے، بصارت بھی، کوئی بوذر، کوئی قتادہ ہے
راہ طیبہ ہے ساتھیو! دیکھو! یا بہشت بریں کا جادہ
مسجد سرخ کتنی دلکش ہے! گنبد کتنا سادہ ہے
دیجیے حافظؔ کو بندگی کی سند آپ کا یہ غلام زادہ ہے[98]

حافظ بصیر پوری کے ہاں غالب کی طرح حیات و ممات کا قصہ و انتظار بہت ہے سہل اور عام فہم طریقہ سے بیان کیا گیا ہے جس طرح غالب کا مصرع "موت کا ایک دن معین ہے" سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہے اسی طرح حافظ بصیر پوری بھی اس موضوع کو انشائیہ انداز میں بیان کرتے ملتے ہیں۔

آس ٹوٹی، حیات باقی ہے
بجھ گئی شمع، رات باقی ہے
کس کو جینے کی اب تمنا ہے
انتظار ممات باقی ہے[99]

ملنے بچھڑنے کا قصہ اور اس کے مابعد اثرات کا موضوع بھی شاعری میں روایتی ہے اور اس روایتی موضوع کو بھی شاعر عام گفتگو کے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ غزال آنکھوں اور کاجل کے کھینچے جانے کو دیگر شعرا نے بھی بیان کیا جن میں اساتذہ اور جدید شاعر شامل ہے لیکن جو انداز حافظ نے اختیار کیا ہے اس کا اپنا ایک حسن و جمال اور انفرادیت ہے

یوں مل کے بچھڑنے کا الم یاد رہے گا
خوشیوں نے جو بخشا ہے جو غم یاد رہے گا
گزروں گا میں اب زیست کے جس موڑ سے مجھ کو
اے دوست تری زلف کا خم یاد رہے گا
چشمانِ غزالیں میں وہ کاجل کی لکیریں
قاتل تری شمشیر کا دم یاد رہے گا۱۰۰

کہا جاتا ہے کہ بھول جانا انسان کی فطرت میں شامل ہے اور روز مرہ زندگی میں ہم یہ محاورہ دن میں ایک آدھ بار تو استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "انسان خطا کا پتلا ہے"۔ مصنف موصوف کے ہاں فارسی کے عظیم شاعر حافظ شیرازی کا سا رویہ بھی ملتا ہے اور وہ یہ کہ بصیرپوری صاحب کسی منفی بات میں سے بھی مثبت پہلو نکالنے کا فن جانتے ہیں، وہ حافظ شیرازی کی طرح کہیں بھی ناامید نظر نہیں آتے۔ اپنے اس اہم ترین وصف کو جب وہ بروئے کار لاتے ہیں تو سہل ممتنع کی عمدہ مثال بنا دیتے ہیں۔

اس نے ہمیں بھلا دیا حافظ تو کیا ہوا
کہتے ہیں بھول جاتا ہے انساں کبھی کبھی۱۰۱

قلبی صورت حال کا بیان دو لفظوں میں اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ صرف ایک لفظ ہی پوری کہانی بیان کرتا ہے یہ ہنر اساتذہ کے تو عام پایا جاتا ہے مگر ان کے ہم عصر بڑے بڑے شعرا میں یہ وصف کم کم ہی ملتا ہے، وہ وصل و قرار، قربت و اعتبار کو بھی یونہی بیان کرتے ہیں جیسے عام گفتگو کر رہے ہوں

خبر ملی ہے پیامِ نگر آئے گا
دلِ حزیں کو سکون و قرار آئے گا
کرن امید کی چمکی غبار یاس چھٹا
کہ یار لے رخِ تابدار آئے گا

وہ دور رہ کے بھی نزدیک ہیں مگر حافظؔ
مری زبان پہ کیسے اعتبار آئے گا[102]

حافظ بصیر پوری زمانہ ساز و زمانہ شناس انسان ہیں اس لیے وہ جو بھی بات کرتے ہیں لوگوں کی فہم و ادراک کو مد نظر رکھ کر کرتے ہیں نثر میں تو اس کا اہتمام ممکن ہے مگر شاعری میں یہ کام بہت مشکل ہے کیونکہ مضامین باندھے نہیں گئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب مضامین القا کیئے گئے ہوں، اگر ایسا نہ ہو تو ان مضامین و موضوعات میں کچھ مشکل پسندی ضرور ہو لیکن حافظ صاحب موصوف ہر بات بہت ہی عام فہم انداز میں کرتے نظر آتے ہیں۔

تم سے پوچھا نہ گیا ہم سے بتایا نہ گیا
دل کا افسانہ کسی طور سنایا نہ گیا
اس نے اک بار ہمیں پیار سے دیکھا حافظؔ
عمر بھر ہم سے یہ احسان بھلایا نہ گیا[103]

اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں:

لب پہ آتی ہے گفتگوئے وفا
دل سے جاتی نہیں خوئے وفا
پھر بھی کرتا رہوں گا یاد ان کو
تاکہ بچ جائے آبروئے وفا
مدتیں ہو گئیں ملے ان سے
پھر بھی دل میں ہے آرزوئے وفا[104]

کیسے پھرتے ہو دربدر حافظ
تم تو بے آسرا سے لگتے ہو[105]

اپنی بات بیان کرنا اور اپنی مشکل بیان کرنا تو تمام شعرا اور ہر خاص و عام کے ہاں پایا جاتا ہے لیکن حافظ کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ اپنا مسئلہ بھی بیان کرتا ہے اور اس پر حل بھی پیش کرتا ہے۔

حالِ دل پوچھا کرو، داروئے غم کرتے رہو
درد بڑھتا جا رہا ہے اس کو کم کرتے رہو
دل بہل جایا کرے گا، یوں بھی دم بھر کے لیے
گر تمھیں آنا ہو مشکل خط رقم کرتے رہو

سزا و عطا کا استعمال بھی خوب طریقے سے کرتے ہیں۱۰۶

زخمِ دل پھول کھلا ہو جیسے
تحفۂ دوست ملا ہو جیسے
زندگی ایک سزا ہو جیسے
یہ بھی اک تیری عطا ہو جیسے۱۰۷

سامنے سے گزر گیا کوئی
مجھ کو دیوانہ کر گیا کوئی
اب وہ صورت نظر نہیں آتی
کون جانے کدھر گیا کوئی۱۰۸

کوئی دیوانہ ہوا تو اس نے کہا کہ لب و عارض و زلف کنار، غازہ وغیرہ اس کی دیوانگی کا سبب ہوئے اور وہ مبتلائے عشق ہوا ہے، لیکن حافظ بصیر پوری کے ہاں یہ مرحلہ بھی ان کی شاعری کی طرح سہل ممتنع کی ہی ایک مثال ہے اور ایسی جمالیاتی مثال شاید اور کہیں نہ ملے گی۔

سامنے سے گزر گیا کوئی
مجھ کو دیوانہ کر گیا کوئی
اب وہ صورت نظر نہیں آتی
کون جانے کدھر گیا کوئی۱۰۹

حافظ کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ بہت سے آفاقی حقائق کو بھی سہل انداز میں پیش کرتے ہیں، جیسے زندگی کا فانی ہونا اور دنیا میں ایک ہی بار آنا۔

لوٹ آؤ کہ زیست فانی ہے
کون یاں بار بار آتا ہے۱۱۰

شناسائی اور مسیحائی درد و دوا یہ بھی غزل و شاعری کے عام موضوعات ہیں ان پر قریب قریب تمام ہی شعرا نے اشعار لکھے ہیں اور علامہ بصیرپوری بھی اس دشت میں اپنا جگر آزماتے ملتے ہیں مگر انداز ممتاز و منفرد ہے

اے دوست شناسائی کیسی؟ اب تیری مسیحائی کیسی؟
جب درد گزرتا ہے حد سے تب آپ دوا ہو جاتا ہے۱۱۱

وعدے، اعتبار و انتظار کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

وعدے پہ اعتبار کیا ہم نے کیا کیا
بے سود انتظار کیا ہم نے کیا کیا۱۱۲

افسوس کوئی وصل کا پیغام نہ آیا
ہاں موت تو آئی مگر آرام نہ آیا۱۱۳

دل ٹوٹنے اور غیروں کے سنگ جانے آنکھ ملانے اور آنکھ چرانے کو بھی ایک منفرد انداز سے بیان کیا ہے۔

دل توڑ کے اپنوں کو رلاتے ہوئے جانا
اچھا نہیں غیروں کو ہنساتے ہوئے جانا
گر بوجھ تھی الفت تو نہ پھر آنکھ ملاتے
اب ٹھیک نہیں آنکھ چراتے ہوئے جانا۱۱۴

کہا جاتا ہے کہ سچ بات لوگوں کو پسند نہیں آتی اور لوگ برا مان جاتے ہیں اسی بات کو شاعر نے سہل انداز میں بیان کیا ہے اور معاشرتی رویے کی عکاسی بھی کرتے ہوئے ملتے ہیں کہ کیسے لوگ اہل جفا کو اہل وفا سمجھتے ہیں۔

اہل جفا کو اہل وفا جانتے ہیں لوگ
سچ بات گر کہیں تو برا مانتے ہیں لوگ۱۱۵

یوں تو ملنے کو کئی حسیں آئے
جن کو چاہا تھا وہ نہیں آئے۱۱۶

رہتی ہے مرے دل میں تیری یاد ہمیشہ
گو لب پہ کبھی نام تمہارا نہیں ہوتا۱۱۷

سو بار ستم ڈھایا، سو بار جفا کر لی
کیا تم سے وفا ہوگی، بس تم نے وفا کر لی۱۱۸

صنعت تکرار

کہا جاتا ہے کہ شاعری اب زندگی کی ترجمان ہو گئی ہے، حافظ بصیر پوری کے ہاں اسلوبی حسن بھی موجود ہے اور فکر و خیال کا اظہار بھی ہے، مشاہدہ بھی ہے اور جذبات کی عکاسی بھی ہے۔ شاعری کا حسن جن چیزوں میں مضمر ہے ان میں ایک صنعت تکرار ہے حافظ کی شاعری میں حسن و عشق محبت اور جذبات کے جمالیاتی اظہار کے لیے تکرار لفظی سے شاعری کو حسن بخشا ہے

محبوب کی سیاہ زلفوں کا ذکر بھی ہر شاعر کے ہاں مل جاتا ہے اور ہر کسی نے اس کی نقش نگاری اپنے ذوق و جذبات کے مطابق کی ہے، اسی مضمون کو حافظ یوں بیان کرتے ہیں

اے گیسوئے محبوب کی گھنگھور گھٹاؤ
کھل کھل کے برسنے کا کرم یاد رہے گا۱۱۹

دل ٹوٹنے کا غم تو نہیں غم یہ ہے ندیم
پاتا ہوں چشمِ یار پشیماں کبھی کبھی۱۲۰

شاعری میں نعت رسول مقبول ﷺ اپنے پیغمبر سے محبت کا ذریعہ ہے اور ہر شاعر اس صنف کو لکھنا اپنے لیے انتہائی باعث سعادت و عقیدت سمجھتا ہے، ایک نعت میں کیا ہی خوبصورت تکرارِ لفظی ملتی ہے

رب نفسی رب نفسی کی صدا ہے چار سو
کسی کو یارائے شفاعت ماسوائے مصطفیٰ
جھم کر پل سے گزر جاو گنہ گارو کہ اب
رب سلم رب سلم ہے صدائے مصطفیٰ ۱۲۱

محبت میں کوئی کن کن مراحل اور راہوں سے گزرتا ہے اس بارے میں شاعر اپنے تجربات و ابلاغ کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

سر رہگزر، درِ یار پر، کبھی دربدر، کبھی دار پر
کسی چارہ گر کی تلاش میں میں کہاں کہاں سے گزر گیا۱۲۲

ان کے نعروں سے لرزتے ہیں کوہ و دمن
تذکرے محفل بہ محفل، انجمن در انجمن۱۲۳

محبوب سے خطاب میں شاعر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے آپ کو زیر دست پیش کرتا ہے اور اپنی پسند اور حوصلے کی بات کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے ہیں:

اپنی اپنی ہے پسند، اپنا اپنا حوصلہ
ہم وفا کرتے رہیں گے تم ستم کرتے رہو۱۲۴

کسی بھی کلام میں سب سے زیادہ حسین و جمیل اور مرقع جمال کلام حمد و نعت ہوتی ہے یہ واحد کلام ہوتا ہے جس ہر چھوٹا بڑا شاعر بڑی محبت اور بہت ہی احترام و اہتمام کے ساتھ لکھتا ہے اور اس کا ایک جمالیاتی پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعر اس کو اپنے لیے آخرت کا وسیلہ بنا کر پیش کرتا اور اس کے عوض آخرت میں شفاعت کا امیدوار بنتا ہے۔ حافظ بصیر پوری کے ہاں بھی جو سب سے عمدہ کلام ملتا ہے اس میں حمد و نعت اور تذکرہ مدینہ منورہ کے لیے لکھا گیا کلام ہے، پھر اگر یہ کلام عمدہ صنعتوں سے بھی مزین ہو تو اس کے جمالیاتی حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں:

مدینے کی دلکش بہار اللہ اللہ
بہشت بریں بھی نثار اللہ اللہ
وہ طیبہ کا پیارا دیار اللہ اللہ
عیاں شانِ پروردگار اللہ اللہ
تبسم کناں ہیں امیدوں کی کلیاں
گندھے آرزوؤں کے ہار اللہ اللہ
برستے ہیں انوار دن رات پیہم
وہ رحمت کی رم جھم پھوار اللہ اللہ

وہ شور و فغاں بیکسوں غمزدوں کا
وہ فریادیوں کی پکار اللہ اللہ
تڑپتے ہوئے ہر طرف نیم بسمل
وہ دیوانے پروانہ وار اللہ اللہ
وہاں لٹتے ہیں ذوق و مستی کے ساغر
بہر سود واں بادہ خوار اللہ اللہ
وہاں کوئی سنتا نہیں لن ترانی
نظر ہو تو جلوے ہزار اللہ اللہ
خدا گر دکھائے نگار مدینہ
تو حافظ کہوں باربار اللہ اللہ ۱۲۵

تم نے گر نام مجھے اپنا بتانا بھی نہ تھا
چشم سرمست سے پھر جام پلانا بھی نہ تھا
اپنا دل اپنی نظر اپنی طلب اپنی پسند
میں نے اس حسن کو چاہا جسے جانا بھی نہ تھا ۱۲۶

حافظ کو ذرا دیکھو روتا ہے سر محفل
دیوانہ ہے دیوانہ، سودائی ہے سودائی ۱۲۷

تنہائیوں کا ذکر یوں مکرر کرتے ہیں جس سے اس کی شدت اور احساس کا علم ہوتا ہے۔ ان تنہائیوں کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

میں تنہا ہوں بستی بستی
ہونٹوں پر آہوں کے چھالے
تنہا راہیں سونی سونی
غم کے بادل کالے کالے ۱۲۸

شاعر موصوف نے ۱۹۷۲ء میں حج کی غرض سے سرزمین حجاز مقدس کا سفر کیا اور وہاں پر کچھ چار سے پانچ ماہ کا عرصہ گزارا اور واپسی پر "اس دیار میں" کے عنوان سے ایک سفر نامہ بھی تحریر کیا جو منت پذیر اشاعت ہوا اور مقبول عام ہوا۔ اسی حوالے سے انہوں نے اپنے سفر کی داستان کو اسی عنوان کے تحت بصورت نظم بھی تحریر کیا اسی نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو:

مجھے ہیں یاد وہ دن جب دیاریار تھا میں تھا
مدینہ عالیہ شہر شہِ ابرار تھا، میں تھا
مرا دل تھا، مراغم تھا، مرا غمخوار تھا، میں تھا
وہ سارے نوریوں کا کارواں سالار تھا، میں تھا۱۲۹

اپنے محسنوں اور ان کی احسان مندی کا ذکر اور ان کی فکر میں شاعریوں گویا ہیں:

جس کے غم نے ہمیں ہر غم سے رہائی بخشی
ایسے محسن کو بھلا کیسے بھلا دے کوئی۱۳۰

کسی کی آمد کے منتظر کیسے اپنے جذبوں کا اظہار کرتے ہیں

جذبۂ دل دکھا کوئی تاثیر
لطف تب ہے کہ وہ یہیں آئے
اپنی آنکھیں بچھائے دیتا ہوں
آئے آئے وہ دل نشیں آئے۱۳۱

محبت میں جذبات کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ محبت کی شدت کا علم ہوتا ہے کہ کیسے کوئی محبت میں جان دینے پر تیار ہوتا ہے کسی کی ایک جھلک پانے کے لیے شاعر زندگی کو داؤ پر لگانے کو تیار نظر آتا ہے، شاعر کسی جز وقتی رفاقت کا طلبگار نہیں ہے بلکہ وہ دائمی رفاقت کا طالب ہے اور کیا ہی خوبصورت اظہار محبت ہے۔

پل بھر کی رفاقت کو رفاقت نہیں کہتے
دم بھر کا سہارا تو سہارا نہیں ہوتا
تم آؤ سربام میں آتا ہوں سر دار
پردوں میں محبت کا نظارا نہیں ہوتا۱۳۲

اپنی زندگی کے بارے میں محبوب سے یوں کلام کرتے ہیں۔

کھلی کتاب کی مانند ہے حیات مری
عیاں نہاں کی طرح سے نہاں عیاں کی طرح۱۳۳

محبت میں رسوائی کا ذکر بھی تمام شعرا کے ہاں ملتا ہے اور اس رسوائی کا تذکرہ حافظ کے ہاں تکرارِ لفظی کی صورت بیان ہوا ہے جس نے بیان اور انداز بیان کو دو چند کر دیا ہے۔ یہاں نہ صرف شعر کی شعریت بلکہ صوری اعتبار سے بھی ان اشعار سے حسن جھلکتا ہے۔

دولت والوں کی عزت، دل والوں کی رسوائی ہے
بستی بستی اس دنیا میں ظلمت چھائی ہے
کوچہ کوچہ، گھر گھر میں ہے بار مری رسوائی کی
تیرے شہر میں آکر میں نے کتنی شہرت پائی ہے۱۳۴

صنعت تضاد

حافظ کی شاعری میں صنعت تضاد کے خوبصورت و جمیل اشعار ملتے ہیں:

ان کے جلووں سے ہی بزم کن فکاں روشن ہوئی
چاند میں، سورج میں، تاروں میں ضیائے مصطفیٰ
چلتے پھرتے جاگتے سوتے اور اُٹھتے بیٹھتے
کیجئے حافظؔ ہر لحہ ثنائے مصطفیٰ۱۳۵

جانے کے لیے آئے اٹھنے کے لیے بیٹھے
اک رسمِ زمانہ تھی سو تم نے ادا کر لی۱۳۶

دل میں رہے تو آگ ہے نکلے تو اشک
وہ حرفِ آرزو کہ تمنا کہیں جسے۱۳۷

بلبل نے کہی گل سے کیا بات خدا جانے
شبنم کے گرے آنسو کلیوں کو ہنسی آئی۱۳۸

سکوں نا آشنا ہوں میں پریشانی نہیں جاتی
چمن میں جا کے بھی ویرانی نہیں جاتی۱۳۹

نظم "کالج کے لڑکے" ایک طنزیہ نظم ہے اس کو المیہ بھی کہا جاسکتا ہے یہ اس دور کی بات ہے جب خاص طور پر سرکاری کالجوں کے طلبا میں طلبا یونین کے نام پر غنڈہ گرد عناصر کا ایک جم غفیر جمع تھا ان کے افعال و کردار پر لکھی گئی نظم کا ایک شعر یہاں بیان کیا جارہا ہے جسے حاصل نظم شعر بھی کہا جاسکتا ہے اور اس دور کا المیہ بھی اس ایک ہی شعر سے اس دور کے طالب علم مکمل طور پر سامنے آجاتا ہے۔

یہ نہ مانے ہیں نہ مانیں گے نصیحت آپ کی
پیار سے سمجھائیے یا ان سے لڑ کے دیکھئے۱۴۰

تلمیح

شاعری کا ایک حسن و جمال تلمیحات میں مضمر ہوتا ہے شاعر موصوف اپنے اشعار میں مختلف تلمیحات کا استعمال کرتے ہوئے کلام میں جمال و خوبصورتی پیدا کرتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

معروف مسلم حکمران محمود غزنوی نے ہندوستان پر ۱۷ حملے کئے اور آخری حملے میں سومنات کا مندر منہدم ہوا اسی کے انہدام کے لیے وہ ہندوستان آتا رہا اس بت شکن کا حوالہ دیتے ہوئے شاعر ملامت کرتا ہوا ملتا ہے۔

ہائے اب کوئی غزنوی نہیں ملتا
کفر کا سومنات باقی ہے۱۴۱

حافظ بصیر پوری اس فن میں طاق ہیں کہ وہ تلمیح تشبیہ یا دیگر صنعتوں کو ایک ہی جگہ جمع کر دیتے ہیں اور ناقد کو اس مشکل میں ڈالتے ہیں کہ یہاں کس صنعت کا ذکر پہلے اور کس کا بعد میں کیا جائے مندرجہ ذیل اشعار نظم "سلام بجناب امام عالی مقام" کے ہاں جہاں جناب سید الشہدا امام حسین رضی اللہ عنہ اور واقعہ کربلا کا ذکر بھی کیا ہے اور کیا ہی مہارت اور خوبصورتی کے ساتھ ان کی تشبیہ بھی بیان کی ہے۔

وہ نوشۂ گلرنگ و گلگوں قبا
عروسِ شہادت کا دولہا بنا
تن مصطفیٰ چہرہ مرتضیٰ
زہے عشق کامل زہے حسن تام
علیکم سلام، علیکم سلام
گل تازۂ گلستانِ بتول
حسین ابن حیدر شبیہ رسول
دُرودُوں کے موتی، سلاموں کے پھول
نچھاور تیری ذات پر صبح و شام
علیکم سلام، علیکم سلام۱۴۲

ہمارا عقیدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ باعث وجود کائنات ہیں اور ہمیں ان کی اقتدا کے لیے پیدا کیا گیا اسی بات کو شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

جان و دل، ہوش و خرد، ہر شے فدائے مصطفیٰ
ہیں یہ سب تخلیق رب لیکن برائے مصطفیٰ۱۴۳

مندرجہ ذیل شعر کا جمالیات حسن یہ ہے کہ اس میں بھی شاعر نے شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر تلمیح اور صنعت ایہام جمع کر دی ہیں۔

فرہاد سے بڑھ کر شیریں ہے حافظ تیرے غم کا افسانہ
شیریں کی وفا کا نام نہ لے اب تذکرۂ فرہاد نہ کر۱۴۴

روز قیامت کا ذکر کس خوبی سے لایا گیا ہے۔

داغِ حسرت نہ گن ابھی ناصح
جلد روز شمار آتا ہے۱۴۵

تشبیہات

تشبیہ بھی حسن کلام کا زیور ہے۔ تشبیہ و استعارہ دونوں کام میں حسن معنی افرینی اور اختصار و جامعیت پیدا کرتے ہیں دنیا کے کی تمام زبانوں میں صنائع و بدائع سے کام لیا جاتا ہے۔ حافظ بصیر پوری انتہائی حساس اور ذی شعور شاعری ہیں ان کے تشبیہ کی بلند مثالیں ملتی ہیں۔ اپنے تیز احساسات کے ذریعہ ماحول سے متاثر ہوتے تھے اور ہر بڑے شاعر کی طرح تاثرات قبول کرنے کی بھرپور اہلیت رکھتے تھے، یہی وہ تاثرات ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر شاعر شعری اصناف تخلیق کرتا ہے، غالب کی طرح حافظ بصیر پوری نے بھی اپنے مضبوط تخیل کی بنیاد پر تشبیہات کی دنیا سجادی ہے ان کی تشبیہات سے بھی ہمیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ غالب ہی کی طرح ان کی تشبیہات بھی حقیقی ہیں اور مشاہدات کی بنیاد پر لائی گئی ہیں انہیں شعوری تشبیہات کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔

جن کی نبضوں میں لہو ہے خالد و ضرّار کا
جن میں ہر اک جانشین ہے حیدر کرّار کا۱۴۶

نکلا جو صدف سے تو ملا خاک میں آنسو
یہ گوہر نایاب کسی کام نہ آیا۱۴۷

تیرے گیسو رات کی زلفوں سے بھی تاریک تر
تیری پیشانی ہے روز عید کی روشن سحر
تیرے ہونٹوں نے کیا ہے برگِ گل کا راز فاش
درمیاں جن کے زباں ہے قند کی ترشیدہ قاش۱۴۸

دو بچوں کی پیدائش پر لکھی جانے والے ایک نظم ہدیہ تبریک سے تشبیہ کا ایک شعر

وہ کیا ہیں آفتابِ نور کی دو ضوفشاں کرنیں
وہ اک نوری گھرانے کی ضیا کی ترجماں کرنیں۱۴۹

زلفِ سنبل، چشم نرگس، رنگ لالہ، بوئے گل
اک حسیں پیکر کے کتنے ترجمان ہیں شہر میں۱۵۰

مبالغہ و غلو

بے نیازی ہے کس قدر توبہ
تم تو بالکل خدا سے لگتے ہو۱۵۱

چیر کے آنکھ کو آنسو نکلے
روح پہ زخم لگا ہو جیسے
وہ گئے روٹھ کچھ ایسے حافظ
مجھ سے ناراض خدا ہو جیسے۱۵۲

میں اب فلک کی فضاؤں میں تجھ کو ڈھونڈوں گا
زمیں پہ عرصہ ہوا تیری جستجو کرتے
نماز عشق ادا ہوسکی نہ آج تلک
تمام عمر رہے اشک سے وضو کرتے۱۵۳

جب شب کی مانگ کو تاروں کی افشاں سے سجایا کرتے تھے
اس وقت تمہاری زلفوں کی ہم یاد منایا کرتے تھے۱۵۴

چشم حیراں ہو گیا ہوگا
اس پہ قرباں ہو گیا ہوگا
جس نے دیکھا ہے وہ بت کافر
وہ مسلماں ہو گیا ہوگا۱۵۵

تم نے تو ہاتھ میرے ہاتھ پہ آرکھا تھا
میں نے کہسار ہتھیلی پہ اٹھا رکھا تھا۱۵۶

فارسی کلام

''اُفقِ شام'' کی طرح دوسرے مجموعہ کلام اردو کے علاوہ فارسی اور پنجابی کلام بھی موجود ہے فارسی میں

"کتبۂ لوحِ مزار" کے عنوان سے ایک انتہائی خوبصورت فارسی نظم ہے

گر سر تربتم گزر بکنید
بارے از رحمتم نظر بکنید
من ہمانم کہ بارہا دیدید
رخ کتوں سوئے من دگر بکنید
مثل خورشید چہرہ بنمائید
ایں شب تار من سحر بکنید
در خمیرِ جہاں وفائے نیست
حب اہل جہاں بدر بکنید
عمر چوں راہرو بگزرانید
وقت چوں میہماں بسر بکنید
مشکل است آنکہ زو حذر کردن
ان چنیں صورتی حذر بکنید
چشم بر رہ نشستہ ام حافظؔ
یار دلدار را خبر بکنید۱۵۷

پنجابی کلام

آپے حال خرابے کرینا ایں آپے حال پچھنا ایں
آپے دل دی پیاس ودھاویں آپے پانی دینا ایں۱۵۸

اندر کوڑا، باہر کوڑا، کوڑا وچ مسیتی
کویں نماز پڑھیوے حافظؔ ہر تھاں پئی پلیتی
دلوں خیال نہ غیراں جاوے ڈاہڈی کوشش کیتی
لکھاں واری توڑی حافظؔ لکھاں واری نیتی۱۵۹

دوسرے مجموعہ کلام "نالۂ شب" میں مختلف موضوعات پر نظمیں بھی موجود ہیں اور نعت، سلام بجناب

امام عالی مقام جیسی نادر کلام بھی ہے "مجاہدین وطن کی خدمت میں" کے عنوان سے وطن عزیز کے جانباز سپوتوں کو خراج عقیدت بھی پیش کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر شاعری کا یہ مجموعہ ایک کہنہ مشق اور جہاں دیدہ صاحب طرز شاعر کی کاوش اور جمالیات کا عمدہ مرقع ہے۔ اس میں شاعر کا کمال بھی ہے اور خیال بھی، حسن بھی ہے اور جمال بھی غالب کی تقلید بھی ہے اور اقبال کی تائید بھی۔

نعت

مدینے کی دلکش بہار اللہ اللہ
بہشت بریں بھی نثار اللہ اللہ
وہ طیبہ کا پیارا دیار اللہ اللہ
عیاں شان پروردگار اللہ اللہ
تبسم کناں ہیں امیدوں کی کلیاں
گندھے آرزوؤں کے ہار اللہ اللہ
برستے ہیں انوار دن رات پیہم
وہ رحمت کی رم جھم پھوار اللہ اللہ
وہ شور فغاں بیکسوں غمزدوں کا
وہ فریادیوں کی پکار اللہ اللہ
تڑپتے ہوئے ہر طرف نیم بسمل
وہ دیوانے پروانہ وار اللہ اللہ
وہاں لٹتے ہیں ذوق و مستی کے ساغر
بہر سو وہاں بادہ خوار اللہ اللہ
وہاں کوئی سنتا نہیں لن ترانی
نظر ہو تو جلوے ہزار اللہ اللہ
خدا گر دکھائے نگارِ مدینہ
تو حافظ کہوں بار بار اللہ اللہ

نالہ شب صفحہ نمبر ۴۰ پر حافظ بصیرپوری کی نعت رسول مقبولؐ مدینے کی دلکش بہار اللہ اللہ کا صادق ضیائی کی نعت سے موازنہ

صادق ضیائی:

رسول خدا کا دیار اللہ اللہ
عجب ہے وہاں کی بہار اللہ اللہ
شفائے مریضاں سرور دل و جاں
مدینے کے لیل و نہار اللہ اللہ
بناتے ہیں خاکِ مدینہ کو سرمہ
یہ شاہان عالی وقار اللہ اللہ
مدینے کی گلیوں پہ شرما رہی ہے
بہشت بریں کی بہار اللہ اللہ
بفیض رسول مکرم جہاں میں
نہیں رحمتوں کا شمار اللہ اللہ

غزل میں حافظ بصیرپوریؒ کا اندازِ بیاں اپنے معاصر شعرا خاص طور پر احمد فرازؔ سے کیسی مماثلت رکھتا ہے۔

غزلِ حافظ بصیرپوریؒ

وہ شب و روز وہ لمحات سہانے مانگے
دل ہے دیوانہ وہی گزرے زمانے مانگے
وہ تو یوں بیٹھے ہیں جیسے کوئی بیگانہ ہو
دل وہی پیار کے انداز پرانے مانگے
ہم نے تو لاکھ قرینوں سے بلایا ہے اسے
پر وُہ بے مہر تو جانے کے بہانے مانگے
نوحہ غم کے سوا کچھ نہیں سینے میں ندیم
اس کو کیا کہتے جو خوشیوں کے ترانے مانگے
شہر الفت میں ہے افلاس کا دورہ حافظؔ
کوئی اب کس سے وفاؤں کے خزانے مانگے

غزلِ احمد فراز

قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے
ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقت شہر تو کہنے کو فسانے مانگے
یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیے
اب یہی ترک تعلق کے بہانے مانگے
اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے، لٹ بھی چکے
اور محبت وہی انداز پرانے مانگے
زندگی ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ
اور تو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے
دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فراز
مل گئے بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

(احمد فراز)

حوالہ جات

۱۔ مولانا الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، لاہور، ۲۰۰۰ء، پاپولر پبلشنگ ہاؤس، چوک اردو بازار، ص، ۴۸

۲۔ حافظ بصیرپوری، اُفقِ شام، ساہیوال، مکتبہ گہوارۂ ادب، بصیرپور، ص ۴۰

۳۔ مولانا الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، لاہور، ۲۰۰۰ء، پاپولر پبلشنگ ہاؤس، چوک اردو بازار، ص ۶۸

۴۔ حافظ بصیرپوری، اُفقِ شام، ساہیوال، مکتبہ گہوارۂ ادب، بصیرپور، ص ۹، ۱۰

۵۔ ایضاً، ص ۵۰

۶۔ ایضا، ص، ۶۰

۷۔ ایضا، ص ۷۲

۸۔ ایضا، ص، ۷۳

۹۔ ایضا، ص، ۷۸

۱۰۔ ایضاً، ص، ۹۹

۱۱۔ ایضا، ص ۱۴۲

۱۲۔ ایضاً، ص، ۱۶۰

۱۳۔ ایضاً، ص، ۲۶

۱۴۔ ایضاً، ص، ۱۰

۱۵۔ ایضا، ص، ۱۸

۱۶۔ ایضاً، ص، ۲۵

۱۷۔ ایضاً، ص، ۵۱

۱۸۔ ایضاً، ص، ۶۳

۱۹۔ ایضا، ص، ۶۵

۲۰۔ ایضاً، ص، ۸۷

۲۱۔ ایضاً، ص، ۸۹

۲۲۔ ایضاً، ص، ۹۵

۲۳۔ ایضاً، ص، ۱۳۱

۲۴۔ ایضاً، ص، ۱۳۸

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۲۶۔ ایضاً، ص، ۱۴۴

۲۷۔ ایضاً، ص، ۲۴

۲۸۔ ایضاً، ص، ۳۳

۲۹۔ ایضاً، ص، ۳۵،۳۶

۳۰۔ ایضاً، ص، ۶۷

۳۱۔ ایضاً، ص، ۱۰۳

۳۲۔ ایضاً، ص، ۱۳۳

۳۳۔ ایضا، ص، ۱۴۵

۳۴۔ ایضا، ص، ۱۶۸

۳۵۔ ایضاً، ص، ۳۵

۳۶۔ ایضاً، ص، ۴۰

۳۷۔ ایضاً، ص، ۸۴

۳۸۔ ایضاً، ص، ۱۲۸، ۱۲۹

۳۹۔ ایضاً، ص، ۱۶۳

۴۰۔ ایضاً، ص، ۱۶۶، ۱۶۷

۴۱۔ ایضاً، ص، ۳۰

۴۲۔ ایضاً، ص، ۳۴

۴۳۔ ایضاً، ص، ۶۲

۴۴۔ ایضاً، ص، ۷۳

۴۵۔ ایضاً، ص، ۸۷

۴۶۔ ایضاً، ص، ۸۷

۴۷۔ ایضاً، ص، ۱۲۵

۴۸۔ ایضاً، ص، ۱۲۸

۴۹۔ فیض احمد فیض۔شامِ شہر یاراں، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اگست ۱۹۷۸ء ص، ۶۸

۵۰۔ محولہ بالا، حافظ بصیر پوری، اُفقِ شام، ساہیوال، مکتبہ گہوارۂ ادب، بصیر پور، ص، ۵۴

۵۱۔ ایضاً، ص، ۵۵

۵۲۔ ایضاً، ص، ۱۶۶

۵۳۔ ایضاً، ص، ۱۷۹

۵۴۔ ایضاً، ص، ۲۳

۵۵۔ ایضاً، ص، ۸۵

۵۶۔ ایضاً، ص، ۹۳

۵۷۔ ایضاً، ص، ۷۶

۵۸۔ ایضاً، ص، ۹، ۱۰

۵۹۔ ایضاً، ص، ۱۱

۶۰۔ ایضاً، ص، ۱۳۹، ۱۴۰

۶۱۔ ایضاً، ص، ۱۰۳، ۱۰۴

۶۲۔ ایضاً، ص، ۱۷۴، ۱۷۵

۶۳۔ ایضاً، ص، ۱۵

۶۴۔ ایضاً، ص، ۹۱

۶۵۔ ایضاً، ص، ۱۵۰، ۱۵۱

۶۶۔ ایضاً، ص، ۵۲، ۵۳

۶۷۔ ایضاً، ص، ۱۳۲

۶۸۔ ایضاً، ص، ۸۰

۶۹۔ ایضاً، ص، ۱۳۴

۷۰۔ ایضاً، ص، ۱۶۳، ۱۳۴

۷۱۔ ایضاً، ص، ۱۱۸

۷۲۔ ایضاً، ص، ۱۰۸

۷۳۔ ایضاً، ص، ۱۵۷، ۱۵۸

۷۴۔ ایضاً، ص، ۹

۷۵۔ ایضاً، ص، ۱۷

۷۶۔ ایضاً، ص، ۹۱

۷۷۔ ایضاً، ص، ۱۱۴

۷۸۔ ایضاً، ص، ۱۱۶

۷۹۔ ایضاً، ص، ۱۴۸

۸۰۔ ایضاً، ص، ۱۷

۸۱۔ ایضاً، ص، ۱۴۰

۸۲۔ ایضاً، ص، ۱۳۴، ۱۳۵

۸۳۔ ایضاً، ص، ۱۸۵

۸۴۔ ایضاً، ص، ۱۹۵

۸۴۔ حافظ بصیر پوری، نالۂ شب، ساہیوال، مکتبہ گہوارۂ ادب، بصیر پور، ۱۹۹۶ء ص، ۴۳

۸۵۔ ایضاً، ص، ۵۰

۸۶۔ ایضاً، ص، ۵۲

۸۷۔ ایضاً، ص، ۵۳

۸۸۔ ایضاً، ص، ۶۰

۸۹۔ ایضا، ص، ۷۳

۹۰۔ ایضا، ص، ۸۴، ۸۵

۹۱۔ ایضا، ص، ۹۱

۹۲۔ ایضا، ص، ۱۲۴، ۱۲۵

۹۳۔ ایضاً، ص، ۱۲۷

۹۴۔ ایضا، ص، ۱۱۵

۹۵۔ ایضاً، ص، ۱۳۸

۹۶۔ ایضاً، ص، ۱۵

۹۷۔ ایضاً، ص، ۱۶

۹۸۔ ایضا، ص، ۱۶

۹۹۔ ایضاً، ص، ۱۹

۱۰۰۔ ایضاً، ص، ۲۲

۱۰۱۔ ایضاً، ص، ۲۷

۱۰۲۔ ایضا، ص، ۲۸

۱۰۳۔ ایضاً، ص، ۲۹

۱۰۴۔ ایضاً، ص، ۳۰

۱۰۵۔ ایضاً، ص، ۳۴

۱۰۶۔ ایضاً، ص، ۳۵

۱۰۷۔ ایضاً، ص۳۹

۱۰۸۔ ایضاً، ص، ۳۹

۱۰۹۔ ایضاً، ص، ۴۷

۱۱۰۔ ایضاً، ص، ۵۰

۱۱۱۔ ایضاً، ص، ۶۰

۱۱۲۔ ایضاً، ص، ۶۳

۱۱۳۔ ایضاً، ص، ۷۴

۱۱۴۔ ایضاً، ص، ۱۱۹

۱۱۵۔ ایضاً، ص، ۷۶

۱۱۶۔ ایضا، ص، ۷۶

۱۱۷۔ ایضا، ص، ۱۲۶

۱۱۸۔ ایضاً، ص، ۱۸

۱۱۹۔ ایضاً، ص، ۲۲

۱۲۰۔ ایضاً، ص، ۲۴

۱۲۱۔ ایضاً، ص، ۲۵

۱۲۲۔ ایضاً، ص، ۳۲

۱۲۳۔ ایضاً، ص، ۳۴

۱۲۴۔ ایضاً، ص، ۴۰

۱۲۵۔ ایضاً، ص، ۴۹

۱۲۶۔ ایضاً، ص، ۵۴

۱۲۷۔ ایضاً، ص، ۵۹

۱۲۸۔ ایضاً، ص، ۹۳

۱۲۹۔ ایضاً، ص، ۱۰۴

۱۳۰۔ ایضاً، ص، ۱۱۹

۱۳۱۔ ایضاً، ص، ۱۲۹

۱۳۲۔ ایضاً، ص، ۱۲۹

۱۳۳۔ ایضاً، ص، ۱۳۲

۱۳۴۔ ایضاً، ص، ۲۳

۱۳۵۔ ایضاً، ص، ۳۶

۱۳۶۔ ایضاً، ص، ۵۲

۱۳۷۔ ایضاً، ص، ۵۴

۱۳۸۔ ایضاً، ص، ۷۹

۱۳۹۔ ایضاً، ص، ۹۹

۱۴۰۔ ایضاً، ص، ۱۷

۱۴۱۔ ایضاً، ص، ۱۹

۱۴۲۔ ایضاً، ص، ۲۳

۱۴۳۔ ایضاً، ص، ۳۳

۱۴۴۔ ایضاً، ص، ۴۷

۱۴۵۔ ایضاً، ص، ۳۲

۱۴۶۔ ایضاً، ص، ۶۳

۱۴۷۔ ایضاً، ص، ۶۵

۱۴۸۔ ایضاً، ص، ۸۷

۱۴۹۔ ایضاً، ص، ۱۳۸

۱۵۰۔ ایضاً، ص، ۳۰

۱۵۱۔ ایضاً، ص، ۳۴

۱۵۲۔ ایضاً، ص، ۴۸

۱۵۳۔ ایضاً، ص، ۶۲

۱۵۴۔ ایضاً، ص، ۶۶

۱۵۵۔ ایضاً، ص، ۱۳۷

۱۵۶۔ ایضاً، ص، ۵۱

۱۵۷۔ ایضاً، ص، ۱۲۰

۱۵۸۔ ایضاً، ص، ۱۲۸

باب چہارم

پروفیسر حافظ بصیر پوری کی نثر فلسفہ جمالیات کی روشنی میں

(الف)

اس دیار میں (سفر نامہ حج)

سفر نامہ اور اس کی ابتدا

لفظ سفر نامہ عربی زبان سے ماخوذ لفظ "سفر" کے ساتھ فارسی لفظ "نامہ" لگانے سے مرکب "سفر نامہ" بنا۔ "سفر" کوچ کرنے اور اپنے مقام سے کسی اور جگہ جانے کو کہتے ہیں اور "نامہ" خط کو کہا جاتا ہے، جس کے معنی ہیں روزنامچہ، ڈائری یا بیاض کے ہیں، جس میں بالعموم سفر کے مشاہدات و حالات تاریخ وار درج کئے جاتے ہیں۔

سفر کی اہمیت

انسان کو زندگی میں اپنی قیام گاہ سے دوسرے مقامات کا سفر کرنا پڑتا ہے، اسی لئے قرآن و حدیث میں سفر کے احکام خاص طور سے ذکر کئے گئے ہیں، اور فقہ کی کتابوں میں بھی مسافر سے متعلق خصوصی احکام کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

> سفر کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم میں کی سورہ مبارکہ الانعام، النمل، روم اور عنکبوت وغیرہ میں "سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ" کے الفاظ کے ساتھ سفر کی ترغیب دی گئی ہے، نیز احادیث میں بھی بہت سے مقاصد مثلاً جہاد اور حصول علم وغیرہ کے لئے سفر کرنے کی فضیلتیں وارد ہوئی ہیں، اسی لئے انبیاء نے بھی اسفار کئے، صحابہ نے بھی، محدثین و فقہاء اور مبلغین و صوفیاء نے بھی، ان میں سے بہت سے اہل علم وہ ہیں، جنہوں نے اپنے واقعات سفر کو خود بیان کیا ہے، یا انہیں نقل کیا گیا ہے، خود قرآن مجید میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضرؑ کا سفر نامہ موجود ہے، کسی قدر اختصار کے ساتھ حضرت ابراھیمؑ اور حضرت موسیٰ کے اسفار کا بھی ذکر آیا ہے، حدیث میں ہجرت یعنی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک کے آپ ﷺ کے سفر کی تفصیلات اس خوبصورتی سے بیان

کی گئی ہیں کہ وہ واقعہ نگاری کا ایک شاہکار ہیں، خود رسول اللہ ﷺ نے
اپنے آسمانی سفر یعنی واقعۂ معراج کو تفصیل کے ساتھ نہایت خوبصورت
اور دلچسپ پیرایہ میں بیان فرمایا ہے، جو یقیناً ایک ادبی شہ پارہ کی
حیثیت رکھتا ہے۔

اگرچہ بعض احادیث میں سفر کو سقر قرار دیا گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی سفر چاہے کتنا ہی آرام دہ کیوں نہ ہو، تکلیف بہر حال ہوتی ہے۔

سفر نامہ کا مفہوم

سفر نامہ کا مفہوم یہ ہے کہ دورانِ سفر مسافر جن حالات سے دوچار ہوتا ہے اور جو کوائف اس کو پیش آتے ہیں انھیں وہ صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا ہے، دوسروں کو اپنے حالات سے باخبر کرتا ہے، کبھی اپنے حالاتِ سفر کو جمع کرتا ہے اور اس کو شائع کر دیتا ہے۔

اندازہ ہے کہ جس وقت انسان پتھروں اور غاروں میں رہا کرتا تھا، یقیناً وہ اپنی ضروریات کے لئے باہر نکلتا ہوگا، جانوروں کا شکار کرتا ہوگا، جانوروں سے اس کی کبھی کبھار جنگ وغیرہ بھی ہوتی ہوگی، کبھی وہ غالب اور کبھی مغلوب رہا ہوگا، جب وہ غالب ہوتا ہوگا تو اپنے ہم جنسوں کے پاس پہنچ کر یقیناً وہ حالات و کوائف سناتا ہوگا، اسی طرح کبھی وہ تکلیف دہ حالات سے دوچار ہوتا ہوگا تو وہ بھی ضرور اپنے ہم جنسوں سے بیان کرتا ہوگا، تو یہی درحقیقت سفر نامے کے آغاز کے دھندلے نقوش کہے جاسکتے ہیں۔

اردو میں اکثر مقامات مقدسہ کی زیارت کے سفر نامے ملتے ہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ مقاصد سفر میں ایک اہم مقصد مقاماتِ مقدسہ کی زیارت ہوا کرتا ہے، اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ حج وزیارت کی دیرینہ آرزو ہر مومن کے دل میں ہوتی ہے، اس کے علاوہ حج اسلامی زندگی کا رکنِ اعظم ہے، اس طرح کے اسفار کافی طویل انتظار کے بعد نصیب ہوتے ہیں، سفر کے آغاز میں اگرچہ اس کی اہمیت انفرادی ہوتی ہے، تاہم واپسی پر وہ اجتماعی اہمیت والا ہو جاتا ہے، ہر طرف سے سوالات اٹھتے ہیں، کیا دیکھے؟ کیا لائے؟ کیا حالات تھے؟ چنانچہ ان سفر ناموں میں ان جیسے سوالات کے جوابات ملتے ہیں، ۲۰۰۹ء میں کئے گئے ایک سروے میں کہا گیا تھا کہ اردو میں صرف حج کے سفر ناموں کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے، اس کے بعد یہ سلسلہ مستقل جاری وساری ہے اور اس تعداد میں مسلسل اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ اس سلسلہ میں ماضی قریب کے علماء میں حافظ منظور حسین بصیر پوری، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبد الماجد دریابادی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہم اللہ کے سفر نامے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ (ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی سفر نامہ، "روداد سفر حجاز)

سفر نامے کی ابتدا

تحقیقی طور پر یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ پہلا باضابطہ سفر نامہ کب اور کہاں لکھا گیا اور یہ کس نے تحریر کیا؟ یورو پین محققین یونانی سیاح ہیرو ڈوٹس (Hero Dotus) کو پہلا سفر نامہ نگار مانتے ہیں، تاہم اس کے سفر نامے کے بارے میں زیادہ معلومات ہم تک نہیں پہنچیں۔

دنیا کا سب سے پہلا دریافت شدہ باقاعدہ سفر نامہ یونانی سیاح میگس تھینز کا تحریر کردہ "INDICA" (سفر نامہ ہند) ہے، جو ہندوستان کے سفر کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس یونانی سیاح نے ۳۰۰ ق م ہندوستان کا سفر کیا تھا، اس زمانہ میں ہندوستان کا حاکم چندر گپت موریہ تھا، اس کا دارالحکومت "پاٹلی پتر" موجودہ "پٹنہ" تھا، محققین کا اتفاق ہے کہ اس کا یہ "سفر نامہ" انتہائی معلوماتی اور کار آمد سفر نامہ ہے، نیز یہ ایک تاریخی ماخذ بھی مانا گیا ہے۔

اردو میں سفر نامے کا آغاز وارتقا

جہاں تک اردو سفر نامہ کی روایت اور اس کے آغاز وارتقا کی بات ہے تو اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو کا سب سے پہلا باقاعدہ سفر نامہ یوسف خان کمبل پوش کا "تاریخ یوسفی" معروف بہ "عجائبات فرنگ" ہے، یوسف خان کمبل پوش اصلاً حیدر آباد کے متوطن تھے، لیکن لکھنو آکر مقیم ہو گئے اور نواب نصیر الدین کے دربار سے وابستہ ہو گئے تھے، نواب نصیر الدین کی اجازت سے انھوں نے ۱۸۳۷ء میں انگلستان کا سفر کیا اور رودادِ سفر کو جمع کر کے کتابی شکل دی، یہ سفر نامہ اردو کا پہلا سفر نامہ ہونے کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کی صفائی، بے ساختگی اور حقیقت نگاری کی وجہ سے ایک اہم ادبی شہ پارہ بھی ہے۔

اس دیار میں (سفر نامہ حج) حافظ منظور حسین بصیر پوری

حافظ منظور حسین بصیر پوری کا سفر نامہ حج ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہے یہ تصنیف ۲۰۰۷ء میں دوسری مرتبہ مکتبہ گہوارۂ ادب، بیت القرآن منظور اسلامک اکیڈمی بصیر پور اوکاڑہ سے شائع ہوئی۔ کتاب کے فلیپ پر ڈاکٹر معین نظامی سابق صدر نشین شعبہ فارسی اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور لکھتے ہیں:

"یہ سفر نامہ اس وقت لکھا گیا جب سفر نامہ نگاری کا شمار اردو ادب کی مقبول اصناف میں نہیں ہوتا تھا اور پیشہ ور لکھاریوں کی فوج ظفر موج سامنے نہیں آئی تھی۔ حجاز مقدس کے سفر نامے مقدار میں کم اور معیار میں چنداں قابل قدر نہیں تھے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کتاب ہماری ادبی روایت کا ایک ایسا درخشاں سنگ میل ہے جس سے صرفِ نظر کرنا عادلانہ رویہ نہ ہوگا۔ یہ کوئی روایتی سفر نامہ یا راہنمائے حج، عمرہ کا کوئی رسمی کتابچہ نہیں بلکہ ایک عملی اور ادبی وجدان اور بصیرت سے معمور شخصیت کی رودادِ فکر واشتیاق ہے جس کی سطر سطر حبِ

الٰہی سے اور عشق رسولؐ سے لبریز ہے۔

> اس کے لفظ لفظ میں ایسی تاثیر خفی موجزن ہے کہ تار رگ جان پر بے ساختہ لرزش کیف و مستی طاری ہو جاتی ہے اسے ان متبرک بلاد و آثار کی مستند تاریخ بھی کہا جا سکتا ہے اور وہاں کی سیاسی و سماجی، ثقافتی اور عوامی زندگی کے اہم پہلوؤں کا معتبر تذکرہ بھی۔ اس میں خارجی گرد و پیش کی یادگار منظر کشی کے ساتھ ساتھ داخلی مناظر کی دلنشیں عکاسی پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے اور مصنف نے اپنے احساسات و کیفیات کو جس وارفتگی اور برجستگی سے بیان کیا ہے وہ بلاشبہ قابل داد ہے اور یہی خصوصیت اس کا سرمایۂ امتیاز بھی ہے۔[۲]

اسلوب و زبان و بیان

مذکورہ سفر نامے کو دیکھا جائے تو اس کی زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے کسی جگہ پر کسی بھی طرح کی کوئی مرصع زبان نہیں ملتی، درست تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ دراصل باقاعدہ کوئی سفر نامہ نہیں یہ ایک عام روز مرہ ڈائری کے کچھ منتشر اوراق ہیں جن کو بعد میں جمع کر کے کتابی صورت میں شایع کر دیا گیا ہے۔ اس میں جو کچھ بھی بیان ہوا ہے وہ مصنف نے اپنی یادداشت کے طور پر نوٹ کیا ہوا ہے۔

انتہائی سادہ اور عام فہم زبان ہونے کے باوجود بھی قاری کو مسلسل باندھے چلا جاتا ہے۔ کتاب کے ابتدائی صفحات پر کچھ مرصع انشاء پردازی کی مثالیں ملتی ہیں لیکن یہ سلسلہ ساری کتاب کو محیط نہیں۔ کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصے میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی مختلف زیارات و مقامات کا سیر حاصل ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہاں پر مختلف اداروں اور لائبریریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ دوسرے حصہ مناسک حج کے بارے میں گائیڈ بک کے طور پر مرتب کیا گیا ہے جس میں مسائل احرام و طواف، مناسک حج اور حج کا طریقہ کار اور دعائیں شامل ہیں، اس کے ساتھ ہی حج و عمرہ کے مسائل بھی درج کئے گئے ہیں اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ "اس دیار میں" ایک مکمل اور جامع کتاب ہے جس کا مطالعہ ہر زائر کے لیے انتہائی سود مند ہو گا۔

مذکورہ کتاب میں متعدد مقامات پر قرآن و حدیث کے حوالے بھی پیش کئے گئے ہیں اور کچھ قلبی وارداتیں بھی سپرد قلم کی گئی ہیں۔ کتاب مذکورہ کو مرتب کرتے وقت مصنف یا تو مکہ مکرمہ میں مقیم تھے یا پھر مدینہ منورہ میں اس مسودہ میں ہر ایک بات وسیع جمال پر محیط ہے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حافظ صاحب نے وہاں بیٹھ کر جو کچھ بھی تحریر کیا، جو کچھ دیکھا اور اس پر تبصرہ کیا اس پر انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہوئے "واللہ اعلم" کے لفظ استعمال کئے ہیں، یہ اسلوب بیان آپ کو کسی اور سفر نامہ حج میں نہیں ملتا۔

مصنف کا زیادہ تر وقت مدینہ منورہ میں گزرا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں مدینہ منورہ کا ذکر زیادہ

ملتا ہے۔ مذکورہ کتاب میں مصنف نے عام طور پر کسی خاص عقیدے کا اظہار نہیں جو جمال کی ایک اضافی صورت ہے۔ البتہ بعض مقامات پر انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار ضرور کیا ہے کہ مسجد نبوی میں روضہ اقدس کی جالیوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دی جاتی اور یہ بھی کہ وہاں ڈیوٹی پر موجود اہلکار قوانین سے ہٹ کر زیادہ سختی کرتے ہیں۔

کتاب کی ابتدا ساہیوال سے کراچی تک ہونے والے سفر کے ذکر سے ہوئی ہے اور اس کے بعد کراچی سے بحری جہاز کے ذریعے جدہ روانگی اور راستے میں پیش آنے والے معاملات اور مشاہدات بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب میں جمالیات کے عناصر کے علاوہ رومانویت کے عناصر جیسے منظر نگاری، ماضی پسندی وغیرہ بھی موجود ہیں۔ جمالیات کا سب سے بڑا ماخذ قرآن و حدیث ہیں، اس کتاب میں قرآن و حدیث کے بھی متعدد حوالے موجود ہیں۔

کتاب چونکہ ایک روز مرہ ڈائری کی صورت لکھی جانے والی یادداشتوں پر مشتمل ہے اس لیے اس کتاب میں ہر اس چیز کا ذکر ملتا ہے جس کو جمالیات میں شامل کیا گیا ہے۔ اس میں جہاں وسیع و عریض سمندر اور اس کی کیفیات کا تذکرہ ملتا ہے وہاں موسم اور موسمی اثرات کا ذکر بھی موجود ہے۔

منظر نگاری

کتاب میں مختلف مقامات کی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت کو بھی ضمنی طور پر ذکر کیا گیا ہے جیسا کے کتاب کی ابتدائی سطور میں حیدر آباد اور کوٹری کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی کوٹری ریلوے سٹیشن پر پٹری کے ساتھ ساتھ موجود پتھروں کی چھوٹی سی دیوار بارے بھی بتایا ہے۔

حافظ صاحب لکھتے ہیں:

> حیدر آباد تک کا علاقہ میدانی سا ہے اور کہیں نہ کہیں ہر بھری فصلیں اور سرسبز و شاداب کھیت بھی نظر آجاتے ہیں لیکن اس سے ذرا آگے چھوٹے بڑے مختلف رنگوں کے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مختلف انداز کے ان پہاڑوں کا نظارہ اس سفر مقدس کے اکثر حصہ میں داخل ہے۔ ان پہاڑوں کے قدرتی مناظر خاصے جاذب نظر ہیں۔ کوٹری سے آگے ریلوے لائن کے دونوں طرف تقریباً تین فٹ اونچی پتھر کی دیوار شروع ہو جاتی ہے جو کراچی تک جاتی ہے۔ اب کہیں کہیں سے ٹوٹ چکی ہے۔ اس دیوار کے بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں سنیں مگر سب سے زیادہ ثقہ بات اس سندھی کی نظر آئی جس نے ٹوٹی پھوٹی پنجابی میں بتایا کہ یہ دیوار بھیڑوں اور بکریوں کو روکنے کے لیے بنائی گئی تھی کیونکہ جب پہلی مرتبہ انگریزوں کے عہد میں ریل کی پٹڑی بچھائی گئی تو ان علاقوں میں

بھیڑ بکریوں کے کثیر ریوڑ پٹڑی کی طرف ہی دوڑتے اور کچلے جاتے تھے
لہٰذا یہ دیوار حکومت نے بنوائی تاکہ رکاوٹ کے باعث جلدی سے آگے نہ
گزر سکیں۔ بہر حال اب نہ تو لائن کے ساتھ نہ تو بھیڑ بکریوں کے کثیر
ریوڑ ہی نظر آتے ہیں اور نہ ہی تمام دیوار سلامت ہے۔ تاہم دستِ زماں
اپنی تخریب کاریوں کے باوجود چھوٹے پتھروں کی اس دیوار کو مکمل طور
پر تاحال نہیں مٹا سکا۔[۳]

آگے چل کر صوبہ سندھ کے بارے میں رقم طراز ہیں

''صوبہ سندھ کے اس علاقے میں جو سینکڑوں مربع میل پر مشتمل ہے زقوم کی جھاڑیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا جو کالے ناگ کی طرح پھن پھیلائے ماحول پر ایک وحشت ناک تاثر پھیلا رہی ہیں۔ ہاں....... یہی زقوم ہے جو دوزخیوں کی خوراک ہوگا اور اسی سے انہیں پیٹ بھرنا ہوگا۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ۝ طَعَامُ الْأَثِيمِ ۝

اگر دیدۂ عبرت نگاہ ہو تو یہ منظر عیشِ دنیا سے دل سرد کرنے کے لیے
کافی ہے۔[۴]

سمندر میں جہاز رواں دواں ہونے کے بعد جب شام کا وقت ہوا تو جہاز کے عرشے سے غروب آفتاب کا خوبصورت منظر اور سمندر کی گہرائیوں میں اذان کی صداؤں نے جن کیفیات کو بیدار کیا ان لفظی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں۔

''آخر جب سورج اُفق پر ایک سنہری تھال بن گیا اور نیلگوں سمندر کی نقرئی موجوں میں سنہری کرنیں بکھرنے لگیں تو میں بالائی منزل کے اس بڑے کمرے کی طرف چل دیا جو مسجد کی حیثیت سے مخصوص تھا۔ دورانِ سفر امامت کے فرائض حجاج و حکام کی جانب سے میرے ذمے لگا دیئے گئے تھے، لہٰذا میں نے وضو کیا اور جب کشتیٔ خورشید سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئی تو جہاز کے سپیکر پر ندائے اللہ اکبر بلند ہوئی۔ اذانیں تو بارہا کہی اور سنی ہیں مگر اس اذان کے پس منظر میں جو تصور تھا وہ لاجواب تھا۔ سمندر کی پہنائیوں میں موذن کی ندا گونجی تو فضا ایک انجانے کیف سے معمور ہو گئی۔ چند آدم زادے پانی کے سینے پر تیرتے ہوئے اس خداوند جل وعلا کی کبریائی کا اعلان کر وارہے تے جس کی قوت تخلیق کا ایک شاہکار سمندر بھی ہے اور میں احساسِ شکر سے جھوم اُٹھا''۔[۵]

دورانِ سفر مصنف موصوف ہر چیز کی انتہائی گہرائی سے مطالعہ و مشاہدہ کرتے ہیں اور کسی فنکار کیطرح اس کو ہو بہو نقل کرتے ہیں اور ان مناظر کو اس طرح قلم بند کرتے ہیں کہ قاری بلا تامل یہ محسوس کرتا ہے جیسے وہ خود انہی سمندروں کا مسافر ہو۔ وہ نہ صرف عمیق مشاہدہ کرتے ہیں بلکہ اس بارے میں سیر حاصل معلومات اور دوسرے لوگوں کی رائے بھی پیش کرتے ہیں جس سے قاری کو بہر حال علمی فوائد پہنچتے ہیں۔ سمندر میں پانیوں

کے رنگ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"پہاڑوں کی طرح سمندر کے پانی کی بوقلمونیاں بھی سرمایۂ حیرت ہیں۔ کراچی کے نواحی سمندر کی رنگت سبز ہے۔ دوسرے اور تیسرے روز جہاز نیلگوں پانی میں تیرتا ہے۔ چوتھے اور پانچویں روز ایسے علاقے سے گزرتا ہے جہاں پانی کی رنگت تار کول کی طرح سیاہ ہے اور بحیرۂ احمر کا پانی سرخی مائل ہے۔ چھٹے اور ساتویں روز پانی دوبارہ نیلگوں نظر آتا ہے اور جدہ کا نواحی سمندر پھر سبز ہے۔ طرفہ یہ کہ جب پانی نل کی ذریعے سمندر سے کھینچا جاتا ہے تو ہر جگہ سفید آبی رنگ ہی ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں یہ آسمان کے عکس کی وجہ سے ہے، لیکن یہ عکس تو پانی کو نیلگوں دکھلا سکتا ہے، سیاہی اور سرخی و سبزی کون سے عکس سے صورت پذیر ہوتی ہے؟ کچھ کہتے ہیں کہ پانی کی گہرائی رنگ بدلتی ہے یعنی جیسے گہرائی زیادہ ہوتی جاتی ہے پانی سبز سے نیلا اور سرخ و سیاہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کچھ نئے علوم سے روشن دماغ یہ بھی سوچتے ہیں کہ کرۂ ارض کے مختلف حصوں کے کیمیاوی اجزاء کا قدرے تفاوت رنگوں کو مختلف کر رہا ہے۔

> رنگوں کی طرح مختلف علاقوں کے سمندری پانی کا ذائقہ بھی مختلف ہے۔ کسی جگہ زیادہ کڑوا اور کسیلا ہے کسی جگہ نسبتاً گوارا۔ کہیں زیادہ کھاری اور کہیں کم۔ کسی جگہ قابلِ نوش ہے اور کسی جگہ ہرگز نہیں۔ مگر یہ سمندر کے مختلف پانی آپس میں مل کیوں نہیں جاتے؟ وہ کون سے حجاب ہیں جو ان کے اختلاط کو روکے ہوئے ہیں؟ یہ باڑیں گو نظر نہیں آتیں مگر ہیں سہی۔ ہم دیکھتے نہیں مگر مانتے تو ہیں۔ وہ اس لطیف صناع کی بنائی ہوئی ہیں جس کی کاریگری کے سامنے جہانِ فکر و ہنر دم بخود ہے۔"[۶]

حافظ بصیر پوری مسلکی اعتبار سے اہلسنت والجماعت سے تعلق رکھتے تھے اور آمین بالجہر یعنی اونچی آواز میں آمین کہنے کے قائل نہیں تھے لیکن جب عرب کی مساجد اور خاص طور پر حرم کعبہ میں آمین بالجہر کا جو منظر الفاظ میں پیش کرتے ہیں اس کو پڑھ کر ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے جو تادیر رہتی ہے۔

حافظ صاحب لکھتے ہیں:

> ہمارے ہاں تو پوری صف میں جب ایک آدھ آدمی آمین بالجہر کہتا ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے ڈنڈا مارا ہو۔ مگر یہاں چونکہ ہزاروں بالجہر کہتے ہیں لہٰذا ایک طویل اور مترنم آواز پیدا ہوتی ہے۔ نماز مغرب و عشا میں جبکہ کعبہ کے گرد لاکھوں انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا اور بھیگی بھیگی شام میں ماحول پر کیف برستا تو یہ آواز کتنی دلکش اور حسین بن جاتی بے خود ہو کر میں خود بھی شامل ہو جاتا.......... یہ

لذت یگانگت کے باعث ملتی تھی۔ ۷

حافظ بصیر پوری نے ذکر کیا ہے کہ عرب واحد اسلامی ملک ہے جہاں اسلامی حدود و قیود نافذ ہیں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ زانی کو سنگسار کیا جاتا ہے اور قاتل پر قصاص عائد کیا جاتا ہے۔ عرب میں جمعہ کے روز جامعہ مسجد کے باہر بعد از نمازِ جمعہ قاتل کا سر قلم کیا جاتا ہے جس کا اعلان بھی ہوتا ہے اور لوگوں کو اس جگہ جمع ہو کر یہ منظر دیکھنے کی تاکید کی بھی جاتی ہے، اس موقعہ پر ایک جم غفیر موجود ہوتا ہے اور وہاں پر آئے روز یہ سلسلہ کار جاری رہتا ہے۔

اسی حوالے سے حافظ صاحب نے ایک خون بہا مسترد ہونے کے بعد قاتل کو سزائے موت دیئے جانے کا ایک منظر پیش کیا ہے۔

''جمعۃ المبارک پتا چلا کہ باب الاسلام مسجد نبوی کے باہر میدان میں ایک قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ چنانچہ ہم بھی وہاں پہنچ گئے۔ دیکھا کہ چاروں جانب ایک وسیع حلقے میں انسانوں کا جم غفیر ہے اور اس کھلے دائرے کے مرکز میں ایک ایمبولینس کھڑی ہے۔ اس کے قریب ہی قاضی القضاۃ، ایک ڈاکٹر، ایک جلاد اور چند ادنیٰ ملازمین کھڑے ہیں۔ ایک حبشی النسل شخص کے پشت پر ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور زمین پر بیٹھا ہے۔ سر پر سرخ رنگ کا ایک چھوٹا سا رومال ہے۔ معلوم ہوا کہ اس نے اپنے چچا کو قتل کیا ہے۔ مقتول کے وارثوں کو ایک لاکھ بیس ہزار ریال خون بہا دینے کی پیشکش کی گئی ہے مگر انہوں نے قبول نہیں کیا۔ اس لیے اب اسے قتل ہی کیا جائے گا۔

> تھوڑی دیر کے بعد قاضی نے گھڑی پر اک بار ٹائم دیکھا، دوبارہ پھر دیکھا اور جلاد کو اشارہ کیا، جلاد نے تلوار فضا میں بلند کی اور وار کیا۔ چونکہ انبوہِ کثیر اور فاصلہ طویل تھا اس لیے اندازہ نہ ہو سکا کہ تلوار کے وار کہاں لگے۔ مقتول منہ کے بل ہی زمین پر گرا اور خون کا فوارہ چھوٹا۔ صرف چند لمحوں کے بعد ڈاکٹر نے قریب ہو کر معائنہ کیا اور کوئی دوا زخموں پر لگائی۔ ادنیٰ ملازمین نے فوراً لاش کو اٹھا کر ایمبولینس میں ڈالا اور زمین پر گرے ہوئے خون کو صاف کر دیا اور پھر سب گاڑی میں سوار ہو کر چل دیئے۔ ایک منظر تھا .... غائب ہو گیا .... مگر کیسا منظر، ہیبت ناک، لرزہ براندام کرنے والا منظر .... میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی .... چہرے زرد .... رنگ فق .... آنکھیں وحشت زدہ .... واقعہ گزر چکا تھا مگر مجمع پر تاحال خوفناک قسم کا سناٹا طاری تھا۔ بعض ہونٹوں سے بے اختیار نکلتی ہوئی استغفار اور توبہ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ خود میرا دل

بھی بیٹھا جا رہا تھا اور پاؤں لڑکھڑاتے تھے۔ یہ سب اس ہولناک منظر کا تاثر تھا۔۸

حافظ صاحب کی منظر نگاری میں ہمیں ہمہ وقت تشبیہات بھی ملتی ہیں اور لطیف احساسات بھی، موسموں کا ذکر بھی اور دین کی فکر بھی محبت بھی ہے اور احتیاط بھی۔

مدینہ کے موسم اور مسجد نبوی ﷺ میں اعتکاف کے ایام کی منظر کشی یوں کرتے ہیں:

> مدینہ کا موسم سدا بہار ہے۔ خزاں یہاں شاید کسی وقت صرف سلام کے لیے ہی آتی ہوگی جیسے گرمی اور سردی بھی بعض اوقات سلامی کے لیے حاضری دیتی ہے کیونکہ حضور کے مہمانوں کو تنگ کرنے کی کسی کو اجازت نہیں۔ جب تک مدینہ شریف میں رہے یہی عالم دیکھا۔ جب قدرے گرمی محسوس ہونے لگتی تو تھوڑی سی بارش ہو جاتی یا ٹھنڈی ہوا چلنے لگتی۔ یار لوگ سردی سمجھ کر سویٹر پہن لیتے۔ جب سردی کا احساس بڑھنے لگتا تو فضا میں ہلکی سی حرارت پیدا ہو جاتی اور ہم اسے گرمی کا نام دے لیتے۔ ذرا تصور کیجئے کہ نومبر کے مہینے میں بھی مسجد نبوی میں شام تک پنکھے چلتے رہے۔۹

اسی طرح ایک مقام پر مسجد نبوی کے ایک خوبصورت منظر کو یوں قلم بند کرتے ہیں:

> اعتکاف کے دنوں میں جب رات اپنے بھیگے بھیگے گیسو مدینہ کے در و دیوار پر پھیلا دیتی تو درمیانی برآمدہ کے اگلے حصہ میں ستون کے ساتھ بستر لگا کر لیٹے لیٹے میں بارہا یوں محسوس کرتا جیسے دنیائے حسن میں بیٹھا ہوں۔ اگر اجالے میں کمال و جلال و زیبائی نظر آتی تھی تو اندھیرے میں بھی بے مثل جمال و رعنائی پائی جاتی تھی .... اس عالم میں جب آنکھیں نیند سے بھر جاتیں اور اُونگھ اُونگھ کر دوبارہ کھلتیں تو یوں محوس ہوتا جیسے کوئی حسین سپنا دیکھ رہے ہوں۔۱۰

سمندر میں سفر کے دوران کچھ مناظر ایسے خوبصورت اور جاذب پیش کئے گئے ہیں کہ بے اختیار قدرت الٰہی کی طرف نگاہ جاتی ہے اور ان مناظر میں قاری کھو کر رہ جاتا ہے حافظ صاحب لکھتے ہیں:

"میں نے بارہا جہاز کی ناصیہ پر کھڑے ہو کر کم و بیش دس دس بارہ بارہ من وزنی مچھلیوں اور کچھوؤں کو جہاز کے اطراف پر حملہ کرتے ہوئے اور منہ کی کھا کر پیچھے دوڑتے دیکھا ہے۔ اگرچہ انہیں اپنی قلمرد کی حفاظت کا حق حاصل ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ زبردست ہمیشہ سے ہی کمزوروں کا حق دباتے چلے آئے ہیں اور کمزوروں کو بادلِ

نخواستہ مصالحت کرتے ہی بنی ہے۔ چنانچہ یہ مچھلیاں بھی آخر کار تھک ہار کر مصالحت آمیز انداز سے جہاز کے ساتھ ساتھ ایک جلوس کی شکل میں چلتی ہیں۔

ان مچھلیوں سے تو وہ سفید پرندے ہی فائدے میں رہتے ہیں جو سمندر کے سینے پر گھنٹوں آرام سے بیٹھے رہتے ہیں اور جہاز کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ البتہ جب جہاز گزر جائے اور اپنے پیچھے دونوں طرف حجاج کرام کی سخاوت کے نقوش جہاز کے مطبخ کی بے ذائقہ روٹیوں اور نیم پختہ چاولوں کی صورت میں چھوڑ جائے تو اپنا حصہ بزور چونچ مچھلیوں سے چھین لیتے ہیں۔[11]

حافظ بصیر پوری اپنے گردو پیش گزرتے ہوئے ہر چیز اور ہر عکسِ جمیل کو انتہائی شوق و ذوق سے دیکھتے اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہوئے نظروں کے سے قید کرتے اور پوری مہارت کے ساتھ عمیق جزیات نگاری کے ساتھ قرطاس پر اتارتے ہیں۔

مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو:

میں جہاز کی بالائی منزل پر کھڑا ماحول کی سحر انگیزی کا شکار ہو رہا تھا کہ اچانک جہاز کے نہایت قریب دائیں جانب ایک چھوٹی سی پہاڑی سمندر میں سر اٹھائے ہوئے نظر آئی اور اس کے متصل ہی بائیں جانب ایک اور پہاڑی بھی دیکھائی دی۔ جہاز ان دونوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ جہاز کے حکام سے معلوم ہوا کہ دائیں طرف والی پہاڑی کا نام جبلِ بو علی ہے اور بائیں کا نام جبلِ زبیر ہے۔ میں نے دوبارہ جبلِ بو علی پر نظر ڈالی اور اس ننھی سی پر اسرار چٹان کی رعنائی میں کھو گیا۔ غور سے دیکھا تو اس چٹان پر ایک چھوٹی سی پتھروں کی مسجد نظر آئی۔ نہ جانے کس مردِ مومن نے انتہائی مشقت اٹھا کر اس جگہ خدائے بحر و بر کا گھر تعمیر کیا، حالانکہ سمندر کی اس ناف میں پہنچ کر چٹان پر چڑھنا اور پتھر اٹھا اٹھا کر اس بلندی پر مسجد کی عمارت تعمیر کروانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اگرچہ وہاں آکر کوئی انسان اوقاتِ نماز میں عبادت نہیں کرتا ہوگا مگر مجھے ایک ایک پتھر سے صدائے اللہ اکبر سنائی دے رہی تھی۔ میں ان خیالات میں یوں ڈوب گیا کہ مجھے سچ مچ اذان کی آواز سنائی دینے لگی۔

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا اور میں دفعتاً چونک اٹھا۔ دیکھا کہ جہاز آہستہ

آہستہ چٹان سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر گزر رہا ہے۔ میرا جی چاہا کہ کاش چند منٹ کے لیے جہاز جبلِ بو علی کے ساتھ رک جائے اور میں سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں قدم گاڑے ہوئے اس پہاڑی پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے اذان کہوں جس کی صدائے بازگشت فضا کی وسعتوں اور سمندر کی پہنائیوں میں گونج جائے مگر میں بے اختیار تھا۔ جہاز آگے بڑھ گیا اور میں حسرت وارمان کا طوفان دل میں دبائے نیچے اتر آیا۔۱۲

ذوق و شوق، احساسات اور حوالہ قرآن و حدیث

مصنف نے بتایا کہ کراچی سے جدہ تک کا سفر کچھ آٹھ روز میں مکمل ہوا اور اس سفر کے دوران وہ اپنے استاد مکرم مولانا محمد نوراللہ صاحب نوراللہ مرقدہ سے مسائل حج و زیارت سنا کرتے اور ان مجالس میں بعد از عصر یا عشاء وہ خود بھی درس قرآن دیتے رہے اور کبھی کبھی نعت خوانی کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ ان کیفیات کا ذکر کرتے ہوئے حافظ بصیر پوری لکھتے ہیں:

چاہے موضوع کوئی بھی ہوتا حاضرین کی والہانہ ادائیں اور ماحول کی مسحور کن فضائیں تقریر کے رخ کو موڑ کر ذوق و شوق، سوز و گداز اور رقت و محبت کے عالم کیف و نور میں لے جاتیں۔ چاندنی راتوں میں جب سمندر سنہری صحرا کی طرح نظر آتا اور شفاف پانی کے سفید ریشوں میں سنہری کرنوں کے تار و پود بُنے ہوئے دکھائی دیتے تو جہاز کی بالائی منزل پر مسجد کے وسیع ہال میں بزمِ یاراں سجتی اور لہروں کا ارتعاش جب ایک کیف آگیں نغمگی پیدا کرتا تو نعتِ مصطفیٰ ﷺ اور شانِ خدا کے مضامین پر مشتمل آیاتِ فرقانیہ کی تلاوت کا ترنم فطرت کے اس سازِ دلنواز کا حصہ بن جاتا۔۱۳

ویسے تو مذکورہ کتاب پوری کی پوری ہی مرقع جمال ہے اور ہر ہر سطر ذوق و شوق سے بھری پڑی ہے۔ حج کے متعدد سفر نامے دستیاب ہیں مگر جو معلومات اور جو جاذبیت اس کتاب میں ہے اس کی دیگر مثال بہت کم ہی ملیں گی۔ کتاب مذکور میں دیگر کتب کی طرح قرآن و حدیث کے حوالے موجود ہیں۔

حوالہ قرآن

مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے وقت وہاں پر موجود مختلف کتبوں کا ذکر کرتے ہوئے حافظ صاحب بیان کرتے ہیں:

''کچھ سفر طے کرنے کے بعد سڑک کے کنارے ایک عریض ستون نظر آیا جس پر انگلش اور عربی میں

لکھا تھا ھذا حد الحرم۔ یہ اس بات کا نشان ہے کہ اس سے آگے جو علاقہ ہے اسے شہنشاہِ کائنات کے دربار سے بلا تمثیل وہی نسبت ہے جو ایوانِ صدر کے چاروں طرف پھیلے ہوئے علاقہ کو ایوانِ ڈر سے ہوتی ہے اور جسے روزمرہ زبان میں Prohibited Area کہا جاتا ہے۔

کرۂ ارضی کے اس ٹکڑے کی منفرد حیثیت ہے۔ اس خطہ کی شان پر متعدد آیاتِ قرآن شاہد ہیں:

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا یُّجْبٰۤى اِلَیْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا ۔۱۴

(سورۃ الروم)

نبی کریم ﷺ سے اپنی محبت کا اظہار ہر جگہ اور ہر طرح سے کرتے ہیں لفظوں کا چناؤ بہترین اور ایک ہی عبارت میں شہر مکہ اور کی تعظیم، پیغمبر آخر الزماں کی محبت کو ایک ہی جملے میں بیان کرتے اور تعظیم مکہ مکرمہ کے اثبات میں حسب سابق آیتِ قرآنی سے حوالہ پیش کرتے ہیں:

"کیا یہی شہر ہے جسے محبوبِ خدا کا مولد ہونے کا شرف حاصل ہوا؟ اسی جگہ ربِ کائنات کا گھر ہے؟ اسی شہر امین کی قسمیں خدا کھاتا ہے۔ اسی پر خالقِ کائنات کی نظر انتخاب پڑی تھی؟ ایسے ہی تصورات میں منہمک شہر مکہ معظّمہ میں دخول ہوا۔ یہ روز جمعہ تھا۔ پاکستانی وقت کے مطابق ۱۲ بجے تھے۔ جا بجا مختلف کتبے نظر آتے تھے جو طرفہ بشارتیں دیتے تھے۔ مثلاً

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ ۝ ۱۵ (سورۃ الفتح)

حافظ صاحب کے اسلوب کی ایک خوبصورتی اور جمال یہ بھی ہے کہ وہ بہت ہی باتوں کو ایک ہی جگہ جمع کرتے اور پھر اس بارے میں آیات سے تصدیق کرتے ہیں وہ نا صرف علاقے کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتے ہیں بلکہ چلتے چلتے ضمنی طور پر دیگر اہم معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔ جیسا کہ ایک جگہ ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام کا ضمناً ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> دُور ایک طرف مسجد نمرہ نظر آرہی تھی اور دوسری جانب ایک ننھا سا پہاڑ "جبلِ رحمت" نظر آرہا تھا۔ ہاں وہی پہاڑ جس پر حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی۔۱۶

آگے چل کر سرخ سفید اور سیاہ پہاڑوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان پہاڑوں کے بارے میں قرآنی آیت سے حوالہ بھی پیش کرتے ہیں حافظ صاحب لکھتے ہیں:

> اب ہم براہ راست طائف روڈ پر رواں دواں تھے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں ببول کا درخت یا آک کے پودے نظر آتے۔ جا بجا سنا مکی

کے پودے بھی ملتے تھے۔ کبھی کبھار کئی ی یا گھاس کا کوئی پلاٹ نظر پڑ جاتا۔ مکہ سے ۲۶ کلومیٹر پر وادیٔ شداد واقع ہے۔ یہاں سے آگے بو قلموں پہاڑوں کے سلسلے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ رنگ برنگ پہاڑ مرورِ زماں کے حادثات کے امین ہیں جنہوں نے از آدم تا ایں دم بے شمار انبیائے کرام کے قدموں کو بوسے دیئے اور بڑے بڑے مغرور شہنشاہوں کی رعونت جن کے سامنے خاک میں ملی۔ جیپ پہاڑوں کی بلندی کے ساتھ ساتھ خمِ کاکل کی مانند پیچاں سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ کہیں گول پتھروں کا علاقہ آجاتا اور کہیں سرخ و سفید اور کالے پہاڑ قرآن پاک کی تفسیر کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ۔ ۱۷

صفا و مروہ کی سعی کے دوران کیا ہی روح پرور مناظر ان پر وارد تھے اس کا ذکر کرتے ہوئے حافظ صاحب بہت زیادہ جذباتی نظر آئے خاص طور پر حضرت بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس رات سعی میں کیا لطف آیا! دوران سعی سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا تصور غیر معمولی طور پر جا گزیں تھا۔ ماں کی محبت کے جذبات دل میں اترے تھے زمزم کے پاس عالم تخیل میں ایک ننھا سا وجود لیٹا ہوا نظر آرہا تھا جیسے ایک ماں اپنے لختِ جگر کو بچانے کے لیے بے قراری سے دوڑ رہی ہو۔ سورۂ ابراہیم کے اس مخصوص رکوع کی عبارت بلند آواز سے تلاوت کرتا تھا جس میں حضرت ابراہیم اپنے اہل و عیال کو اس سرزمین بے آب میں چھوڑنے کا ذکر کر کے اظہار عبودیت کرتے ہیں۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۱۸

نبی کریم ﷺ کے روزہ اقدس پر حاضری کے وقت ہر مسلمان عجیب و غریب وجدانی کیفیات سے گزرتا ہے اس کا ادراک ہر زائر کو ہوتا ہے مگر اس کیفیت کو سمجھنے اور بیان کرنے کا ملکہ پانا ذرا مشکل سا کام لگتا ہے کیونکہ کیفیات کو لفظوں میں بیان کرنا کسی کہنہ مشق لکھاری کا کام ہوتا ہے اور پھر اگر یہ کیفیات محبتِ رسول ﷺ کے بارے میں ہوں تو عام طور پر ہمارے ذہن و قلب میں وہ ہم آہنگی پیدا نہیں ہو پاتی کہ یکسو ہو کر لفظوں کے موتی پرو لیے جائیں۔ ایسی ہی کیفیت کا ذکر ملاحظہ فرمائیں

''جب ذرا محبت کا نشہ کم ہوتا اور فکر کا سمندِ تیز رو اپنی جولانی دکھانے لگتا تو معاً عقل کہتی ''ارے سامنے

دیکھ! محبوب خدا کا گھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بارگاہِ سرورِ کائنات۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور وہ دیکھ سراپردۂ اخضر۔ ابھی ہٹے گا اور اک نگارِ نازنین مسکراتا ہوا باہر دیکھے گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ زہے قسمت۔۔۔۔۔ ذرا سوچ تو سہی کہ تو کون ہے۔ وہی منظور جو بصیر پور کی گلیوں میں کھیلا کرتا تھا" اور پھر سلسلۂ خیال کی کڑیاں بچپن کی معصوم غلطیوں سے شروع ہو کر بلوغت اور جوانی کے ان گناہوں تک پہنچ جاتیں جہاں شہرت علم و فضل اور عظمتِ منبر و محراب منہ چھپا کر روتی ہے۔ پھر احساس ندامت کے دریا میں غوطے کھاتا۔ ہاتھ پاوں مارنے لگتا۔ مگر سارے وسیلے تنکے دکھائی دیتے جو قریب تو آتے مگر سہارا نہ دے سکتے اور پھر نظر دوبارہ گنبد خضرا پر جا پڑتی اور کانوں میں ہاتف غیب کی صدا گونجتی

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝۱۹

کسی بھی مومن کے دل میں یہ خواہش ہر وقت اور ہر دم تازہ رہتی ہے کہ زندگی میں اسے ایسا موقع ملے کہ وہ حرم نبی ﷺ کے در و دیوار اپنی پلکوں سے صاف کرتا پھرے ہر مسلمان اس بات کی شدید ترین خواہش رکھتا ہے اور یہی ذوق و شوق لیے حافظ بصیر پوری بھی مدینہ میں حاضر ہوئے اور کسی موقع کی تلاش میں رہے کہ کب یہ سعادت نصیب ہو، پھر انہیں یہ سعادت دارین نصیب ہوئی جس کو انہوں نے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے

کئی روز سے تمنا تھی کہ مسجد نبوی کے جاروب کشوں میں نام لکھوایا جائے لیکن یہ خوش بخت حضرات شریک کار نہ ہونے دیتے۔ آخر ایک روز منت سماجت سے ایک صاحب کو آمادہ کر ہی لیا اور ان سے جاروب شریف لے لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ اپنے مقدر پر جھوم اٹھے اور والہانہ انداز سے ریاض الجنۃ میں آنکھوں سے چھڑکاؤ کرتے رہے اور جاروب کے تنکوں کو پلکوں کے قائم مقام کرکے جھاڑو دیتے رہے۔

؎ بروییم از مژہ خاکِ درِ یار

اُمید ہے کہ ادھر ہم جھاڑو دے رہے تھے ادھر کارکنانِ قضا و قدر ہمارے گناہوں کو جھاڑ و دے رہے ہوں گے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝۲۰

واپسی کے سفر کا حال قریب افسردہ ہے جس کو عام لفظوں میں بہت زیادہ ظاہر نہیں کیا گیا اور نہ ہی اس میں کوئی تکلیف اور جدائی کا غم بیان کیا گیا ہے یہاں پانچ روزہ طغیانی کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔

"واپسی سفر میں تقریباً پانچ روز سمندر میں طغیانی رہی۔ لہروں کا مدو جزر اور ہواؤں کا زور شور کبھی بڑھ جاتا اور کبھی قدرے کم ہو جاتا۔ ایک روز شام کے وقت میں جہاز کی بالائی منزل پر چلا گیا وہاں ایک سٹوئرڈ محمد ارشاد سے جہاز کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے لگا۔

ابھی ہم باتوں میں مشغول تھے کہ اچانک ہوائیں بہت تیز ہو گئیں اور جہاز غیر معمولی طور پر ہچکولے کھانے لگا میں مسجد میں چلا گیا اور بیٹھ کر نماز مغرب ادا کی کیونکہ چکر بہت زیادہ محسوس ہوتے تھے۔ پھر وہیں

عشاء کی نماز ادا کی اور اپنے ٹھکانے پر پہنچے اور لیٹ گئے۔ یہ رات کتنی تاریک اور بھیانک تھی؟ غیر معمولی آندھی اور جھکڑ چل رہے تھے۔ جہاز کبھی تحت الثریٰ میں اترتا اور کبھی آسمان پر چڑھتا تھا۔

میں نے سونے کی حتی المقدور کوشش کی مگر دو تین گھنٹے کی اونگھ کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ یہ رات اسی طرح الامان والحفیظ کہتے گزری۔ اگلے روز عصر تک یہی حالت رہی شام تک سمندر میں سکون آگیا۔ یہ سمندر میں آخری رات تھی۔ اس لیے احباب کے تقاضے پر میں نے الوداعی تقریر کو وصیت کا رنگ دے کر خوفِ خدا اور تقویٰ کے موضوع پر ایک گھنٹہ بیان کیا۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى

○ (سورۃ النازعات) ۲۱

حوالہ احادیث مبارکہ

کتاب ہذا کا دوسرا حصہ میں اعمال اور دعائیں بیان ہوئی ہیں تمام کتب احادیث میں سے ہی لی گئی ہیں جن کا ذکر خیر کیا جائے تو اس کے لیے الگ سے دفاتر درکار ہوں گے البتہ یہاں کچھ احادیث بطور حوالہ و نمونہ پیش کی جا رہی ہیں۔

جنت عدن مفتحۃ الابواب ۔۲۲

الصلوۃ عماد الدین ۔۲۳

مسجد نبوی اور حرم کعبہ کی توسیع کا سیر حاصل ذکر بھی کتاب میں موجود ہے جس کو ایک طرح سے تاریخ کا اجمالی ذکر کیا جائے گا انہی ابواب میں ریاض الجنتہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک عمدہ حدیث بیان فرماتے ہوئے ایک بہت اہم اور ایمان افروز نکتہ بھی بیان کیا ہے

حافظ بصیر پوری لکھتے ہیں:

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ میرے گھر اور میرے منبر کی درمیانی جگہ بہشت کے باغوں میں ایک ایک باغ ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں

ما بین بیتی و منبری روضۃ من ریاض الجنۃ و منبری علی ترعۃ حوضی

گویا اس مقدس حصہ میں داخل ہونا اور نماز پڑھنا ایسے ہے جیسے جنت میں داخل ہو کر نماز پڑھی جائے۔ اس حصے کی سب سے اہم نشانی یہ ہے کہ اس حصہ کے ستون قد آدم تک سفید منقش سنگ مرمر کی شکل میں ہیں اور اوپر سے سرخ ہیں۔ ریاض الجنتہ کے قالین فرشی بھی سبز اور

رنگ کے ہیں باقی مسجد میں سرخ قالین ہیں۔ اس حصہ کے اکثر ستون
نہایت مبارک اور اعلیٰ نسبتوں کے حامل ہیں۔ ۲۴

ہمارے ہاں بہت سے مسالک موجود ہیں جن میں حنفی، مالکی، حنبلی، شافعی اور جعفری وغیرہ شامل ہیں۔ حافظ بصیر پوری مسلکی اعتبار سے اہل سنت والجماعت (بریلوی) کے پیروکار رہے مگر ان کے ہاں ایک بہت ہی عمدہ رویہ ملتا ہے کہ انہوں نے دیگر عام مولویوں کی طرح اپنے مسلک کو ہی حق پر قرار نہیں دیا جو اس کتاب کا ایک اہم اور خوبصورت ترین نکتہ ہے اس سلسلہ میں انہوں نے ایک حدیث بیان کی ہے جس سے تمام مسالک کے حق ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

حافظ صاحب لکھتے ہیں:

"حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔ ۲۵

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ حافظ بصیر پوری کہیں بھی اپنے مسلک کو اعلیٰ و ارفع بنا کر پیش نہیں کرتے جیسا کہ ہمارے ہاں لوگوں میں عام رویہ ہے انہوں نے جب جہاں جو بات بھی کی اس کے لیے قرآن و حدیث سے حوالہ لازمی پیش کیا ہے رمضان المبارک میں حرم کعبہ میں تراویح کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

دو روز نماز تراویح حرم کعبہ میں پڑھنے کا موقع میسر آیا۔ یکم رمضان ہونے والی تھی مگر عشاء تک چاند کا اعلان ہی نہ ہوا۔ عشاء کے فرض ادا کر رہے تھے اور گمان تھا کہ چاند دکھائی نہیں دیا کہ اچانک کئی توپیں داغی گئیں۔ فرضوں کی ادائیگی کے فوراً بعد امام صاحب مقام ابراہیم سے مصلے اُٹھا کر مستجاب میں آ گئے اور کچھ فاصلہ طواف کرنے والوں کے لیے چھوڑ کر نماز تراویح شروع کر دی۔ ادھر نماز تراویح شروع ہوئی ادھر محرمان راز طواف کرنے لگے۔ خیر .... شرعی نکتہ نگاہ سے یہ جائز ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ
الطواف حول البیت کالصلوۃ (کعبے کے گرد طواف نماز کی مانند ہے)
لیکنیہ نکتہ تو بعد میں کھلا کہ یار لوگوں نے تراویح پر طواف کعبہ کو ترجیح کیوں دی۔ اسے کہتے ہیں آم کے آم گٹھلیوں کے دام .... ایک تو پرسکون عالم میں طواف کرتے رہے اور حجرِ اسود کے بوسے لیتے رہے۔ دوسرے اس امتحان سے بچ گئے جس میں ہم پڑ چکے تھے۔ ۲۶

ہمارے ہاں بعض اصحاب اور علما عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم مدینہ طیبہ میں حاضر ہوں تو صرف

مسجد نبوی میں حاضر رہیں کیونکہ ان کے نزدیک بازاروں وغیرہ میں پھرنا اور کچھ خرید و فروخت کے امور انجام دینا درست طریقہ کار نہیں ہے اس سلسلہ میں انہوں نے ایک تبلیغی جماعت کے کارکن کا مفصل ذکر کیا ہے کہ کس طرح وہ لوگوں کو مسجد میں رہنے کی ترغیب دلا رہا ہے اسی ایک رکن نے حافظ صاحب کے استاد مکرم کو بھی مسجد نور جو کہ تبلیغی جماعت کی تربیت گاہ ہے میں چلنے کی دعوت دی۔ حافظ صاحب نے اپنے استاد مولانا ابوالخیر محمد نوراللہ نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے مندرجہ ذیل واقعہ نقل کیا ہے کہ کس طرح ایک شخص لوگوں کو بازاروں میں جانے سے روکتے ہوئے کہتا ہے کہ بازار بدترین جگہ ہیں۔

"دیکھئے آپ لوگ جب مدینہ جائیں تو صرف مسجد میں ہی حاضر رہا کریں۔ بازاروں وغیرہ میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم خرید و فروخت کے لیے نہیں جا رہے۔ اِدھر اُدھر کی سیر ہمارا مقصود نہیں۔ گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر۔ نبی کریم نے فرمایا ہے کہ بہترین جگہ مسجد ہے اور بازار بدترین جگہ ہے۔

یہ بات آپ نے مدینہ میں کہی تو پتہ چلا کہ مدینہ کے بازار بھی بدترین جگہ ہے۔ کیوں مولانا ٹھیک ہے نا؟ اور توجہ مولانا علی محمد صاحب نوری کی طرف کی جو کچھ دور بیٹھے تھے۔ ان کی رگ حمیت پھڑک اٹھی۔ فوراً کڑک کر کہا: تم غلط کہتے ہو۔ مدینہ کے بازار بہترین جگہ ہیں۔ آپ جانتے تھے کہ اس بدبخت کا مقصد بازاروں کی سیر سے روکنا نہیں بلکہ در پردہ مدینے کے بازاروں میں بکھری ہوئی زیارات سے روکنا ہے اور حدیث نبوی کو اپنے ناپاک مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ چنانچہ پھر آپ نے تقریر کی جس میں اس ظالم کی تردید کی اور دلائل سے ثابت کیا کہ مدینے کے بازار بہترین جگہ ہیں۔ ان دلائل میں سے ایک مجھے تاحال یاد ہے۔ یہ دلیل اس حدیث سے مستفاد تھی جس میں حضور نے فرمایا کہ: کچھ لوگ مدینہ چھوڑ کر دوسرے ملکوں کا رخ کریں گے کہ وہاں ذرائع معاش وافر ہیں اور سرسبز و شاداب سرزمین ہے

والمدینۃ خیرلھم لو کانوا یعلمون (مدینہ ان کے لیے بہترین تھا اگر وہ جانتے)۔ ۲۷

پوری کتاب میں محض ایک یہی پیراگراف ہے جس میں کوئی سخت جملہ استعمال کیا گیا ہے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملے بھی انہوں نے مولانا نوراللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نقل کئے ہیں یعنی ان کے اپنے جملے نہیں ہیں کتاب مذکورہ میں جہاں جو بات کی گئی ہے بہت ہی عمدہ طریقے سے اگر اختلاف بھی کیا ہے تو بہت ہی دھیمے لہجے میں کیا گیا ہے۔

تذکرۂ عشاق اور وجدانی کیفیات

جمالیات کا ایک اہم عنصر وجدان بھی ہے جب انسان کو اس کی حسب منشا کوئی چیز ملتی ہے تو اس کے حصول پر اس پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے اسی کیفیت کو وجد کہا جاتا ہے۔ جب انسان پر بے خودی کی سی کیفیت طاری ہو جائے۔ کسی بھی مسلمان کے لیے زیارات مکہ و مدینہ بہت ہی اہمیت کی حامل ہیں ہر شخص اپنے تصور میں ہزاروں بار یہ زیارات کرتا ہے اور اس کے دل کی تمنا ہوتی ہے کہ کب وہ اس سفر پر روانہ ہو اور اپنی آنکھوں کے سامنے خدا

کا پرانوار گھر دیکھے اور کب اس کی نگاہیں گنبد خضرا کے دیدار سے خیرہ ہوں۔ حافظ بصیر پوری کی تصنیف ''اس دیار میں'' کے مطالعہ سے ان کی بہت سی وجدانی کیفیات بھی نظر آتی ہیں۔

> غرض طلوعِ فجر کے وقت ملتزم پر آخری الوداعی دعائیں اور التجائیں جاری تھیں۔ اگر مدینہ عالیہ کی حاضری کا تصور بہار آفریں کشاں کشاں نہ لے جاتا تو کعبہ معظمہ کا فراق کبھی گوارا نہ ہو سکتا۔ نماز فجر ادا کرنے کے بعد بس روانہ ہوئی اور تھوڑی دیر بعد ہی پہاڑیوں کے سلسلے اور ان کے مابین یکے بعد دیگرے ہموار وادیاں گزرنے لگیں۔ ہر پہاڑ دل و جان کی قربان گاہ تھا اور ہر وادی شوق و ذوق کی سجدہ گاہ۔ ۲۸

مسجد نبوی کی حاضری کے وقت ہر عاشق رسول کی خواہش ہوتی ہے کہ روضہ اقدس کی جالیوں کو چھو کر دیکھے اس کے بوسے لے اور وہاں خوب خوب آنسو بہائے اور مناجات کرے مگر حکومتی عربیہ اس امر کو بہت برا جانتے ہیں اور اگر کوئی ایسا کرتا پکڑا جائے تو اس کو نکال بھی دیتے ہیں مگر عشاق کو بھلا کون روک سکتا ہے؟ اور کون روک سکا ہے؟ کوئی نہیں۔ اسی طرح حافظ صاحب کو بھی بہت کوشش کے بعد روضہ اقدس کی مبارک جالیوں کو چوم لینے کا موقع میسر آیا جس کے بعد اپنی وجدانی کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

> شُرطہ پہلے ہی ایک دیوانے سے دست و گریبان ہے صرف دو تین آدمی اور بھی کھڑے تھے۔ دل دہل گیا دربان تو پہلے ہی غضبناک ہے۔ محبوب کے سراپردہ تک رسائی کیسے ہو اور پھر بوسے بھی ہوں۔ مجبوراً حضور کی بارگاہ میں التجا کی۔ دوسرے لمحے ہی شُرطہ سمجھ کر کہ زائرین سختی سے ڈر گئے ہیں اب جرات نہیں کریں گے، کچھ دور جا کر چائے پینے لگا۔ منہ ہماری طرف تھا اس لیے معاملہ ابھی تک دشوار تھا۔ اچانک ایک بھاری بھر کم آدمی میرے دائیں طرف آکر کھڑا ہو گیا اور میرے اور شرطی کے درمیان حجاب بن گیا میں نے موقع کو غنیمت جانا اور جالی سے چمٹ کر کئی بوسے لیے ...... آقا ..... ان لبوں کی سیاہی کو دیکھوں یا تیری سنہری جالی کی روشنائی کو ..... گستاخی معاف فرمانا۔
>
> ایک عشاء طبیعت بہت منقبض تھی۔ میں نے کوشش کرکے جالی شریف کو بوسہ دیا۔ اس بوسے میں جو کیفیت تھی پھر کبھی نصیب نہ ہو سکی۔ بیان و زبان اس کی تفصیل سے قاصر ہیں۔ بس ایک عجیب سی مہک رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ روح میں عجب اہتزاز سا پھیل گیا اور

واللہ مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ کہاں کھڑا ہوں اگر میں لڑکھڑا کر گر جاتا تو
سنبھلنے کا یارا نہ تھا۔ مگر جس نے پلائی تھی اس نے سہارا بھی دیئے رکھا۔
جب شعور واپس لوٹا تو میں مواجہہ عالیہ میں اپنے قدموں پر مستقیم تھا
۲۹

وجدانی کیفیات کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقام پر حافظ بصیر پوری رمضان المبارک میں اعتکاف کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

جب تک اعتکاف میں رہا درمیانی برآمدے میں سوتا رہا۔ سوتے وقت
گنبد خضرا اور نورانی میناروں کے نظارے سامنے ہوتے تھے۔ کہاں وہ
راتیں کہ خواب میں ایک دفعہ زیارت سے ہی اس قدر مسرور ہو جاتا تھا
کہ دن بھر ترنگ میں رہتا اور کہاں یہ راتیں کہ سبز گنبد کے جلووں کے
سائے میں نیند آتی تھی نہ زبان کو یارائے شکر اور نہ ذہن کو مجال حمد
...... احسان عظیم اور قوی حقیر و قصیر
خدا میری آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو میری مجبوریٔ شکر اور تیری
عظمتِ احسان کے ترجمان ہیں۔ ۳۰

کہا جاتا ہے کہ وجد کی کیفیات اکثر اوقات عشاق پر ہی وارد ہوتی ہے اس بات کو حافظ بصیر پوری اپنی اس تصنیف میں ثابت کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک عاشق صادق کا مختصر یوں ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک دن ایک سیاہ فام حبشی عاشق رسول نماز ظہر کے بعد متصل وجد میں
آگیا۔ نماز کا سلام پھرتے ہی نہ جانے اسے کیا نظر آیا کہ بے خودی میں اکڑ کر
کھڑا ہو گیا.......... آنکھیں بند تھیں جسم کا بند بند لرز رہا تھا۔ گلے فضا
میں اٹھے ہوتے تھے اور جوشِ محبت میں بار بار یہ الفاظ کہتا تھا۔
یا قیوم...... یا رسول اللہ........ حبیب الصالح ۳۱

مدینہ کے واقعات میں ایک اور عاشق صادق کی وجدانی کیفیت اور اس کے نتیجے کا اعلان کرتے ہوئے خود کو ملامت کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ حافظ بصیر پوری رقمطراز ہیں:

غالباً رمضان المبارک کے دوسرے جمعہ کا دن تھا۔ ایک عاشق رسول
اپنے ساتھیوں کو مجبور کر کے وقت سے قبل ہی مدینہ عالیہ میں لے آیا۔
آتے ہیں سامان سے بے پروا ہو کر سلام کے لیے حاضر ہوا۔ سلام کے بعد
دو نفل ادا کئے اور باب جبریل سے باہر نکلا۔ ہٹ کر گنبدِ خضراء پر دوبارہ

نظر ڈالی اور غش کھا کر گر پڑا۔ منہ سے خون نکلنے لگا اور تڑپے بغیر سرد ہو گیا۔ ایک ہم ہیں کہ چند آنسو نکل آئیں تو اپنے آپ کو گروہ عشاق کا سالار سمجھنے لگتے ہیں۔۳۲

سفر حجاز مقدس اختتام پذیری کو پہنچ رہا تھا اور مسافروں کو کچھ نہ کچھ خریداری کی بھی فکر تھی لیکن حافظ منظور حسین بصیر پوری پر جو سخت کیفیت طاری رہتی تھی وہ مقامات مقدسہ سے جدائی کا دکھ تھا اس بارے میں سوچ کر ان پر عجیب وجد اور قلندرانہ کیفیت طاری ہوتی جس کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

روانگی میں صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا۔ کلیجہ جدائی کے تصور سے ہی منہ کو آتا تھا۔ آنکھوں سے اشکوں کا دھارا رواں تھا اور روکے نہ رکتا تھا۔ جاں بلب تھی مگر باہر نہ نکلتی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ مرنا کس قدر مشکل ہے.......... مدینہ میں.......... خصوصاً میرے لیے....... دوست جب ان چیزوں کا ذکر کرتے جو روانگی کے قریب خریدنی تھیں تو میں چپکے چپکے روتا تھا......... غرض جدھر دیکھتے اور جدھر کان لگاتے الوداع، الوداع، الفراق الفراق کی صدائیں اور ندائیں سنائی دیتیں۔ اگر کسی وقت اندیشۂ فراق زور کرتا تو بے اختیار اصطفا منزل سے باہر نکل آتا اور والہانہ انداز میں حرم نبوی کے چاروں جانب چکر لگاتا۔ اس طوافِ حرم میں عجب قلندرانہ مستی تھی۔۳۳

کتاب کا ایک جمالیاتی پہلو احتیاط سے گفتگو کرنا بھی ہے بہت سے مقامات پر انہوں نے اس وصف کو اختیار کیا ہے۔ کئی مقامات اور معاملات کا ذکر کیا اور اس کے بعد واللہ اعلم لکھا جس سے یہ شبہ بھی جنم لیتا ہے کہ شاید حافظ بصیر پوری ان واقعات و معاملات کے بارے میں کچھ مطمئن نہ ہوں ورنہ وہ اس طرح احتیاط کرتے ہوئے واللہ اعلم کے الفاظ تحریر نہ فرماتے اس طرح احتیاط سے پیش کی جانے والی چند اقتباسات ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں۔

احد پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر کسی زمانے میں ایک قبہ تھا جو قبۂ ہارون کے نام سے مشہور تھا۔ ایک ضعیف سی روایت کے مطابق یہ وہی ہارونِ موسیٰ علیہا السلام ہیں جو کعبہ شریف کی زیارت کے لیے ادھر تشریف لائے تھے اور یہاں واصل بالحق ہو کر مدفون ہوئے، بلکہ یہاں دفن ہونے کا واقعہ بھی دلچسپ اور افسانوی ہے جو کچھ یوں ہے کہ

آپ مکہ مکرمہ سے واپسی پر یہاں پہنچے تو دیکھا کہ چند افراد جو درحقیقت فرشتے تھے یہاں قبر کھود کر کھڑے ہیں مگر جنازہ موجود نہیں۔ آپ نے

استفسار فرمایا کہ یہ قبر کس کے لیے کھودی گئی ہے۔ انہوں نے جواب دیا
"جو یہاں دفن ہونا چاہے" آپ کے دل میں اس جگہ اور فضا کی تاثیر کچھ
اس طرح گھر کر چکی تھی کہ آپ نے خود دفن ہونے کی تمنا ظاہر کی۔
چنانچہ آپ یہیں وصال فرما کر مدفون ہوئے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ
ہارون کسی اور بزرگ کا نام ہے واللہ اعلم۔۳۴

زیارت اُحد کے موقعہ پر آگے چل کر پیغمبر اعظم رحمۃ العالمین کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

جس مقام پر آپ کے دانت شہید ہوئے تھے وہاں ایک یادگار قائم کی گئی
ہے۔ اس کی زیارت کے بعد ہم لوگ پیدل آگے بڑھنے لگے۔ کچھ دور جا
کر بالکل احد کے دامن میں ایک چٹان چھجے کی طرح جھکی ہوئی نظر پڑی۔
کچھ زائرین بھی کھڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس چھجے کے نیچے آنحضرت
ﷺ آرام فرما ہوئے تھے۔ آپ کے بیٹھنے سے سر اقدس اوپر والے پتھر
سے چھو گیا اور پتھر نے اس سر مبارک کو اپنی آغوش میں نرم مثل موم
ہو کر جگہ دے دی۔ چنانچہ واقعی سر کی طرح کا گول نشان پتھر میں موجود
نظر آرہا تھا۔ لوگ اتباع سنت کے شوق میں نیچے بیٹھ کر سر کو اس نشان
میں ڈالتے تھے۔ ہم نے بھی اس نسبت کا خیال کر کے اس میں اپنے سر
کو جگہ دی۔ واللہ اعلم۔۳۵

کتاب مذکورہ میں "گلدستۂ خیال کے عنوان سے متفرق واقعات و خیالات پیش کئے گئے ہیں جن کے بارے میں خود مصنف نے لکھا ہے کہ یہ واقعات مربوط نہیں ان کے درمیان باہمی ربط صرف اس لحاظ سے ہو گا کہ وہ مدینہ منورہ یا مکہ معظمہ میں پیش آئے اور ذوق و محبت کی فضا ان سے روشن ہوتی ہے۔ بہت سے سوالات ہیں جن کا ابھی تک کوئی کافی و شافی جواب نہیں مل سکا جس سے مورخین اور معلمین مطمئن ہو سکیں جن میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ جب بیت المقدس قبلہ تھا تو اس وقت محراب کہاں تھا اس کے علاوہ ایک سوال یہ بھی ہے کہ مسجد نبوی کے کچھ حصہ میں سنگریزے کیوں بچھے ہوئے ہیں گو کہ دوسرے سوال کا جواب کچھ عقلی طور پر معقول معلوم ہوتا ہے مگر حافظ صاحب کے رویے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ان دونوں سوالوں کے جوابات بارے کچھ اطمینان نہیں ہو سکا کیوں کہ دونوں سوالوں کے ملنے والے جواب لکھنے کے بعد انہوں نے واللہ اعلم کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی انہوں نے احتیاط سے کام لیا ہے۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں کہ انہیں پہلے سوال کا جواب مدینہ میں موجود ایک ہندوستانی بزرگ نے کچھ اس طرح دیا ہے:

جب بیت المقدس قبلہ تھا تو محراب امام اس ستون کی جگہ تھا، جو اسطوانہ تہجد سے کشیدہ خطِ مستقیم بسوئے مغرب اور اُسطوانۂ عائشہ سے کشیدہ خط مستقیم بسوئے شمال کے نقطۂ تقاطع پر واقع ہے۔ محراب النبی میں حضور کی جائے قیام دراصل وہ جگہ ہے جہاں لکھا ہوا ہے۔ ھذا مصلی النبی ﷺ لوگ اس راز سے نابلد ہیں۔ اور محراب میں گھس کر نفل پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ اصل جگہ پر زیادہ موقع مل سکتا ہے۔ دلیل اس جگہ کی یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ مصلے سے اٹھ کر اسطوانۂ حنانہ سے ٹیک لگاتے تھے اور اسطوانۂ مذکور اسی جگہ سے متصل اور متوازی ہے۔ واللہ اعلم [۳۶]

اسی طرح مسجد نبوی میں سنگریزے بچھائے جانے کے سوال کے جواب پر بھی انہوں نے احتیاط برتتے ہوئے واللہ اعلم کا لفظ استعمال کیا ہے جو ایک انتہائی جمیل نکتہ ہے۔

حافظ صاحب رقمطراز ہیں:

صحن مسجد میں سنگریزوں سے بچھے ہوئے فرش آنحضرت ﷺ کے فرش مسجد کی یادگار ہیں۔ اس وقت بارش کے باعث مسجد کے اندر کیچڑ ہو جاتا تھا اس لیے صحابہ کرام نے سنگریزے بچھا دیئے تاکہ دلدل پیدا نہ ہو۔ وہاں سے یہ سنت باقی رکھی گئی ہے۔ واللہ اعلم [۳۷]

خوابوں کے بارے میں ایک حدیث نبوی ﷺ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "میرے بعد نبوت و رسالت کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے، اب کوئی رسول آسکتا ہے نہ کوئی نبی لیکن میرے بعد مبشرات اور بشارتیں ہوں گی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ وہ مبشرات کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ نیک خواب جو اہل ایمان کو آتے ہیں۔" (جامع ترمذی، کتاب الرؤیا، باب ذھبت النبوۃ وبقیت المبشرات، ۴: ۵۳۳، رقم: ۲۲۷۲)

چونکہ صالح خواب اللہ کی طرف سے بشارتیں ہیں اس لیے ان کو بھی جمالیات کا عنصر یا جزوی شمار کیا جاتا ہے اس سلسلہ میں کتاب "اس دیار میں" کے مصنف حافظ بصیر پوری نے رؤیائے صادقہ کے تحت ایک عنوان قائم کیا ہے اور اس کے تحت کچھ لوگوں کے خواب بیان کئے ہیں گو یہ حصہ مجہول ہے یعنی اس میں فاعل کا ذکر نہیں ملتا لیکن اس کے باوجود بھی یہ حصہ بہت خوبصورت ہے، اسی لیے اس میں سے چند اقتباسات بھی نقل کی جارہی ہیں۔ خود حافظ صاحب اس کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں، "رویائے صادقہ نبوت کے فیضان میں سے ہیں۔ بعض مومنین کو بھی بسا اوقات سچے خواب آتے ہیں جو حرف بحرف یا تھوڑے سے تغیر کے ساتھ پورے ہوتے ہیں بلکہ جس قدر روحانی ارتقا پیدا ہونے لگتا ہے اسی قدر رویائے صادقہ کثرت سے آنے لگتے ہیں۔ اگرچہ یہ

عبدیت و ریاضت کا اصل مقصود نہیں تاہم راہ سلوک کے مبتدی کے لیے سامانِ شوق مہیا کرتے ہیں جس طرح ایک سفر سر جھکا کر چلتے رہنے سے بھی طے ہو جاتا ہے لیکن مسافر اگر دائیں بائیں دیکھتا جائے اور خوش قسمتی سے راستے کے دوش بدوش شاداب اور لہلہاتے چمن زار بھی ہوں تو پھر راستہ بھی طے ہوتا جاتا ہے اور طبیعت بھی محظوظ رہتی ہے"۔

مدینہ عالیہ کے حاضری میں چونکہ علاق دنیوی سے آزاد ہو کر دن رات ذکر و فکر میں مشغول رہتے ہیں اس لیے اکثر ان کی راتیں بھی دنوں کی طرح روحانیت سے تابندہ ہوتی ہیں۔ چند خواب آپ کو بھی سنائے جاتے ہیں تاکہ منزلِ شوق کے لیے زادِ راہ تیار کر سکیں۔ ان میں سے بعض نصیحت کا سرمایہ ہیں اور بعض میں سے محبت کی مہک اُٹھتی ہے۔

> ایک صاحب نے خواب میں بہت خوبصورت سفید رنگ کی مٹی کا ایک میدان دیکھا جو حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اسے وہ بہت پسند آیا۔ ہاتف نے آواز دی کہ یہ جنت کی سرزمین ہے اور تمہیں دی جاتی ہے۔ تمہیں چاہیے کہ اس میں درخت لگاؤ۔ کچھ حصے میں آم کے درخت لگے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ یہ خواب اس حدیث کا ترجمان ہے جس میں حضور نے فرمایا کہ جنت ایک چٹیل میدان ہے جس کے درخت اور پھل سبحان اللہ اور الحمدللہ ہیں یعنی ذکرِ خدا کرنے سے جنت کے باغات ذاکر کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ ۳۸

اسی طرح ایک اور صاحب کا خواب بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ایک دوست نے سحری کے وقت خواب میں اپنے آپ کو پاسِ انفاس سے ذکر کرتے ہوئے پایا۔ وہ کہتے تھے کہ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ میرے جسم کے ایک ایک حصے میں روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ نورانی کیفیت جسم میں یوں جاری وساری تھی کہ سارا جسم آنکھ کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ ۳۹

مزید لکھتے ہیں:

ایک زائرِ حرم نے بیان کیا کہ ۱۴ شوال کی رات کو میں نے آدھی رات کے وقت تین مبشرات دیکھے جن میں سے دو تو بالکل بھول گئے مگر تیسرا صفہ مبارکہ پر بیٹھ کر درود شریف پڑھتے ہوئے اچانک یاد آگیا۔ اس کا خواب اسی کے الفاظ میں سنیے:

> دیکھتا ہوں کہ روضۂ اطہر کا وہ دروازہ کھلا ہوا ہے جو جالی شریف میں

ریاض الجنتہ کی جانب ہے اور چند لوگ اس دروازے کے سامنے ریاض الجنتہ کی جانب کھڑے ہوئے ہیں۔ ہاتف غیب ندا کرتا ہے کہ نبی اکرم دعا کر رہے ہیں۔ دعا ختم ہونے سے پہلے جو ریاض الجنتہ میں پہنچ جائیں گے وہ سب مغفور ہو جائیں گے۔ یہ سن کر میں پوری کوشش سے دوڑتا ہوں لیکن وہ چند قدم کا فاصلہ طے ہونے میں نہیں آتا۔ اچانک میرے پاس سے ایک لحیم و جسیم شخص دوڑتا ہوا آگے گزر جاتا ہے اور سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا ہے میں سعی بلیغ کرتا ہوں کہ یہ شخص پیچھے سے آکر آگے کیسے گزر گیا۔ دل میں یہ تاثر ابھرتا ہے کہ یہ روحانی دوڑ ہے جسمانی نہیں۔ آخر بڑی مشکل سے میں بھی پہنچ جاتا ہوں اور درِ اقدس کی طرف نظر اٹھاتا ہوں۔ روضۂ اطہر کے اندر تاریکی ہے اور حضور کی شکلِ انور پوشیدہ ہے البتہ یدانِ اقدس اس تاریکی میں چمکتے ہوئے نظر آرہے ہیں اور بارگاہِ خدا میں دعا کے انداز میں اٹھے ہوئے ہیں۔ تعجب ہے کہ اتنی دور سے بھی ہتھیلیاں صاف نظر آتی ہیں اور چاندی کی مانند سفید براق ہیں۔ انگلیوں کا بھی تصور باقی ہے اس کے بعد یدانِ اقدس غائب ہو گئے جیسے دعا ختم ہو گئی ہو اور میں تہجد کے لیے بیدار کر دیا گیا۔ ۴۰

حافظ بصیر پوری ایک عمدہ انشاپرداز اور وسیع المطالعہ شخصیت کے طور پر سامنے آئے عالم دین ہونے کے ساتھ عربی انگریزی اور فارسی زبان پر عبور رکھتے تھے بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہوگا کہ وہ اردو، عربی اور فارسی زبانوں کے حوالے سے سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ ایک عالم دین، فقیہی ہونے کے ساتھ قدیم اور جدید ادب کا مطالعہ بھی ان کا خاصہ ہے، ادب کی تمام اصناف پر گہری نظر رکھتے تھے اور خود بھی کہنہ مشق اور صاحب دیوان شاعر ہیں۔ حافظ بصیر پوری اپنی تمام تصانیف میں اردو اور فارسی کے علاوہ عربی کے عمدہ ترین اشعار نقل کرتے ہیں۔ موقع کی مناسبت سے قدیم اور جدید شعرا کے کلام سے اشعار منتخب کرتے ہیں ان کے سفر نامہ حجاز مقدس "اس دیار میں" جہاں زیارات مقدسہ کا مختصر اور مفصل ذکر ملتا ہے وہیں مسجد نبوی اور حرم مقدس کی تاریخ بھی اجمالی طور پر بیان کی ہے۔ اس کتاب میں بھی جگہ جگہ اشعار کا استعمال کیا ہے جو حافظ صاحب کی جمالیاتی حسن کا مظہر ہے ذیل میں اشعار کے کچھ نمونے پیش خدمت ہیں۔

اُردو اشعار

کتاب کا حصہ اول جس کا عنوان انہوں نے "رحیلِ کارواں" رکھا ہے اس کا آغاز ہی ایک خوبصورت شعر سے کیا ہے۔

شکرِ خدا کہ آج گھڑی اس سفر کی ہے
جس پر نثار جان فلاح و ظفر کی ہے ۴۱

جب مدینے کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں
حسرت آتی ہے یہ پہنچا، میں رہا جاتا ہوں ۴۲

مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا
اُسی کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا ۴۳

کام تھے عشق میں بہت سے میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے ۴۴

تم نے ملنے سے خود گریز کیا
ورنہ ملنے کے سو بہانے تھے
چارہ گر نے بڑی ہی کوشش کی
روگ دل کے مگر پرانے تھے ۴۵

مدینہ منورہ کے قربت کا ذکر کرتے ہوئے وہ بہت ہی نہال اور عشق نبوی سے سرشار نظر آتے ہیں۔ اس تمام صورت حال کو وہ اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

> اس وقت کی کیفیات کا بیان لفظ و معنی کے تنگ جامہ میں نہیں سما سکتا دل کی دھڑکنیں شنیدنی تھیں۔ جسم کا ایک ایک بال زبان حال سے یوں گویا تھا۔

مدینہ نبی کا قریب آ گیا ہے
بلندی پہ اپنا نصیب آ گیا ہے
نہ گھبرا نہ گھبرا مریض محبت
کہ نزدیک کوئے طبیب آ گیا ہے
چلو سجدے کرتے ہوئے ہر قدم پہ
کہ نزدیک کوئے حبیب آ گیا ہے[۴۶]

عشاق رسول کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی حسب حال اشعار کا انتخاب کرتے نظر آتے ہیں ایک جگہ پہ مندرجہ ذیل اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں:

سیکھ پروانے سے آئین وفا
جس کا جل بجھنا ہے تلقین وفا
شمع خود ہے پیرو دین وفا
قدر دان و منزلت بین وفا[۴۷]

انہیں میری نگاہ شوق میرا مدعا کہہ دے
میرے منہ سے تو حرف آرزو مشکل سے نکلے گا[۴۸]

"چند مبارک یادگاریں" کے عنوان سے کچھ زیارات کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ حافظ صاحب لکھتے ہیں:

ایک بھاری پتھر دیکھا جس پر زائرین تبرکاً لیٹتے تھے اور اس پتھر پر قدم آدم لیٹنے کی جگہ کھدی ہوئی تھی۔ پتہ چلا کہ آنحضرت ﷺ اس پتھر پر لیٹے تھے اور جیسا کہ احادیث سے ثابت ہوا ہے پتھر آپ ﷺ کے جسم اطہر کے نشانات کو اپنے اندر سمو لیتے تھے اور نرم مثال موم ہو جاتے تھے اس پتھر نے بھی آپ ﷺ کو آغوشِ محبت میں لے لیا۔ نشان آج تک باقی ہے۔

جہاں جہاں سے وہ گزرے جہاں جہاں ٹھہرے
وہی مقام محبت کی سجدہ گاہ بنے[۴۹]

ایک مقام پر مندرجہ ذیل شعر نقل کیا گیا ہے حقیقت بات تو یہی ہے کہ حافظ بصیر پوری اس پائے کے

مصنف تھے کہ وہ ایک ہی مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی اہلیت رکھتے تھے شعر ملاحظہ ہو:

گلدستۂ مضموں کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک رنگ کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں ۵۰

تختِ سکندری پر وہ تھوکتے نہیں ہیں
بستر لگا ہوا ہے جن کا تری گلی میں ۵۱

کس طرح ایک زائر اپنے سفر میں زیارات مقدسہ سے اپنے ذہن کو قلب کو آسودہ کرتا ہے اور پھر جب رخصت کا وقت آن پہنچتا ہے تو ہر کسی کا دل وہاں گزرے لمحات میں الجھا رہتا ہے اور اس کو رخصت کی ہمت نہیں ہوتی، ایسی ہی حالت مصنف موصوف کی تھی جن کو حرم میں رہ کر مدینہ طیبہ میں بسر کئے جانے والے اوقات پریشان کئے جاتے تھے اور ان لمحات کو یاد کرکے وہ اشعار سے دل بھلاتے تھے اس بارے میں حافظ بصیر پوری یوں رقمطراز ہیں:

یہاں امیدِ باز گشتن بھی مگر یہ شعر دردِ دل میں اضافہ کر رہا تھا اس لیے میں آستانِ نبی تک اسے دہراتا گیا۔ نماز فجر ادا کرکے حسب معمول تلاوت اور اوراد و وظائف سے فارغ ہوا تو مواجہہ عالیہ کا رخ کیا۔ سامنے کھڑا ہوا تو مدینہ عالیہ میں گزرے ہوئے دن قطار باندھ کر آنکھوں کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ ان ایام میں کتنے ہی کرم حضور نے مجھ گدائے بے نوا پر کئے تھے۔ ان کا ایک ایک کرم یاد آتا اور ساعتوں رُلاتا رہا۔

خوشی یاد آئی نہ غم یاد آئے
ہمیں بس تمہارے کرم یاد آئے ۵۲

حافظ بصیر پوری نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی زبان میں اعلیٰ ڈگری کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا تھا اور اسی بنیاد پر وہ کالج میں استاد مقرر ہوئے تھے فارسی زبان میں ان کی مہارت غیر معمولی تھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تمام اصناف و تمام کتب میں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اشعار کا استعمال بھی بخوبی کیا ہے۔

فارسی اشعار

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
آتشِ شوق تیز تر گردد۵۳

دریں چمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است۵۴

لعلش بگاہِ نطق چوں گوہر فشاں شود
صد طعنہ بن لطافت دُرِّ عدن زند۵۵
رہرواں را خستگیٔ راہ نیست
عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است۵۶

بجرمِ عشق توام کشند غوغا ایست
تو نیز برسربام آکہ خوش تماشا ایست۵۷

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں دل شدہ راجاں شدو آواز نیامد
ایں مدعیان در طلبش بے خبر انند
واں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد۵۸

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تابماند نام نیکت برقرار۵۹

گفت چوپاں مرمرا معلوم نیست
من نمی دانم محمد نام کیست۶۰

رحمت حق بہانہ می جوید

رحمتِ حق بہا نمی جوید۶۱

ایک عالم دین اور ایک فقیہ ہونے کے باعث حافظ بصیر پوری عربی زبان کو بھی خوب سمجھتے تھے اور انہیں عربی پر بھی ایسے ہی عبور تھا جیسے انہیں اردو اور فارسی پر عبور تھا ان کے معاصرین کا کہنا ہے کہ حافظ صاحب کے ہاں لفظوں کی بساط بچھانے اور ان کو برتنے کا سلیقہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ جس کا عملی ثبوت ان کی تصانیف ہمارے ہاں موجود ہیں۔ اپنی دیگر تصانیف میں بھی حافظ صاحب عربی کے اشعار کا استعمال کرتے ہیں کتاب ''اس دیار میں'' اردو و فارسی کے اشعار کا استعمال زیادہ ملتا ہے ان کی نسبت عربی اشعار بہت کم ملتے ہیں۔

عربی اشعار

یا خیر من دفنت فی الترب اعظمه

فطاب من طیبهن القاع والاکم

نفسی الفداء لقبرٍ انت ساکنه

فیه العفاف وفیه الجود والکرم۶۲

طلع البدر علینا

طلع البدر علینا

من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا

ما داعا لله داعی ۶۳

دموع الفتٰی عما یجن تترجم

وانفاسه یبدین ماالقلب یکتم

وکتبك هولی لاتفارق مضجعی

وفیها شفاء اللذی اناکاتم۶۴

کیف الوصال الی سعدیٰ و دونها

قلل الجبال و بینهن حتوف۶۵

حافظ صاحب کی مذکورہ کتاب ایک ڈائری کی شکل میں لکھی جانی والی یادداشتوں کا مرقع ہے اور کچھ حصہ من و عن ڈائری کی صورت ہی درج کیا گیا ہے جبکہ دوسرا حصہ بعد کے ایام میں شامل کر کے اس کو باقاعدہ ایک گائیڈ بک بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اب یہ بات مد نظر رہے کہ کتاب مذکورہ میں بیان کی جانے والی بہت سی زیارات بعض وجوہ پر شہید کر دی گئی ہیں۔ زائرین اب اس بات کو بھی ذہن میں رکھ کر جائیں گے کہ مسجد نبوی کی حالیہ توسیع میں وہ تمام علاقہ جو سرکار دو عالم ﷺ کے دور میں مدینہ شہر ہوا کرتا تھا وہ تمام کا تمام اب مسجد نبوی میں شامل کر دیا گیا ہے لہٰذا حافظ بصیر پوری کی بیان کردہ بہت سی زیارات جو اس دور میں مدینہ طیبہ کے بازاروں میں بکھری پڑی تھیں اب اپنا وجود کھو کر مسجد کا حصہ بن چکی ہیں۔ البتہ مذکور کتاب ایک لحاظ سے بہت ہی اہم ترین مسودہ ہے کہ اس میں بہت سی زیارات کا ذکر کیا گیا ہے جو اب دیکھنے کو تو نہیں ملیں گی لیکن پڑھنے کو تو مل ہی سکتی ہیں۔ چونکہ زیارات اور دوسرا حصہ ہمارے موضوع حصہ نہیں ہے اس لیے اس کا ضمنی طور پر ذکر کرنا خیر و برکت کا باعث سمجھ رہا ہوں۔

ستونوں کا تذکرہ

جہاں سے مسجد نبوی کی تاریخ کا اجمالی طور پر ذکر کیا گیا ہے وہاں پر کچھ ستونوں کا ذکر کیا گیا ہے اور خاص طور پر مقام ریاض الجنتہ کا ذکر کیا ہے اور یہ ذکر بہت ہی محبت و اخلاص کے ساتھ کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی خواہش ہے کہ جب بھی کوئی مسجد نبوییں پہنچے تو ریاض الجنتہ میں نماز لازمی ادا کرے۔

حافظ صاحب رقمطراز ہیں:

> آنخضرت کا ارشاد ہے کہ میرے گھر اور میرے منبر کی درمیانی جگہ بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:
>
> مابین بیتی و منبری روضۃٌ من ریاض الجنۃ و منبری علی ترعۃ حوضی
>
> گویا اس مقدس حصہ میں داخل ہونا اور نماز پڑھنا ایسے ہے جیسے جنت میں داخل ہو کر نماز پڑھی جائے۔ اس حصے کی سب سے اہم نشانییہ ہے کہ اس حصہ کے ستون قد آدم تک سفید منقش سنگ مرمر کی شکل میں ہیں اور اوپر سے سرخ ہیں۔ ریاض الجنتہ کے قلین فرشی بھی سبز رنگ کے ہیں باقی مسجد میں سرخ قالین ہیں۔ اس حصہ کے اکثر ستون نہایت مبارک اور اعلیٰ نسبتوں کے حامل ہیں۔ ۶۶

اس کے بعد مسجد کے آٹھ ستونوں کا ذکر کیا ہے

(۱) اُسطوانۂ مخلقہ: یہ ستون محراب نبوی سے متصل ہے اور منبر بننے سے پہلے اسی ستون کو آپ تکیہ بنا کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔

(۲) اُسطوانۂ عائشہ: یہ مبارک ستون حجرۂ مقدسہ سے تیسرے نمبر کا ستون ہے اور منبر کی جانب سے بھی تیسرا ہے۔

(۳) اُسطوانۂ توبہ: یہ حجرۂ مقدسہ سے دوسرے نمبر پر واقع ہے۔ یہاں آنحضرت اکثر نفل ادا کرتے، تعلیم قرآن دیتے اور اسلامی احکام بتاتے۔ اسی ستون کا نام اسطوانۂ ابی لبابہ ہے، چونکہ ابولبابہ سے ایک لغزش ہو گئی تھی۔ انہوں نے اس ستون کے ساتھ اپنے آپ کو بندھوالیا۔ ضروریات انسانی کے وقت انہیں کھول دیا جاتا۔ رات دن گریہ وزاری کرتے اور کہتے جب تک اللہ تعالی میری توبہ قبول نہ فرمائے گا یا حضور مجھے ہاتھ سے نہ کھولیں گے اپنے آپ کو اسی سزا مین مبتلا رکھوں گا۔ آخر پندرھویں روز یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا تب آپ ﷺ نے اپنے دستِ اقدس سے کھولا۔

(۴) اُسطوانۂ سریر: جب حضور مسجد میں اعتکاف کے لیے قیام فرماتے تو کھجور کی بنی ہوئی ایک سادہ سی چار پائی یہاں بچھائی جاتی۔ سریر، تخت یا چار پائی کو ہی کہتے ہیں۔

(۵) اُسطوانۂ حرس یا علی: حضرت علی یہاں حضور انور ﷺ کی پہرے داری یا دربانی کی خدمات انجام دیتے تھے۔

(۶) اُسطوانۂ وفود: جو قبائل عرب اپنے نمائندے یا وفود دربارِ رسالت میں بھیجتے انہیں اسی جگہ بٹھایا جاتا تھا۔

(۷) اُسطوانۂ جبریل: یہاں اکثر جبریل امین نازل ہوتے اور وحی الٰہی پہنچاتے

(۸) اُسطوانۂ تہجد سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ سے متصل یہ ستون ہے۔ یہاں آپ ﷺ نماز تہجد ادا کرتے۔ ۶۷

(۱) مسجد قبا: مدینہ منورہ سے تقریباً دو میل کے جنوب مغرب کی طرف ایک قدیمی گاؤں ہے جہاں آنحضرت نے مکہ سے تشریف لا کر کچھ عرصہ قیام فرمایا تھا اور یہ مسجد تعمیر ہوئی۔

(۲) مسجد الاجابہ: یہ قبیلہ بنی اول میں سے بنی معاویہ نے بنائی تھی۔

(۳) مسجد، مشربہ ارم ابراہیم: جب حضرت ماریہ قبطیہ حضور کے حرم میں داخل ہوئیں تو آپ نے انہیں عوالی مدینہ میں ایک مکان عطا فرمایا۔ اسی جگہ حضرت ابراہیم انہی کے بطن سے تولد ہوئے تھے۔ آپ ﷺ ان کی دیکھ بھال کے لیے جاتے تو اس مشربہ میں نماز پڑھتے بعد میں یہاں مسجد بنائی گئی۔

(۴) مسجد البقیع: مدینہ کے مشہور قبرستان جنت البقیع کے دروازے سے گزرتے ہوئے دائیں طرف مشہد سیدنا عقیل اور امہات المومنین کے مغربی طرف اس مسجد کا صرف نشان باقی ہے۔

(۵) مسجد الفتح: مدینہ طیبہ کے شمال مغرب کی طرف جبل سلع کے دامن میں چھوٹی چھوٹی چار مسجدیں ہیں۔ ایک مسجد بلندی پر واقع ہے جس پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔

(۶) مسجد قبلتین: چھوٹی سی یہ مسجد اربعہ سے آدھ میل مغرب کی طرف واقع ہے جس کے اندر دو محراب ہیں ایک جنوبی دیوار میں اور ایک شمالی دیوار میں اس کی وجہ یہ ہے کہ بنی سلمہ کی ایک جماعت نماز ادا کر رہی تھی کہ کسی نے آکر یہ کہا "اب بیت المقدس کی بجائے کعبہ قبلہ مقرر ہو گیا ہے" ساری جماعت نے فوراً اپنا رخ شمال سے جنوب کی طرف بدل دیا۔ اسی لیے بعد میں اس کا نام مسجد قبلتین مشہور ہوا۔

(۷) مسجد الرایتہ یا مسجد ذباب: مدینہ طیبہ سے جو راستہ شام کو جاتا ہے اس کے دائیں طرف ذباب پہاڑ کی چوٹی پر ہے جہاں سے شہر مدینہ کا نظارہ ہو سکتا ہے۔

(۸) مسجد الفسح: یہ مسجد سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے مشہد کے

شمالی جانب جبل احد کے دامن میں واقع ہے۔۶۸

رو افض کی ہلاکت گاہ

حافظ بصیر پوری نے مسجد ضرار کا تذکرہ الگ سے "دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو" کے عنوان کے تحت کیا ہے اس عنوان میں انہوں نے مدینہ طیبہ میں روافض کے اس قبیح عمل کا ذکر اجمالی طور پر کیا ہے جب انہوں نے حضرات شیخین کا جسد مبارک ان کے مزارات سے نکال کر بے حرمتی کا ارادہ کیا، اس واقعہ کو حافظ صاحب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رافضیوں نے ارادہ کیا کہ شیخین کریمین یعنی حضرات صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کے مزارات کھود ڈالے جائیں اور اجسام مبارک کو بے حرمت کر کے غائب کر دیا جائے جب اس کام کے لیے انہوں نے ہر قسم کے خفیہ انتظامات مکمل کر لیے تو ایک رات حرم نبوی کا تالا توڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ سوء اتفاق اس وقت مدینہ کا امیر کوئی بد عقیدہ شخص تھا اور اس سازش میں شریک تھا ....
> دربانِ مسجد ان کی نیت بھانپ گیا مگر بے بس اور مجبور تھا۔ اس لیے دل ہی دل میں رسول اللہ سے استغاثہ کیا۔ رافضی باب السلام سے داخل ہو کر آگے بڑھے۔ تھوڑی دور آگے بڑھے تھے کہ زمین میں دھنس گئے۔ دربان کی دعا قبول ہوئی اور شریر اپنے انجام کو پہنچے۔ چنانچہ باب السلام سے چند گز آگے قالین اُٹھا کر دیکھا جائے تو فرش پر گول سیاہ نشان دکھائی دیں گے یہ ان کی ہلاکت گاہ ہے۔۶۹

مسجد ضرار

جیسے عبرت کے لیے روافض کی ہلاکت کو الگ سے بیان کیا ہے اسی طرح مسجد ضرار کی تعمیر بھی ایک سازش تھی جس پر اللہ نے اپنے پیغمبر کو وحی کے ذریعے سے مطلع کیا۔ مسجد ضرار کے بارے میں بھی الگ سے بیان کیا ہے۔

مصنف موصوف رقمطراز ہیں:

> مسجد قبا کے شمالی دروازے کی جانب جو پکی سڑک مشرق کی جانب جاتی ہے اس پر تھوڑی دور چلیں تو ایک وسیع چار دیواری کے کونے پر کچھ جگہ سیاہ رنگ کی نظر آئے گی جسے چار دیواری کی دیوار ٹیڑھی کر کے علیحدہ

چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہی وہ معروف جگہ ہے جہاں منافقین نے ایک مسجد بنائی تھی اور جسے قرآن حکیم میں مسجد ضرار کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تعمیر کا مقصد مسجد قبا کو نقصان پہنچانا اور اس کی جماعت کو متفرق کرنا تھا۔ مسجد تعمیر کرنے کے بعد منافقین بارگاہِ نبوی میں آئے اور کہا کہ ہم نے یہ مسجد آسانی کے لیے بنادی ہے تاکہ جو لوگ بوڑھے، ضعیف اور کمزور ہیں اس میں فراغت سے نماز ادا کرلیا کریں۔ آپ ﷺ اس میں ایک نماز پڑھ دیجئے اور برکت کی دعا فرمادیجئے۔ مگر وحی کے ذریعے آپ ﷺ کو اس بات سے روک دیا گیا اور ان کے فاسد ارادوں سے آگاہ کر دیا گیا۔[۷۰]

اسی طرح کتاب "اس دیار میں" کے اندر زیارات مقدسہ میں کچھ کنوؤں کا ذکر بھی اجمالی طور پر کیا گیا ہے۔ جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) بئر اریس یا خاتم
(۲) بئر غرس
(۳) بئرِ عثمان
(۴) بئر بصّہ
(۵) بئر حاء
(۶) بئر عروہ
(۷) بئر بضاعۃ
(۸) بئر لامتہ یا بئر رومتہ[۷۱]

ان کنوؤں کے ساتھ ہی نہر زرقا کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے آگے متصل صفہ مبارکہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس بابت مصنف لکھتے ہیں:

اُسطوانہَ تہجد کے پاس باب جبریل اور باب النساء کے درمیان ایک اونچا چبوترہ ہے جس کے چاروں طرف پیتل کی چھوٹی چھوٹی باڑ لگی ہوئی ہے۔ یہ اصحابِ صفہ کی نشست گاہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ درویش صفت طالبِ علم مہاجرین صحابہ کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ ان کی تعداد مختلف اوقات میں مختلف رہی۔[۷۲]

اس سفر نامہ حجاز میں اہل سوڈان اور اہل ایران کا ذکر کیا گیا ہے جس میں اہل سوڈان کے بارے میں لکھا

ہے کہ وہ لوگ جذبہ عقیدت و محبت سے سرشار دکھائی دیتے ہیں جبکہ اہل ایران کے بارے میں یوں ذکر کیا گیا ہے:

> ایرانیوں کو پہلے حاضری کی اجازت کم ملتی تھی۔ اس کا باعث سعودی اور ایرانی حکومت کے مذہبی اور سیاسی اختلافات بھی تھے۔ مگر شاہ فیصل کی سیاسی مصلحتوں نے اس بند کو توڑ دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایرانی من مانی کر رہے ہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ بجائے صلوٰۃ وسلام کے اہل بیت کی مرثیہ خوانی ہی کرتے رہتے ہیں۔ عورتوں اور مردوں کا اختلاط بھی حد سے زیادہ ہو گیا ہے۔ ان کی نوحہ کوانی سن کر بعض اوقات اجنبی کا دل رقیق ہو جاتا ہے مگر یہ چند مصنوعی سی آوازوں کے علاوہ کچھ اثر ظاہر نہیں کرتے بلکہ جبلی بے ادبی کارفرما ہے۔ کئی مسجد نبوی میں بھی سگریٹ سلگائے نظر آجاتے ہیں۔ جنہیں بڑی مشکل سے سمجھانا پڑتا ہے۔ آداب بارگاہِ نبوی سے بیزار ہیں............ وہ شور بپا کیا ہے کہ خدا کی پناہ ان کے سامنے ان کے احکامات کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔ تصور سے جسم پر بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔.......... خدایا رحم فرما آداب کہاں گئے ہر طرف شور محشر بپا ہے۔ بالکل میلے کا گماں ہوتا ہے۔۴۳

جمالیات حافظ بصیرپوری کے رگ و پے میں رچی بسی ہوئی ہے، شاید میں نے پہلے بھی کہیں بیان کیا ہے کہ مصنف موصوف کے ہاں سب سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ عرب کے قوانین اور رسوم رواج ان کے ذاتی عقائد سے بہت مختلف بلکہ ان کو ایک دوسرے کی ضد کہنے بھی بے جانہ ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود بھی مصنف نے اہل عرب کے ماحول قوانین اور تہذیب و تمدن کی بہت تعریف کی اور اس کو بہت خوبی کے ساتھ سراہا ہے۔ مصنف کو بلادِ سعودی عرب میں مزارات کے مسمار کیے جانے کا بہت رنج ہے لیکن سعودی عرب کی حکومت سے مسلکی اور فکری اختلاف کے باوجود بھی انہوں نے ایک عمدہ مصنف اور محقق ہونے کا ثبوت دیا ہے اور ہر اس چیز کی تعریف کی ہے جو کسی بھی لحاظ سے قابل تعریف سمجھی۔ اہل عرب کے بارے میں حافظ بصیرپوری لکھتے ہیں:

> سعودی حکومت اور شرطہ کے کردار کے کئی روشن پہلو بھی ہیں........ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس حکومت نے حجاج کرام کے جان و مال کی حفاظت کی نہایت اچھا بندوبست کیا ہے۔ ورنہ یہ وہی علاقہ ہے جہاں آج سے کم و بیش نصف صدی پیشتر حجاج کے قافلوں کا بدوؤں کے قتل و غارت سے بچ جانا ایک معجزہ تصور کیا جاتا تھا۔ حجاج کرام جب اپنے اپنے

گھروں سے روانہ ہوتے تو اہل وطن یوں وداع کرتے جیسے وہ اگلے جہان
کے لیے رختِ سفر باندھ رہے ہوں کیونکہ ان میں سے اکثر لٹ جاتے یا
کٹ جاتے اور بہت کم صحیح و سالم واپس پہنچتے۔ مگر اب یہاں چوری نام کو
نہیں۔ حجاج سڑکوں اور گلیوں میں سامان رکھ کر بے خطر جاتے ہیں اور
زیادہ سے زیادہ ایک کپڑا سامنے لٹکا جاتے ہیں جس میں سے چمکتی ہوئی
گھڑیوں اور دوسرے سامان فروخت کی روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی
ہوتی ہے۔ اس وقت یہ دنیا کی واحد حکومت ہے جس نے اسلامی حدود و
قیود کا صحیح نظام قائم و نافذ کر رکھا ہے۔ جہاں اسلامی آئین کے مطابق
فیصلے ہوتے ہیں اور جہاں مسجد کا امام جسٹس بھی کہلاتا ہے کیونکہ وہ
مقدمات کے فیصلے بھی کرتا ہے۔ اسی نظام کی برکت ہے کہ یہ ملک امن
واماں کا گہوارہ ہے۔[۷۴]

اسی طرح اہل عرب سے بعض معاملات میں کچھ خائف سے بھی نظر آتے ہیں لیکن کسی بھی مقام پر اپنی خفگی کے لیے لٹھ نہیں اُٹھا لیتے ان کا رویہ بہت ہی موزوں اور مناسب نظر آتا ہے اور یہ جمالیات کی ایک عمدہ لٹھ (ڈنڈا) مثال ہے، حافظ صاحب کی خفگی کا اظہار بھی ایک دعا کی شکل میں سامنا آتا ہے

دنیا بھر کے اسلامی ممالک میں سے واحد ملک کی پولیس ہے جو اذان کے
بعد سڑکوں اور بازاروں میں ٹیکسیوں اور کاروں کو روک کر نیز
دوکانداروں کو سیٹی بجا کر اور راہ گیروں کو آواز دے کر نماز کے لیے روانہ
کرتی ہے۔ حکومت کا دبدبہ عوام میں موجود ہے۔ سیاسی خلفشار جملہ
اسلامی ممالک کی نسبت کم ہے۔ ممکن ہے شاہی خاندان میں کچھ رقابت
باہمی موجود ہو تاہم عوام میں حکومت پر بے جا تنقید و تبصرہ کی عادت
نہیں یا اجازت نہیں۔ اس حکومت کو اکابرین کے جائز حد تک ادب و
احترام اور تعظیم کی توفیق بھی مل جاتی تو کیا لطف ہوتا۔[۷۵]

مصنف موصوف نے مکہ مکرمہ کی زیارات کا بھی مختصر ذکر کیا جن میں

دارِ ارقم: مسعیٰ کے تقریباً درمیان میں مشرق کی جانب ایک دروازہ ہے
جس سے باہر نکلیں اور صفا کی جانب کچھ دور چلیں تو ایک دکان پختہ کے
دروازے کے ساتھ ہی عربی رسم الخط میں دارارقم لکھا ہا ہے۔ یہاں پر
نبی کریم ﷺ کے مشہور صحابی حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کا مکان تھا جو

اول مسلمان ہونے والوں میں سے تھے اسی مکان میں بیٹھ کر حضور ﷺ ابتدائے اسلام میں پیغامِ توحید دیتے تھے۔۷۶

''مولد النبی ﷺ: جو سڑک جبلِ بوقبیس کے دامن سے گزر کر مشرق کی جانب چلتی ہے اور آگے جا کر شارع المنیٰ میں شامل ہو جاتی ہے مولد النبی اسی پر کچھ دور واقع ہے۔ اس جگہ اب سرکاری کتب خانہ کی پختہ اور جدید طرز کی عمارت بن چکی ہے

جبل بوقبیس: کعبہ معظّمہ کے جنوب مشرق میں مشہور پہاڑ بوقبیس سینۂ گیتی میں پاؤں گاڑے کھڑا ہے۔ یہاں ایک مبارک مسجد ہے جسے مسجد بلال کہا جاتا ہے، اور دوسری زیارت گاہ جائے شق القمر بھی اسی پہاڑی کی چوٹی پر ہے۔۷۷

اس کے بعد جنت المعلیٰ، غارِ حرا، غارِ ثور، مقام جعرانہ، مقام ابراہیم، آبِ زمزم، حطیم، کعبہ معظّمہ اور صفا و مروہ کا ذکر بھی کیا ہے۔ زیارات میں حافظ بصیرپوری نے مسجد نبوی اور حرم میں قرآنی آیات کی خطاطی کا ذکر بھی بہت اخلاص و محبت سے کیا ہے اور بہت سی آیات قرآنی کتاب میں نقل کی ہیں جن کی نقاشی وہاں در و دیوار پر کی گئی ہے۔

مجموعی طور پر کہا جائے گا کہ حافظ بصیرپوری کا یہ سفر نامہ ہر لحاظ سے دوسرے ارباب سے مختلف ہے اس میں نہ صرف معلومات کا خزانہ ہے بلکہ محبت اور جذبوں کا بحرِ بے کراں بھی موجزن ملتا ہے۔ ذوق و شوق کی کمی نہیں سادہ زبان میں بھی قاری مسحور کیے رہتا ہے۔ یہی جمالیات کی عمدہ اور روشن مثال کہلانے کے لائق ہے۔

(ب) دامن گلچیں

پچھلی صدی کے نصف اول میں جہاں برصغیر نے ایک سے ایک قد آور سیاست دان کو دیکھا ہے وہاں صحافت، وکالت شعر و شاعری میں بھی صفِ اول کی شخصیتوں کا جھرمٹ اپنے دامن میں سجا رکھا ہے اور اساطینِ منبر و محراب اور کاروانِ علم و معرفت کی بات ہو تو ایسی ضوفشاں مثالیں سامنے آئیں گی جن کے شعور و آگہی کی تمازت ابھی تک دلوں کو گرماتی نظر آتی ہے۔ ان شخصیات میں سے ایک حافظ منظور حسین بصیرپوری بھی ہیں جن پر صرف بصیرپور ہی نہیں بلکہ سرزمینِ پاک کا ایک ایک ذرہ فخر کر سکتا ہے۔

اس کتاب میں مولانا کے لیکن مقالات کا تنوع کئی ایسے عناوین کا احاطہ کیے ہوئے ہے جن سے ان کے اعلیٰ پائے کی فقاہت و درایت کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب ایک عہد کی تاریخ ہے۔ مقالات کی تعداد چھبیس ہے۔ اس میں شخصیات کا بھی تذکرہ ہے۔ مؤلف کے دروس اور تقاریر کو بھی کتاب کی زینت بنایا گیا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ پروفیسر حافظ منظور حسین بصیرپوری، نظم و نثر کے کہنہ مشق استاد ایک باعمل صوفی اور صاحب نظر و فیض شخصیت ہیں، اپنے زمانہ حیات میں ان کے روز و شب شعبہ تعلیم و دین کے

لیے مختص رہے انہوں نے غزل بھی لکھی اور نظم بھی اس کے ساتھ نثر کا گراں مائع سرمایہ ہمارے لیے چھوڑا جو اہل علم اور تشنگانِ علم کے لیے کسی نعمتِ متبرکہ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ان کی تقاریر اور مقالات کو جمع کرکے کچھ مضامین کا ایک مجموعہ ''دامنِ گلچیں'' کے نام سے پہلی بار ۱۹۸۲ء میں شائع کیا گیا۔ اس کا زیرِ نظر ایڈیشن ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا اور اس کی اشاعت اکبر بک سیلرز، زبیدہ سنٹر ۴۰۔ اردو بازار لاہور سے ہوئی۔

۲۷۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا انتساب حافظ صاحب موصوف نے اپنی بہن کے نام کیا ہے جن کو وہ اپنی والدہ کی جگہ سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ بہت ہی محبت و عقیدت رکھتے تھے، بہن کی بیماری کے دنوں میں ان کے لیے موجود وسائل میں رہتے ہوئے ہر ممکن کوشش کی اور ان کے انتقال کے بہت کافی دنوں تک اس صدمہ جاں سے غمگین و پریشان رہے۔

انتساب کے بعد تعارف و تبصرہ اور کتاب کے تعارف پر مشتمل ہی ایک مختصر مضمون بعنوان ''گریبان اپنا'' مصنف کی طرف سے درج کیا گیا ہے، جس میں انہوں نے کتاب کے بارے میں کچھ یوں بیان کیا ہے۔

''زیرِ نظر مجموعہ ان تحریروں اور تقریروں پر مشتمل ہے جو مختلف محافل و مجالس میں وقتاً فوقتاً پیش کی گئیں اور خوش قسمتی سے جن کی نقول باقی رہ گئیں یا کسی صاحب ذوق نے انہیں ریکارڈ کر لیا۔ ان میں سے بعض مقالات تو باقاعدہ تحقیق و تفحص کے بعد شپردِ قلم کئے گئے اس لیے ان میں موضوع سے اجمالی طور پر ہی سہی، بہت حال مقدور بھر انصاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بعض موضوعات پر گفتگو ضرورت کے مطابق کی گئی کیونکہ اس کے بعض دوسرے پہلوؤں پر دیگر حضرات پہلے بات چیت کر چکے تھے لہٰذا صرف نئے پہلو سامنے لائے گئے''۔ ۸۷

اس کتاب کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب ''اسلامیات'' اس میں اسلام کا نظام تعلیم، اسلام کا معاشرتی نظام، اسلامی فلاحی معاشرہ اور اسلام میں صحت و صفائی کے عنوان سے کل چار مضامین ہیں۔

دوسرا باب سیرت مصطفیٰ ﷺ پر مشتمل ہے جس میں کل پانچ مضامین شامل ہے۔

تیسرا باب شخصیات پر مشتمل ہے جس میں حضرت غوث اعظمؒ، امام ربانی مجدد الف ثانی اور امام اہل سنت احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہم، کے بارے میں مختصر مگر جامع خاکے تحریر کئے گئے ہیں۔

چوتھا باب اصلاحات و اخلاقیات کے عنوان سے لایا گیا ہے جس میں علم و علما کی فضیلت، تکبر، عید الفطر، اولیا کرام کی شان و عظمت، مزاراتِ اولیا کے ساتھ دو بہت ہی اہم مضامین ماں، اور باپ کی عظمت پیش کئے ہیں۔

پانچواں باب ادب و ظرافت پر مشتمل ہے۔ چھٹا باب پاکستانیت اور ساتواں باب اقبالیات پر مشتمل ہے۔

حافظ بصیر پوری کا اسلوب بیان عام فہم اور سادہ ہے انہوں نے کتاب کا آغاز اسلام میں نظام تعلیم کے حوالے سے کیا ہے جس میں انہوں نے مغرب کے ساتھ ہمارے تعلیمی نظام کا موازنہ پیش کیا ہے اور اس نظام کی خامیوں کی طرف نشاندھی کی ہے۔ ساتھ ہی انہوں اسلامی نظام تعلیم کی خوبیاں بھی پیش کی ہیں۔ اپنے زمانۂ حیات

میں وہ ایک مبلغ اور مصلح کے طور پر سامنے آئے ہیں اور ان کی تحریروں کی سب سے عمدہ اور جمیل ترین خوبی یہ ہے کہ وہ صرف مسائل کی نشان دھی ہی نہیں کرتے بلکہ ان مسائل کا حل بھی پیش کرتے ہیں اور عقل سلیم رکھنے والے قارئین وسامعین کے لیے اس میں سمجھنے اور عمل کرنے کے لیے بہت سے عمدہ نکات موجود ہیں۔

حافظ بصیر پوری جہاں بھی اسلام کے حوالے سے کوئی بات کرتے ہیں تو اس کا طرز تخاطب کہیں معلق نہیں ہے وہ اپنی بات کے حق میں قرآن حدیث سے دلائل پیش کرتے ہیں اور جمالیات کا سب سے بڑا منبع و مخرج قرآن عظیم اور اقوال پیغمبر اعظم ﷺ کے سوا اور کوئی مسودہ نہیں ہو سکتا۔

حافظ بصیر پوری کا شمار اپنے دور کے اعلیٰ پائے کے جمالیات نگاروں میں ہوتا ہے۔ چونکہ حافظ بصیر پوری خود ایک استاد ہیں اس لیے وہ تعلیم، تعلیم اور طالب علم کے مسائل کو بخوبی واحسن طریق سے سمجھتے ہیں۔ علم کی تعریف اور اہمیت بیان کرتے ہوئے حافظ صاحب رقمطراز ہیں:

''انسانی فطرت کا ایک اساسی تقاضہ حقیقت کی تلاش ہے اور اسی حقیقت کی تلاش میں جذبہ جستجو کی کارفرمائیوں کا نام علم رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جس قدر تحصیل علم اور تبلیغ علم پر زور دیا گیا ہے کسی اور مذہب میں نہیں دیا گیا۔ اس نے تو اپنی صداقت تسلیم کرنانے کے لیے بی پہلے دن علم وعقل سے ہی اپیل کی تھی اور رسول اکرم ﷺ پر نازل ہونے والی پہلی وحی کے الفاظ ہی یہی تھے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ① خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ② اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ③ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ④ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ⑤ ۷۹

اسی طرح تعلیم کی اہمیت کو سمجھانے کے لیے حدیث نبوی بیان کی گئی ہے:

طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة ۸۰

اپنے مضمون میں انہوں نے کہا کہ اسلام دنیا کا پہلا دین ہے جس نے سعادتِ دارین کا واحد ذریعہ علم و بصیرت ہے۔ اسلامی ادوار میں دورِ بنی امیہ کا دور اسلامی تعلیمات سمیت علوم وفنون کی غیر معمولی ترقی کا دور تھا۔ علمائے تابعین جنہوں نے علوم کو غیر معمولی وسعت دی اسی عہد میں تھے۔ اس دور کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> حضرت امام اعظم ابو حنیفہ، جیسا عظیم فرزندِ ملت اسی دور میں پیدا ہوئے دینی علوم کی تدوین کا آغاز ہوا.......... شاعری خطابت انشاء کی کتابت، تفسیر، قرأت، فقہ انساب، حدیث، لغت اور نحو پر بیش بہا ذخیرہ وجود میں آیا۔ سیر و مغازی پر بھی مستقل تصانیف لکھی گئیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو تاریخ سے خاص شغف تھا اور سلاطین عجم کی تاریخ نیز اقوام قدیمہ کے عروج وزوال کی داستانیں شوق سے سنا کرتے تھے۔ اس زمانے میں حصول علم کے لیے دور دراز کی مسافتیں طے کی

جاتی تھیں اور لغت کی تعلیم کے لیے طلبہ بادیہ پیمائی بھی کرتے تھے۔۸۱

اسلامی نظام تعلیم پر بات کرتے ہوئے بہت ہی عمدہ اور سادہ طرز گفتگو اختیار کرتے ہوئے انہوں نے اسلامی نظام تعلیم کی خوبیاں بیان کی ہیں اور اس کے اہم نکات انتہائی مہارت سے مختصر اور جامع انداز میں بیان کرتے ہوئے گویا کوزے میں دریا بند کیا ہے۔ انہوں نے انتہائی حسین و جمیل طریقہ سے نکات بیان کیے ہیں، حافظ صاحب لکھتے ہیں:

> زندگی جو ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے تمام کی تمام رضائے الٰہی کے تابع ہونی چاہیے۔ یہ فلسفہ زندگی اسلام کے نظام تعلیم میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اس نظام نے دینی اور دنیاوی تعلیم کے درمیان کبھی حد فاصل قائم نہیں ہونے دی۔۸۲

اسلامی اور مغربی تعلیم کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اسلامی دنیا میں تعلیم کا یہی نظریہ کارفرما رہا۔ کسی کو حکمران بننا ہوتا یا انجینئر یا طبیب، سپہ سالات یا تاجر، قاضی القضاۃ یا دبیر، استاد یا وزیر اسے دینی اور دنیاوی تعلیم بیک وقت حاصل کرنی پڑتی اور نقطۂ مرکز دینی تعلیم ہوتا۔ اس کے برعکس اہل کلیسا کا نظام تعلیم صرف دنیاوی ضروریات پر استوار کیا گیا اور اس میں دینی علوم کو مرکزی حیثیت تو درکنار ثانوی حیثیت بھی نہ دی گئی بلکہ اس سے چند قدم آگے بڑھ کر کہیے کہ دینی حقائق کو باطل کر دینے کی کوشش کی گئی۔۸۳

حافظ بصیر پوری کے اس مضمون کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ مغربی معاشرہ اور نظام تعلیم کسی بھی طرح انسان کو زندگی کے ساتھ مکمل اور مربوط ہم آہنگی پیش نہیں کرتا جو اس کا سب سے بڑا عیب ہے جبکہ اسلام تعلیم کے معاملے میں دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لیکر چلنے کا قائل ہے جو اسلام کا بڑا وصف اور خوبصورتی ہے اسی خوبصورتی نے ایک زمانے تک اسلامی دنیا کو علم و حکمت کا مرکز بنائے رکھا۔ اسلام نصاب تعلیم کا مقصد بیان کرتے ہوئے حافظ صاحب لکھتے ہیں:

> اسلامی نظام تعلیم کا سب سے بڑا اور اہم خاصّہ یہ ہے کہ اس کے نصاب کا مقصد حقیق تزکیہ نفس اور تہذیب و اخلاق ہے۔ اسلام کے نزدیک تعلیم کی آخری منزل پسندیدہ عادات و اطوار ہیں نہ کہ معلومات کا انبار ..... جو علم صالح پیدا نہ کرے، قرآن حکیم کی اصطلاح میں اس کی مثال کتابوں کے اس پشتارے کی ہے جو گدھے کی پیٹھ پر لاد دیا گیا ہو۔۸۴

حافظ بصیرپوری کی تحریروں کو دینی، معتدل، لبرل اور الحادی تمام طبقات میں یکساں مقبولیت حاصل ہے جس کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ جہاں اسلامی نظام تعلیم کی خوبیوں کی بات کرتے ہیں وہاں ان کے عیوب و معائب بھی بیان کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ انتہائی قابل عمل حل تجویز کرتے ہیں۔

میں حافظ بصیرپوری کو جمالیات نگاری کا اہم ترین اور اعلیٰ ترین مصنف سمجھتا ہوں تو وہ اسی بنیاد پر کہ ان کے ہاں اعتدال و جمال دونوں کی کمی نہیں وہ المیہ بھی بیان کرتے ہیں اور طربیہ بھی ان کی مسائل پر نگاہ ہے تو اس کے ساتھ ساتھ وہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے سنجیدہ کوشش کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ جہاں وہ اسلامی تاریخ میں قدیم اساتذہ کے زاہد اور عابد ہونے کا اعتراف کرتے ہیں وہیں عصر حاضر میں درس وتدریس کا کام کرنے والوں کے طرز عمل پر نوحہ کناں بھی نظر آتے ہیں۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں لوگ عبادت و تقویٰ کی لذت سے بے خبر بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ موجودہ طبقہ اسلامی تعلیمات سے بیزار نظر آتا ہے۔

حافظ بصیرپوری موجودہ دور میں نظام تعلیم کو بہتر، اسلامی طرز معاشرت سے مربوط اور ہم آہنگ بنانے کے لیے حل پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے عرصہ دراز قبل جو حل پیش کئے ان میں سے آج کے دور میں بہت سے نکات پر عمل کیا جارہا ہے۔ کسی مشکل کا حل چونکہ کے تنقیح کے لیے ہوتا ہے، اور سقراط نے تنقیح کے عمل کو جمالیات کے عناصر میں سے ایک عنصر قرار دیا ہے جس کے بارے میں گذشتہ ابواب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ حافظ بصیرپوری نے تعلیمی نظام کی بہتری کے لیے جو تجاویز پیش کی ہیں ان میں کچھ کا مختصر دیکھا جانے موضوع اور مواد کی تفہیم کے مناسب معلوم ہوتا ہے۔

> صنعتی، شرعی، ٹیکنکل، میڈیکل، آرٹس اور دیگر تمام تعلیمی شعبوں کے خصوصی انتخابی مضامین کے سات ساتھ قرآن وسنت کی تعلیم ابتدا سے لیکر انتہا تک لازمی کر دی جائے۔
>
> تعلیم سرکاری اداروں کے علاوہ نجی اور پرائیویٹ صورت میں بالکل آزاد کر دی جائے بلکہ پرائیویٹ ادارون اور پبلک سکولوں کے اجرا و قیام کی حوصلہ افزائی کی جائے۔
>
> مدارس دینیہ کا نصاب جن میں درس نظامی پڑھایا جاتا ہے نئے سرے سے وقت کے تقاضوں کے مطابق مرتب اور سرکاری طور پر نافذ کیا جائے۔
>
> ایک بااختیار بورڈ تشکیل دیا جائے جو تعلیمی اداروں میں سے ایسے تمام عناصر کو نکال بارہ کرتے جو کھلم کھلا مخالفِ اسلام نظریات کا پرچار کر رہے ہیں۔

یہ بورڈ آئندہ اساتذہ کی سلیکشن میں مہارت مضمون اور قابلیت کے ساتھ ساتھ امیدواروں کی سیرت، ان کے کردار اور ذہنی میلانات کا جائزہ بھی لیا کرے۔ استاد کے مرتبہ جلیلہ پر ہر شخص فائز نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے عظیم اسلامی کردار، مکارم اخلاق، دیانت و امانت ورع و تقویٰ کے مقام اعلیٰ پر جائز ہونا نہایت ضروری ہے۔ اگر فوج میں کمیشن پانے کے لیے بے شمار آزمائشوں سے گزرنا ضروری ہے تو استاد کے انتخاب میں ہی اتنی سہولت کیوں؟

استاد کی تنخواہ کا سکیل اور معاشرہ میں اس کا مقام عام محکموں سے بالاتر ہونا نہایت ضروری ہے۔

مخلوط تعلیم بالکل ختم کر دی جائے۔ طالبات کو شرعی حد تک پردہ کا پابند قرار دیا جائے ممکن حد تک تعلیم کو عام اور مفت کر دیا جائے نیز بالغوں کے لیے بھی ضرورت کی مذہبی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔۸۵

حافظ بصیرپوری اپنی تمام کتابوں میں قرآن و حدیث کے حوالوں کے ساتھ ساتھ اردو عربی اور فارسی کے اشعار بھی ذکر کرتے ہیں ان کا یہی اسلوب انہیں دوسرے مصنفین و شعرا سے منفرد و ممتاز کرتا ہے۔ اپنے دوسرے مضمون "اسلام کا معاشرتی نظام" میں بھی وہ قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ تاریخ سے دلائل پیش کرتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کی بنیاد سے قبل کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے اسلامی معاشرے تک پہنچتے ہیں۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں:

تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کو جسمانی اور ذہنی طور پر غلام بنانے کے لیے جو حیلے اور حربے استعمال کرتا رہا ہے ان میں سے اکثریت کی بنیاد رنگ، نسل، دولت اور زبان وغیرہ پر رہی ہے۔ یہ صورتِ حال نوعِ انسان کی اجتماعی اور انفرادی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ تھی۔ اس سے انسانی شرف کو بٹہ لگتا تھا اور انسان کی ایک بھاری اکثریت خوش گوار زندگی سے محروم ہو جاتی تھی جو نوع انسان پر بڑا ظلم تھا۔ بہت سے ادیان و مذاہب اپنے اپنے معاشرتی نظام لیے ہوئے آگے آئے مگر ناکام رہے۔ وہ رنگ و نسل کے امتیازات ختم نہ کر سکے، دولت اور علاقائی عصبیت کے بت نہ توڑ سکے وہ ذات پات کے بندھن ڈھیلے نہ کر سکے اور ایک شودر کو برہمن کے برابر حقوق اور ذرائع

ارتقا مہیا نہ کر سکے۔ ایک اسلام تھا کہ جب آیا تو اس سیل رواں نے خود غرضی اور لالچ کے پیدا کئے ہوئے تمام نشیب و فراز برابر کر دیئے۔ فتح مکہ کے دن قریش کے مغرور سردار بھی گردنیں جھکائے آقائے دو عالم کی زبان فیض ترجمان سے یہ الفاظ سن رہے تھے۔

الناس من آدم و آدم من تراب لا فضل لعربی علی عجمی ولا لابیض علی اسود الا بالتقویٰ (حدیث)۸۶

مصنف نہ صرف اپنے ملک کے لوگوں کے لیے آواز اٹھاتے ہیں بلکہ ایک آفاقی دین کے علمبردار ہونے کے ناطے وہ ملک سے دور دراز ہونے والے ظلم و زیادتی اور پیش آنے والے المیہ پر بھی آواز اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں، اسی مضمون میں برطانوی معاشرے کے بارے میں لکھتے ہیں:

برطانیہ افراد معاشرہ کی آزادیٔ عمل کا بہت بڑا علم بردار بنتا ہے۔ مگر لندن میں آئے دن کالوں کے خلاف جو ہنگامے ہوتے رہتے ہیں وہ ان لفظی دعووں کا بھرم کھولنے کے لیے کافی ہیں۔ اک طرف تو وہ مساواتِ حقوق کا مدعی ہے دوسری طرف کینیا کی نوآبادی میں انگریز آباد کاروں نے جس بے رحمی سے حبشیوں کو بے وطن کیا وہ تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے۔۸۷

یہ المیہ بیان کرتے ہوئے اس کا تقابل اسلامی معاشرے اور معاشرت سے یوں کرتے ہیں:

وہ اسلام ہ ہے جس کے مرتب کردہ نظام مین محمود و ایاز کا فرق موجود نہیں بلکہ راہ ارتقا ہر ایک کے لیے کشادہ ہے۔ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جو عجمی النسل تھے عربوں کے بھی مقتدا نظر آتے ہیں اور مسلمان تاجداروں میں ایک لمبی فہرست ایسے ناموں کی ہے جو خود غلام تھے یا غلاموں کی اولاد تھے لیکن انہیں اور ان کی صلاحیتوں کو مسلمان معاشہ نے ٹھکرایا نہیں بلکہ انہیں آزاد لوگوں کی بھی رہبری کا موقع فراہم کیا۔۸۸

علامہ اقبال کے بعد اور گذشتہ صدی کے آخری نصف میں حافظ بصیر پوری ایک ایسے مصلح اور مبلغ کے طور پر سامنے آئے ہیں جنہوں نے اپنی قوم اور دین کے لیے سوچا اور لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے تحریر و تقریر سے کام لیا ہے۔ ایک دردِ دل رکھنے والے دانشور ہونے کے ناطے وہ حالات و واقعات سے افسردہ ہو کر تنقید کا سہارا لیتے ہیں اور مبلغ و مصلح ہونے کے ناطے سے اس بارے میں کچھ نہ کچھ حل پیش کرتے نظر آتے ہیں جس کو وہ سمجھتے

ہیں کہ اگر عمل میں لایا جائے تو اس سے تنقیح ہو سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> قانون موجود ہے مگر قانون کی بالادستی مفقود ہے، عدل و انساف کا بہرت شور ہے مگر جبر و استبداد اور فتنہ و فساد کا زور ہے، چادر اور چار دیواری کے تحفظ کا وعدہ ہے مگر چار دیواری شکستہ اور چادر دریدہ ہے۔ سکول، کالج بکثرت کھل رہے ہیں، تعلیمات پر اربوں روپے اٹھ رہے ہیں۔ تنخواہیں بڑھ رہی ہیں مگر تعلیمی اداروں میں تعلیم گھٹ رہی ہے، انارکی بڑھ رہی ہے، ٹیوشن کا کاروبار چمک رہا ہے مگر پاس Percentage خوب گھٹ رہی ہے اور پڑھے لکھے جاہلوں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہو رہی ہے جن کے کارناموں پر خاکم بدہن کئی صدیاں آنسو بہائیں گی۔۸۹

ان تمام مسائل اور صورتحال کا جائزے لینے کے بعد وہ ان سوالوں کے جواب دیتے ہوئے کیا ہی عمدہ جواب لکھتے ہیں اور ایک طویل جواب کو ایک لفظ میں سمیٹ دیتے ہیں۔ ان کے جواب میں جو تفصیل ہے وہ عام لوگوں کے لیے بیان کی گئی ہے جبکہ سلیم الحواس قاری کے لیے اتنا جملہ کافی ہے "ہم جو کچھ کرتے ہیں اس میں ملک اور قوم کا حصہ بہت کم ہے":

> ہم نے ایک قوم، ایک معاشرہ اور ایک سوسائٹی ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض سے چشم پوشی کر رکھی ہے۔ اسلامی اخلاقی اقدار کو پامال کر دیا ہے، اوسوۂ رسول اور مسلک صحابہ سے منہ موڑ لیا ہے۔ ایثار، دیانتداری اور فرض شناسی کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ حرص و آزاکا بھوت ہمارے سروں پر سوار ہے۔ خود غرضی، فرض سے کوتاہی منافع خوری،، ذخیرہ اندوزی، رشوت ستانی اور سود خوری لعنت کا طوق بن کر ہمارے گلے پڑ چکی ہے۔
>
> قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیں کام، کام، اور کام کی تلقین کرکے کس قسم کے کردار و عمل کی طرف راغب کیا تھا مگر اس کے باوجود انفرادی طور پر ہم جو کچھ کرتے ہیں، اس میں ملک اور قوم کا بہت کم حصہ ہوتا ہے۔۹۰

اسلام ہمیں جن بنیادی چیزوں کا سبق دیتا ہے اس میں صحت اور صفائی کا خیال رکھنا اہم ترین جزو ہے۔ پہلے باب کا آخری مضمون اسی عنوان کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ مضمون میں صفائی کے بارے میں سیر حاصل بات

چیت کی گئی ہے اور اس میں بھی منبع و مخرج جمالیات قرآن و حدیث سے حوالے پیش کیے گئے ہیں انہوں نے صفائی کے اس موضوع کو ہر ہر چیز کی صفائی ستھرائی اور تنقیح کا درس دیا ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون کی ابتدا ہی یہاں سے کی ہے:

> اسلام دین فطرت ہے، اسلام دین طہارت ہے، اسلام دین نظافت ہے، اس لیے جس قدر اسلام میں صفائی پر زور دیا گیا ہے کسی اور مذہب میں نہیں دیا گیا۔ ماحول کی پاکیزگی، نظافت و طہارت اور صفائی، اسلام کے نزدیک اتنی ضروری ہے کہ آنحضرت ﷺ پر نازل ہونے والی ابتدائی وحی میں ہی اس پر غیر معمولی تاکید فرمادی گئی ہے۔
>
> یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ [91]
>
> ظاہری صفائی کے ساتھ وہ باطنی صفائی کے بارے میں بھی قرآن سے دلیل پیش کرتے ہیں وہ قرآن کی آیت سے ثابت کرتے ہیں کہ باطنی طہارت اللہ سے رجوع کرنا اور اپنے گناہوں سے توبہ کرنا ہے اگر انسان اس عمل سے نہیں گزرتا تو وہ صفائی کے اسلامی احکامات سے یکسر نابلد یا اس کا منکر ہے:
>
> اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ۝ [92]

ظاہری اور باطنی طہارت کے علاوہ بھی اسلام ہر قسم کی صفائی ستھرائی کا قائل ہے اور یہی وصف انسان کو جانوروں سے ممتاز و منفرد کرتا ہے۔ یہ انسانی اور معاشرتی خوبصورتی کے لیے بہت ہی اہم ترین امر ہے۔ اور یہ امر کسی بھی انسان کی جمالیات حس کا عکاس ہے اور مصنف کا یہ موضوع انتخاب کرنا مصنف کے جمالیاتی ذوق و احساس کا پتا دیتا ہے۔ اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے حافظ بصیر پوریؒ لکھتے ہیں:

> اپنے ماحول کی طہارت و نظافت ہر سلیم انسانی فطرت پسند کرتی ہے بلکہ یہی چیز انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ بعض اوقات تو جانوروں تک میں بھی اس کا تقاضا محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ہم گائے یا بھینس کے متعلق محسوس کرتے ہیں کہ وہ بارش زدہ اور آلودہ جگہ کی بجائے صاف ستھری اور خشک جگہ پر رات گزارنا پسند کرتی ہیں اور کتے کو دیکھتے ہیں کہ وہ بیٹھنے سے پہلے اپنی دم سے جھاڑ دے لیتا ہے اور بلی کو

دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے بول و براز کو چھپا دیتی ہے تو ہم حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ اپنے ماحول کو آلودگی سے پاک دیکھنا تو جانوروں کی فطرت میں بھی داخل ہے۔۹۳

صفائی کے بارے میں احادیث نبوی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں "النظافۃ من الایمان" ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں "الطھور شطر الایمان" یعنی طہارت اور نظافت ایمان کا حصہ ہے۔ جب پاکیزگی ایمان کا حصہ ٹھہری تو ظاہر ہے کہ آلودگی کفر کا حصہ ہوگی۔ ایک روایت میں یوں بھی آیا ہے کہ "ان اللہ طیب ولا یقبل الا الطیب" (بیشک اللہ تعالیٰ پاک ہے اور صرف پاکیزہ کو ہی قبول فرماتا ہے)۔۹۴

تمام تر طہارتوں کے ذکر کرنے اور اس پر حسن و جمال سے بھرپور دلائل کے بعد خاص طور پر ماحولیاتی آلودگی کے خلاف بھرپور مہم چلانے کا کہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ہم دنیا کو صاف ستھرا نہیں رکھ سکتے تو وطن عزیز کے گلی کوچوں کو صاف ستھرا رکھیں۔

کتاب مذکورہ کا دوسرا باب سیرت النبی ﷺ پر مشتمل ہے جو مصنف موصوف نے نہایت عقیدت و محبت کے ساتھ بہت مختصر مگر بہت ہی جامع انداز میں پیش کیا ہے اگر ساری دنیا کی جمالیات کو ایک طرف رکھا جائے اور سیرت النبی ﷺ کو ایک طرف رکھا جائے تو دنیا بھر کی جمالیات حسن ماند پڑ جائے گا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ دنیا بھر کا حسن اندھیرے میں جا بیٹھے گا۔

اللہ رب العزت نے اپنے پیغمبر کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اوصاف میں جمال ہی جمال ہے وہاں کسی قسم کی کثافت کا سوچا بھی نہیں جا سکتا دنیا میں آپ ﷺ واحد شخصیت ہیں جن کا ہر عمل ہر کام اور ایک ایک حرف جمالیات سے بھرپڑا ہے۔

مضمون کا آغاز دو بہت خوبصورت نکات بیان کئے ہیں جن میں ایک حدیث پیش کی ہے جس میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ رب العزت نے سب سے پہلے میرے نور کا پیدا فرمایا" اس کے بعد دو مزید احادیث مبارکہ پیش کی ہیں جن میں ایک حدیث پہلی کی تائید میں جب کہ دوسری حدیث آپ ﷺ کے نور ہونے پر دلالت کرتی ہے:

حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں آیا: کُنتُ نبیًّا وَّ آدَمُ بَیْنَ الْمَآءِ وَالطِّیْنِ. میں نبی تھا جب کہ آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ کی روایت ہے۔ کُنتُ نُوراً بَینَ یَدَی رَبِّی قبل خلقِ آدم، میں تخلیق آدم سے قبل اپنے رب کے حضور ایک عظیم نور تھا۔۹۵

اس سے آگے آپ ﷺ کے اپنی والدہ کے بطن میں تشریف لانے اور مکہ کے سرسبز و شاداب ہونے کے بارے میں بیان کیا گیا ہے والد کے انتقال کی خبر دی گئی ہے اور پھر پیدائش کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پھر آپ کی پیدائش کی اطلاع جناب عبدالمطلب کو دینے کے بارے میں مطلع کیا گیا ہے۔

جناب عبدالمطلب اس وقت طواف کعبہ میں مشغول تھے۔ خبر ملی تو دوڑتے ہوئے آئے اٹھا کر آغوش میں اور بالہام ربانی نام محمد ﷺ تاکہ بچہ کی ساری دنیا تعریف و توصیف کرے۔ ابولہب کو اس کی لونڈی ثویبہ نے آکر خوشخبری دی کہ تیرے مرحوم بھائی کے گھر فرزند ارجمند پیدا ہوا تو ابولہب نے جوش مسرت میں انگلی کے اشارے سے ثویبہ کو آزاد کر دیا۔ یہ وہی ابولہب ہے جس نے ساری زندگی سخت کفر اور عداوت رسول میں صرف کر دی مگر اپنی کے سال بعد حضرت عباس کو خواب میں ملا تو آپ نے پوچھا تجھ پر کیا بیتی؟ بولا تم سے بچھڑ کر میں نے کوئی بھلائی نہ دیکھی، ہاں مجھے اس انگلی سے (دوزخ میں) پانی ملتا ہے۔ (جس سے عذاب میں تخفیف ہوتی ہے) کیوں کہ میں نے (میلاد محمد مصطفیٰ کی خوشی میں) ثویبہ کو آزاد کیا تھا۔۹۶

اس کے بعد سیدہ حلیمہ سعدیہ حجرہ میں آمد کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

بعد ولادت حلیمہ سعدیہ کے حصہ مٰں رضاعت کی سعادت آئی۔ حلیمہ انہیں اپنے گھر لائیں تو کونین کی نعمتیں حلیمہ کے گھر سمٹ آئیں۔ اونٹنیوں اور بکریوں کے تھن دودھ سے بھر گئے۔ نحیف و نزار جانور فربہ ہوگئے۔ چراگاہیں سرسبز و شاداب ہوگئیں۔ بنی سعد کے سب مکان خوشبو سے مہک اٹھے، حلیمہ کا دولت کدہ برکتوں اور رحمتوں کا گہوارہ بن گیا۔ قبیلہ بنی سعد کے تمام لوگ حصول برکات کے لیے اس کے گھر کی طرف رجوع کرتے۔ گویا بظاہر حلیمہ نے اس دریتیم کی پرورش کی مگر بباطن اس روف و رحیم نے حلیمہ اور اس کے اعزہ و اقارب کی تربیت

فرمائی ہے۔۹۷

اس کے بعد شق صدر کا بیان ہوا چھے سال کی عمر میں والدہ ماجدہ کا انتقال تو دادا کی کفالت اور دو سال کے بعد دادا کا انتقال اور جناب ابو طالب اور چچی فاطمہ بنت اسد کے پاس پہنچے۔

آٹھ برس کی عمر تھی کہ دادا داعیٔ اَجل کو لبیک کہا۔ ام ایمن کہتی ہیں کہ میں نے آپ کو اس روز دیکھا حضرت عبدالمطلب کے تابوت کے پیچھے پیچھے روتے جاتے تھے۔

بعد ازاں آپ کے چچا ابوطالب اور چچی فاطمہ بنت اسد نے آپ کو آغوش رافت میں لیا اور خوب حق خدمت ادا کیا۔ آپ کے چچا جان آپ کے بغیر کھانا نہ کھاتے تھے۔ قحط سالی کے دنوں میں قریش ان سے بار و باراں کی دعا کروانے آتے تو وہ اس سراج منیر کو ساتھ لیے دعا کے لیے نکلتے ہے۔۹۸

پھر تجارت کی غرض سے سفر شام اور بحیرا راہب سے ملنے کا حال بھی چند سطور میں درج کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کا بیان بھی کیا ہے۔

بارہ سال کی عمر شریف ہوئی تو ابوطالب کے ساتھ بغرض تجارت ملک شام کا سفر کیا۔ اسی سفر میں بحیرا راہب سے ملے جس نے دیکھا کہ بادل آپ پر سائبان تنا ہے اور جدھر بیٹھتے ہیں درختوں کی شاخیں بڑھ بڑھ کر سایہ گستر ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہود کے حسد کے پیش نظر آپ کو واپس لے جانے کا مشورہ دیا اور ابوطالب آپ کو واپس لے آئے۔ پچیس سال کی عمر میں قریش کی صدیقہ و عفیفہ، حسین و جمیل اور متمول خاتون حضرت خدیجہ سے ان کی خواہش پر باجازت ابوطالب نکاح فرمایا اور چالیس سال کی عمر میں اعلان نبوت..........

اس طرح وہ ہلال نبوت کمال کی منزلیں طے کرتا ہوا بدر رسالت بن کر چمکنے لگا اور کوکب جمال سراج منیر بن کر جگمگانے لگا ہے۔۹۹

اس کے بعد آپ ﷺ کا حلیہ مبارک مکمل طور پر بیان کیا گیا ہے آپ کی زلفوں کا بیان ہے چہرہ انور، آنکھیں، گوش مبارک ولب مبارک کا بیان ہے۔ حلیہ مبارک بیان کرتے ہوئے مصنف کے ذوق و شوق اور محبت کا اندازہ ان کے استعمال کئے جانے والے الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جس سے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ مصنف موصوف اپنے پیغمبر سے کس درجہ محبت رکھتے ہیں

منہ مبارک فراخ، خوشبودار، عارض تاباں ہموار، جن پر غازہ والشمس

...... سب سے زیادہ خوبرو، سب سے بڑھ کر خوش آواز، آواز میں یہ اعجاز کہ قریب و بعید کے لوگ برابر مستفید ہوتے۔

لعاب دہن کی شان کیا کہئے؟ یارِ غار کی ایڑی پر لگے تو مارِ غار کے زہر کا تریاق بنے .... شیر خدا خیبر شکن کی آنکھوں میں آئے تو آشوب چشم کا علاج بن جائے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہنڈیا اور آٹے میں پڑے تو روٹیوں اور بوٹیوں کے ڈھیر لگ جائیں۔ خشک کنویں میں ڈالیں تو آبِ حیات کے چشمے پھوٹیں۔ کھاری پانی میں گرے تو شیرۂ جاں بنادے۔۱۰۰

پھر زبان اقدس کی حلاوت کا ذکر کیا، ریش مبارک کا ذکر یوں فرمایا گیا۔

ریش مبارک گھنی اور خوشنما تھی جس میں تیل بھی لگاتے اور شانہ فرماتے۔ مشت بھر سے عموماً قدرے زیادہ رہتی۔ کبھی کبھی اس کے طور و عرض سے کچھ بال کم کرواتے اور بال شریف کٹواتے۔ آپ نے کبھی خضاب نہیں فرمایا، ریش مبارک اور سر اقدس میں بیس سے کم سفید بال تھے۔۱۰۱

حلیہ مبارک کا بیان سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں:

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے حبیب طبیب ﷺ کو وہ حسنِ زوال اور جمالِ باکمال عطا فرمایا جس کی تعریف و توصیف سے زبان عاجز اور قال قاصر ہے۔ آپ حسن کل ہیں اور حسن یوسف انہیں کا ایک پرتو .... حسینانِ عالم ان کے سامنے دم بخود۔

باوجودیکہ پورا حسن و جمال لوگوں پر ظاہر نہ کیا گیا اور اس دنیا میں غیرت حق کے ہزاروں حجابات میں مستور رکھا گیا، آج تک اس کی تسخیر کا عمل جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ روزِ محشر جب حجاب اٹھیں گے تو ان کی سج دھج دیدنی ہوگی۔۱۰۲

آپ ﷺ کے اوصاف بیان پر بات کی گئی ہے جس سے قبل مصنف نے ایک جملہ لکھا ہے جو آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

ان کی عادات علیہ اور صفات ثانیہ کا تفصیلی بیان در کنار، یہاں تو ایک وصف کے بیان میں زندگیاں ختم ہوئی جاتی ہیں اور قلم ٹوٹتے جا رہے

ہیں۔۱۰۳

ہمارا ایمان بھی ہے اور اللہ کا بیان بھی کہ آپ ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے اور آپ ﷺ کو سب جہانوں اور تمام تر مخلوقات خاص کر انسان کے لیے نجات دھندہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اسی بات کو مصنف اس طرح بیان کرتے ہیں:

> دنیا میں بہت سے ریفارمر، بہت سے مصلح، بہت سے دانشور، بہت سے فلاسفر، بہت سے ادیب و شاعر، بہت سے رہنما و رہبر اور بہت سے سیاسی لیڈر ہوئے ہیں مگر کسی کے کردار میں ایسی وسعت، آفاقیت اور عالمگیریت نہیں کہ ہر ایک اسے اپنے لیے نمونہ بنا سکے۔ یہ سرورِ کائنات، فخرِ موجودات علیہ التحیات والصلوات کی ہی ذات اقدس کا اعجاز ہے کہ ہر شخص اسے ذریعہ نجات بنا سکتا ہے۔۱۰۴

آپ ﷺ نے اپنی عمر کا ایک ایک لمحہ تبلیغ و ارشاد کی نذر کر دیا اس کام کی بجاآوری کے سلسلہ میں آپ کو کن کن مشکلات کا سامنا رہا، لیکن آپ ﷺ بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے جس درجہ فکر مند تھے اس کی مثال دنیا میں ملنا مشکل ہے آپ کی پریشانی کو دیکھ کر اللہ رب العزت کو آیات نازل کرنا پڑیں۔ اس حوالے سے حافظ بصیرپوری لکھتے ہیں:

> روایات و اخبار شاہد ہیں کہ آپ نے اپنی گراں مایہ عمر اقدس کا ایک ایک لمحہ تبلیغ و ارشاد کی نذر کر دیا۔ باگاہِ صمدیت سے بھی اظہار تشویش ہونے لگا۔
>
> لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝
>
> پیارے! کیا تم ان کے عدمِ ایمان کے افسوس میں اپنی جان گھلا دو گے؟۱۰۵

اللہ رب العزت نے قرآن عظیم میں امت مسلمہ کو "اے ایمان والو" کہہ کر خطاب کیا جبکہ دیگر امتوں کو ان کے ناموں سے خطاب کیا ہے۔ اس اہم ترین خصوصیت کے بارے میں مصنف یوں رقمطراز ہیں:

> ذرا اندازہ فرمائیے۔ کیا پیارا اندازِ خطاب ہے۔ سابقہ امم کے برعکس نام کی بجائے صفت سے پکارا گیا۔ کیوں کہ کسی کی اچھی صفت ذکر کر کے پکارنا اس کی عزت و حرمت اور قدر و منزلت کی دلیل ہے۔ اور یہ صدقہ ہے نسبت مصطفیٰ ﷺ کا۔۱۰۶

کتاب مذکورہ کا تیسرا باب شخصیات کے تذکرہ سے مزین ہے، اس باب میں تین شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے

جن میں شیخ عبدالقادر جیلانی غوث اعظم، جناب مجدد الف ثانی اور امام اہل سنت احمد رضاخاں بریلوی شامل ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانی غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں مختصر مگر جامع انداز میں ایک مضمون پیش کیا گیا ہے جس میں آپ کے بارے میں سیر اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں، حافظ صاحب نے لکھا ہے کہ سلسلۂ نسب کے اعتبار سے آپ حسنی و حسینی سید تھے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ والد کی جانب کا آپ کا نسب حضرت امام حسنؓ اور والدہ کی طرف سے حضرت امام حسینؓ سے ملتا ہے۔ مصنف موصوف نے آپ سرکار کی پیدائش کا ذکر یوں فرمایا ہے:

> آپ ۴۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ کل ۹۱ سال عمر پائی اور ۵۶۱ھ میں وصال فرمایا۔ عشق کے عدد ابجد کی رو سے ۴۷۰ھ ہیں اور کمال کے عدد ۹۱، گویا آپ کا سال ولادت ظہور عشق کا سال تھا اور ۹۱ سال تک عشق کمال دکھاتا رہا۔۱۰۷

آپ کے خاندان کے بارے میں یوں بیان کے ساتھ ساتھ آپ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ آپ مادر زاد ولی تھے اور صاحب کرامت تھے جن کے بارے میں اہل علاقہ نے شیر خوارگی کے زمانے میں ہی جان لیا تھا حافظ بصیر پوری لکھتے ہیں:

> آپ کے خاندان میں بہت بڑے بڑے صاحب کرامات بزرگ ہوئے۔ آپ کی پھوپھی حضرت عائشہ رحمہ اللہ تعالیٰ عنہا اس درجہ کی بزرگ تھی کہ ایک مرتبہ گیلان شہر میں سخت قحط پڑا، لوگ دعائیں کرتے مگر بارش نہ ہوتی۔ آخر آپ اٹھیں اور صحن میں جھاڑو دیا پھر کہا مولائے کریم! تیری کنیز نے جھاڑو دے دیا ہے، جھڑکاؤ خود فرمادے۔ چنانچہ فوراً موسلادھار پانی برسنا شروع ہوگیا۔ حضور غوث پاک مادر زاد ولی تھے۔ رمضان المبارک میں دن کو ماں کا دودھ نہ پیتے۔ اگر چاند ہونے یا نہ ہونے کا اشتباہ پیدا ہوتا تو لوگ معلوم کرتے کہ آپ نے دن میں دودھ پیا یا نہیں۔ قلائد الجواہر شریف میں لکھا ہے کہ جب آپ مکتب جاتے فرشتے ارد گرد چلتے۔ مجلس میں بیٹھنا چاہتے تو آوازیں آتیں: ''ولی اللہ کے بیٹھنے کے لیے فراخی کرو۱۰۸

اس کے بعد بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل بھی فرمائی اور ریاضات و مجاہدات کی بھی کثرت کی جناب غوث اعظمؓ کا قول یوں نقل کرتے ہیں:

> میں نے پچیس سال تک دنیا سے قطع تعلق کرکے عراق کے جنگلوں اور

صحراؤں میں مجاہدہ کیا۔ چالیس سال تک عشاء کے وضو سے نمازِ فجر ادا
کی۔ پندرہ سال تک ہر شب ختم قرآن حکیم کیا۔ بسا اوقات چالیس چالیس
روز تک کچھ نہ کھایا، گیارہ سال تک برج عجمی میں اللہ کی عبادت کی۔۱۰۹

آپؒ کی کرامات کے بارے میں بیان جاری رکھتے ہوئے حافظ بصیر پوری لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ دریائے دجلہ میں طغیانی آگئی۔ اہل شہر ہراساں ہو کر آپ کے
پاس حاضر ہوئے اور فریاد کی آپ عصا لے کر دریا کی طرف چل پڑے۔
کنارے پر پہنچ کر عصا پانی کی اصل حد پر گاڑ دیا اور فرمایا، بس یہاں تک۔
پانی فوراً گھٹنے لگا اور عصا تک آگیا۔۱۱۰

مولانا بصیر پوری علیہ الرحمۃ بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد آج تک دریائے دجلہ میں طغیانی نہیں آئی۔ معلوا ہوا کہ اللہ والوں کی حکومت دریاوں پر جاری وساری ہے۔ اس طرح آپ کے وعظ و نصیحت کا ذکر کرتے ہوئے مندرجہ ذیل ایمان افروز واقعہ بیان فرمایا ہے:

ایک دفعہ آپ وعظ فرما رہے تھے کہ بارش ہونے لگی۔ بادلوں کی طرف
دیکھ کر فرمایا، میں لوگوں کو جمع کر رہا ہوں تو منتشر کر رہا ہے۔ بادل فوراً
پھٹ گیا۔ جلسہ گاہ خشک رہی، ارد گرد بارش ہوتی رہی۔۱۱۱

حافظ بصیر پوری خود جناب غوث اعظم کی زبان مبارک سے ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ غوث تمام شہروں کو اس طرح ملاحظہ فرماتے تھے جس طرح ہتھیلی پر رائی کا دانہ دیکھا جاتا ہے، اسی طرح یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ غوث اعظم کے کسی مرید کا ستر مشرق میں ننگا ہو جائے اور وہ مغرب میں ہوں تو وہ ان کا ستر ڈھانپنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

جناب غوث اعظمؒ کے بعد حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا بارے میں بھی ایک عمدہ اور نفیس مضمون تحریر کیا ہے۔ جس کی ابتدا انہوں نے ایک تاریخی حقیقت سے کی ہے، حافظ بصیر پوری لکھتے ہیں:

ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا دور بھی آیا جب نام نہاد مسلمان بادشاہ
اکبر خدا بن بیٹھا۔ بعض غلط اندیش، بد باطن مسلمانوں اور ہندو مشیروں
نے اسے ایک ایسے غلط راستے پر ڈال دیا کہ رحمت الٰہی آڑے نہ آتی تو
ہندوستان میں اسلام کی صورت کا پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ اس نے مختلف
مذاہب کے چند اصولوں کو خلط ملط کرکے ایک نیا دین ایجاد کیا جس کا نام
''دین الٰہی'' رکھا۔
اس مذہب میں پیشانی پر قشقہ لگایا جاتا۔ مسجد در مندر، رام اور رحیم کے

ایک سا ہونے کا عقیدہ گھڑا گیا۔ بادشاہ خدا کا اوتار ٹھہرا۔ اکبر خود صبح سویرے اٹھ کر سورج کو سجدہ کرتا اور رعایا پر لازم کیا گیا کہ وہ شہنشاہ کو سجدہ تعظیم بجالائے۔۱۱۲

اس کے بعد امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کی پیدائش اور سلسلہ نسب کا ذکر کیا گیا ہے حافظ بصیر پوری رقمطراز ہیں:

یہ ہستی ابوالبرکات بدرالدین احمد المشہور امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی کی ذات ستودہ صفات تھی۔ آپ ۱۴ شوال ۹۷۱ھ کو بروز جمعہ سرہند شریف میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب ستائیس واسطوں سے حضرت فاروق اعظم سے ملتا ہے اس لیے آپ فاروقی کہلاتے ہیں۔ آپ بابا فرید گنج شکر کے ہم جد تھے کیوں کہ دونوں کا سلسلہ شیخ شہاب الدین علی المعروف بہ فرخ شاہ فاروقی سے جاملتا ہے۔ آپ کے ورود مسعود کی پیش گوئی حضرت محبوب سبحانی قطب ربانی غوث صمدانی جناب شیخ عبدالقادر جیلانی نے بھی فرمائی تھی۔۱۱۳

آپ کے سلسلہ تعلیم اور اساتذہ کا ذکر کیا گیا ہے فراغت اور زہد و تقویٰ اور مجاہدے کا ذکر کیا گیا ہے پھر آپ کے علوم و فیوض کے سلسلہ کا آغاز اور فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد سرہند شریف واپسی اور اپنے شیخ کے حکم سے مسند رشد و ہدایت پر جلوہ گر ہونے کا بیان ہے اسی دور میں گرد و نواح میں آپ کے کمالات کا غلغلہ بلند ہوا اور عوام و خواص کا جوق در جوق آپ کے حلقہ ارادت میں جمع ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ آپ کے صبر و استقامت کا ذکر ہے، طاعون کے دوران اہل خانہ کی اموات کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے کا ذکر ہے۔ جہانگیر کے تخت نشین ہونے اور امام ربانی کا اس کو سجدہ کرنے سے انکار کرنے اور قید میں ڈالے جانے کا ذکر اور اس کے بعد وہاں سے نکالے جانے کا ایمان افروز واقعہ بیان کیا گیا ہے، یہ بھی بیان کیا کہ آپ نے کیوں رہائی سے انکار کیا اور رہائی کے لیے کیا شرائط پیش کی تھیں۔ ان کی رہائی کے حکم اور انکار کا واقعہ جناب یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے پوری طرح مشابہت رکھتا ہے:

"جب آپ کو قید و بند میں گئے کافی عرصہ ہو گیا تو کہتے ہیں جہانگیر کی بیٹی کو خواب میں آنحضرت ﷺ کی زیارت فیض بشارت نصیب ہوئی اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم تمہارے باپ سے ناراض ہیں اس نے ہمارے نور نظر اور مقرب شیخ احمد سرہندی کو قید کر رکھا ہے۔ جہانگیر نے یہ خواب سنا تو بہت متاثر ہوا اور فوراً آپ کی رہائی کا حکم دیا اور اپنی کوتاہی کی معافی چاہی۔ آپ نے فرمایا: میں اس وقت تک جیل سے باہر نہ آؤں گا اور نہ ہی معاف کروں گا جب تک میری یہ شرائط منظور نہ کی جائیں گی۔

۱۔ ہندوؤں کے غلبہ کے باعث جو مساجد تباہ و برباد ہو چکی ہیں ان کی از سر

نو تعمیر کی جائے۔

۲۔ کفار سے شریعت مصطفیٰ کے مطابق جزیہ لیا جائے۔

۳۔ گاؤ کے ذبیحہ پر پابندی ختم کی جائے۔

۴۔ شاہی دربار میں سجدۂ تعظیمی بند کیا جائے۔

جہانگیر کا مقدر یاور تھا اس لیے یہ شرائط مان لیں اور تائب ہو گیا۔ ۱۱۴

حضرت مجدد الف ثانی کے بارے میں جناب مصنف کا بیان ہے کہ وہ اپنے شیخ طریقت تھے جو صاحب کشف و کرامات بزرگ تو تھے ہی لیکن اس بات سے بھی آگاہ تھے کہ عوام کشف و کرامات کی دنیا میں نہیں رہتے اس لیے وہ قرآن و سنت کی سیدھی سادی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے پر زور دیتے اور اسی کی تلقین کرتے۔ آپ ہی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے نظریہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی اصلاح کر کے لوگوں کو باطل نظریات سے کنارہ کشی میں مدد کی۔ آپ کی کرامات کا تذکرہ یوں شروع کیا ہے۔

"آپ سرتا پا اتباع رسول کے نشہ سے سرشار تھے اور استقامت علی الحق کو سب سے بڑی کرامت تصور فرماتے تھے۔ خوارق و کرامات کے دعویٰ سے ہمیشہ دور رہ کر اپنے مقلدین اور متبعین کو عمل کی اہمیت پر زور دیتے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے قرب خاص سے نواز رکھا تھا اور آپ اس مقام رفیع پر پہنچ چکے تھے جہاں

گفتہ او گفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اس سے بڑھ کر اور کیا بزرگانہ شان و کرامت ہو سکتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بنفس نفیس تشریف لا کر جہانگیر سے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور آپ کو قید و بند سے رہائی دلائی۔ ۱۱۵

حافظ بصیر پوری نے بیان کیا ہے کہ حضرت سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے دنیا سے رحلت کے بارے میں بھی قبل از وقت ہی پیش گوئی فرما دی تھی:

وفات سے چند ماہ پیشتر فرمایا کہ جناب رسالت مآب ﷺ نے اس دنیا میں بظاہر ۶۳ سال قیام فرمایا تو ان کا غلام اس سے زیادہ کیسے رہ سکتا ہے۔ حوادث نے بھی ضعف جسمانی کا غلبہ کر دیا تھا۔ آپ سرہند شریف میں خلوت گزیں ہو گئے تاہم آپ کے معمولات اور عبادت و ریاضت میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخری رات اپنے خدام اور اہل خانہ کو بتا دیا تھا کہ یہ میری آخری رات ہے۔ چنانچہ نماز فجر کے بعد ۲۸ صفر المظفر ۱۰۳۴ھ کو آپ واصل بحق ہو گئے۔ ۱۱۶

امام ربانی کے بعد جناب محسن اہلسنت امام شاہ احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر فرماتے ہیں۔ اپنے مضمون کی ابتدا ہی سے ان کے لیے رطب اللسان نظر آتے ہیں جس سے ان کی جناب احمد رضا فاضل بریلی شریف سے محبت اور عقیدت کا اندازہ کیا جانا کچھ مشکل کام نہیں ہے۔

> جسے عرب و عجم کے علماء نے خراج عقیدت پیش کیا۔
> جس کے زور قلم نے الحاد کے امنڈتے ہوئے طوفانوں کے رخ موڑ دیئے۔
> جس کی حق گوئی نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔
> جو کبھی کسی امیر و وزیر، راجہ و نواب اور وائسرائے کے در پر نہ گیا۔
> جس نے کبھی اتحاد و امن کے نام پر منافقت اور ریاکاری کا لبادہ نہیں اوڑھا۔
> جس کے قلم نے کینہ پرور سازشیوں کے نقابوں کے چیتھڑے اڑا دیئے۔
> جس کا قلم کبھی خوشامد اور مصلحت اندیشی کی غلاظت سے آلودہ نہ ہوا۔
> جس نے مزاج خسرواں کے مطابق کبھی مسائل تبدیل نہ کئے۔
> جس نے انگیز دشمنی کے بہانے کبھی کسی ہندو کانگریسی نیتا کو مسند رسول پر بیٹھنے نہیں دیا۔
> جس کے علم و عشق کے سیل رواں کے سامنے حرص و آز کے بند نہ باندھے جا سکے۔
> جس نے پچاس سے زیادہ علوم و فنون پر ایک ہزار سے زیادہ کتابیں اور رسائل لکھے۔۱۱۷

امام اہل سنت کے بارے میں ایک ایسا انکشاف کیا ہے جس سے ان کے مقام مرتبہ کا تعین بھی ہوتا ہے اور ان کے ولی کامل ہونے کی دلیل بھی سمجھ میں آتی ہے۔ ان کی پیدائش کی ذکر کرتے ہوئے مصنف موصوف لکھتے ہیں:

> آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۷۲ھ میں ہوئی۔ حروف ابجد کی رو سے آپ کا سال ولادت اس آیت کریمہ سے نکلتا ہے۔
> أُولٰئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ
> یہی لوگ ہیں جن کے دل میں خداوند قدوس نے ایمان لکھ دیا اور ان کو روح القدس کی تائید دی۔۱۱۸

حضرت امام اہلسنت کی ذہانت اور تقویٰ کے بارے میں مصنف نے یوں بیان کیا ہے:

"ذہانت کا یہ علام تھا کہ چار برس کی عمر میں ناظرہ قرآن ختم کیا، تیس روز میں حفظ کیا، چھ سال کی عمر میں کثیر مجمع کو خطاب فرمایا۔ چودہ سال کی عمر میں جملہ علوم معقول و منقول سے رارغ ہو کر مسند افتا پر فائز ہو گئے۔ نہایت کم سنی میں تقویٰ کے اعلیٰ معیار کی باتیں ان کے منہ سے نکلتیں۔ صرف پانچ سال کی عمر تھی۔ ایک لمبا سا کرتا پہنے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔ اچانک چند زنانِ بازاری کا ادھر سے گزر ہوا۔ آپ نے کرتے کا دامن اٹھا کر چہرہ ڈھانپ لیا۔ ایک عورت نے کہا واہ ننھے میاں آنکھیں تو ڈھانپ لیں اور ستر کھول دیا۔ آپ نے اسی طرح منہ چھپائے جواب دیا:

جب آنکھ بہکتی ہے تو دل بہکتا ہے اور جب دل بہکتا ہے تو ستر بہکتا ہے۔۱۹

جناب احمد رضا خاں بریلوی کے بارے میں ان کے ہم عصر اور بعد میں آنے والے لوگوں نے کیا کیا عمدہ اور شیریں رائے پیش کی ہیں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف نے کچھ احباب کی رائے نقل کی ہے:

> ڈاکٹر اقبال اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے دورِ آخر میں ان سا طباع اور ذہین فقیہ پیدا نہیں ہوا۔
>
> مولانا محمد علی جوہر نے انہیں عظیم ترین محقق، مصنف، ادیب، شاعر اور مردِ حق گو کے الفاظ سے یاد کیا۔
>
> سید سلیمان ندوی کہتے ہیں میں نے فاضل بریلوی کی چند کتابیں دیکھیں تو نظر خیرہ ہو کر رہ گئی۔ جتنی گہرائی ان کی تحریروں میں ہے میرے اساتذہ کی کتابوں میں بھی نہیں۔
>
> مولانا مودودی ایک جگہ یوں لکھتے ہیں: مولانا احمد رضا خاں کے بارے میں ہم لوگ سخت غلط فہمی کا شکار رہے ہیں۔ ان کی بعض تصانیف کے مطالعہ کے بعد مین اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو علمی گہرائی ان میں ہے بہت کم علماء میں پائی جاتی ہے اور عشق خدا اور رسول تو ایک ایک سطر سے پھوٹا پڑتا ہے۔۲۰

آخر میں ان کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے باب سوم کا اختتام کیا اور چوتھے باب کی طرف بڑھ گئے۔ چوتھا باب "اصلاحات و اخلاقیات" کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے جس کی ابتدا علمائے کرام اور علم کی فضیلت کے مضمون سے کی گئی ہے اس مضمون میں قرآن و حدیث سے علم اور علما کی فضیلت اور اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ انہوں نے صرف قرآن و حدیث سے ہی اپنے موضوع کو دفاع نہیں کیا بلکہ اس سلسلہ میں انہوں نے آئمہ، علما اور صوفیا کے اقوال بھی پیش کئے ہیں۔ سب سے پہلے آیت کریمہ پیش کی ہے

قُلۡ هَلۡ یَسۡتَوِی الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۝

ترجمہ: اے نبی کہہ دیں کہ کیا علم والے لوگ اور بے علم لوگ برابر ہو سکتے ہیں؟[۱۲۱]

اس کے بعد متعدد آیات کریمہ پیش کرتے ہیں جن میں اہل دوزخ اور اہل جنت کے برابر نہ ہونے کے بارے میں کہا گیا ہے اسی طرح پاک اور ناپاک چیزوں کے موازنہ میں بھی آیات پیش کر کے کہا ہے کہ یہ سب کچھ برابر نہیں ہو سکتا اسی طرح اہل علم کی فضیلت باقی تمام لوگوں پر قائم ہوتی ہے۔ پھر بیان کرتے ہیں کہ دنیا کو اب معلوم ہوا کہ تعلیم سب کے لیے لازمی ہونی چاہیے اس کے آگے سرکار دو عالم ﷺ کی حدیث مبارکہ پیش کی ہے اور کہا کہ آپ ﷺ نے چودہ سو برس ہی بتا دیا تھا کہ علم ہر انسان کے لیے ضروری ہے اس سلسلہ میں احادیث نبوی ملاحظہ ہوں

طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة

طلبِ علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

اطلبو العلم من المهد الی اللحد

پنگھوڑے سے قبر تک علم حاصل کرو

تدارس العلم ساعة خیر من احیآءھا

ایک ساعت کے لیے علم حاصل کرنا شب بھر کی نفلی عبادت سے افضل ہے۔[۱۲۲]

علمائے کرام کی فضیلت و اہمیت کا اندازہ اس بات سے کرنا چاہیے کہ ان کے بارے میں بے شمار احادیث وارد ہوئی ہیں صرف یہی نہیں سرکار دو عالم نے آج کے دور کے لیے بھی ہماری رہنمائی کی ہے، اس سے بھی علمائے کرام کی فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے۔

میری امت پر عنقریب ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ علما اور فقہا سے دور بھاگیں گے تو اللہ انہیں تین بلاؤں میں گرفتار کرے گا، پہلی یہ کہ ان کے کاروبار سے برکت اٹھالے گا۔ دوسرا ان پر ظالم حاکم مسلط کر دے گا۔ تیسرا دنیا سے بے ایمان جائیں گے۔[۱۲۳]

قرآن و حدیث کے بعد علما و صوفیا کے اقوال بھی نقل کیے گئے ہیں جو ذوق و شوق کی عمدہ علامت ہے۔ فقیہ ابواللیث ثمر قندی کا قول یوں نقل کرتے ہیں:

عالم کی صحبت میں رہنے والا جاہل اور عالم کا خدمت گار بے علم بھی سعادت دارین پالیتا ہے۔اس لیے علما طلبا کی محبت اور ان کی خدمت شعار بنالینا چاہیے۔۱۲۴

اس کے بعد ایک اور اہم ترین جمالیاتی موضوع تکبر کو موضوع سخن بنایا گیا ہے جس میں تکبر کے بارے میں لغت اور قرآن و حدیث کو سے دلائل لائے گئے ہیں۔ تکبر کو ایک انتہائی قبیح روحانی مرض قرار دیا گیا ہے۔اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ مرض جس قدر مہلک اور ہمہ گیر وخطرناک ہے اس کے علاج سے اتنا ہی تغافل برتا جارہا ہے۔

استکبار کے بارے میں مصنف نے سب سے پہلے لغوی معانی پیش کئے ہیں جس سے کسی بھی شخص کو یہ بات سمجھنے میں اسی آسانی ہوئی ہے۔ کلام کی ابتدا آیت کریمہ سے کی گئی ہے

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ

اہل لغت نے اس کا مطلب بڑائی کا اظہار لکھا ہے جسے عام مستعمل الفاظ میں فخر و غرور اور تکبر کہتے ہیں۱۲۵

قرآنی آیات کے بیان کے بعد بات کو مختصر کرتے ہوئے مصنف نے یوں بیان کیا ہے

اگر ہم تکبر پر فی نفسہٖ غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک برائی بہت سی برائیوں کا معجون مرکب ہے۔ مثلاً متکبر سب سے پہلے تو جھوٹ کا مرتکب ہوتا ہے کیوں کہ وہ ایسی صفت کا مدعی ہے جو اُس میں نہیں ہے یا اتنی مقدار اور کیفیت میں نہیں جتنی کا اسے دعویٰ ہے اور اس طرح لعنۃ اللہ علی الکذبین کی رو سے مردود ٹھہرتا ہے، دوسری برائی یہ ہے کہ وہ دوسروں کو دھوکہ دیتا ہے یا دینا چاہتا ہے تاکہ وہ اسے اتنا بڑا خیال کریں جتنا وہ نہیں اور وہ اپنی عظمت کا سکہ بٹھا کر چند ذلیل اور پست مقاصد میں کامیاب ہو، جھوٹ اور دھوکہ بازی عقلی اور نقلی طور پر صفاتِ بدترین ہیں۔۱۲۶

اس کے بعد انہوں نے اس مرض کا علاج بتاتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا علاج شکر ادا کرنا، محاسبہ کرنا اور اپنے محاسن کی حقیقت کی طرف نگاہ کی جائے، اور کسی کے منہ پر تعریف کرنے سے گریز کریں۔

اس کے بعد عیدالفطر پر ایک مضمون پیش کیا گیا ہے جس میں عیدالفطر، رمضان کی اہمت اور تزکیہ نفس بارے بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عیدالفطر کے شرعی مسائل بیان کئے گئے ہیں مضمون نگار نے ان چند سطور میں ایک بہت ہی اہم نفیس ترین نکتہ بیان کیا ہے جو اسلام کے بنیادی فلسفہ میں سے ایک ہے

یہ روز سعید خوشی کے اظہار کا دن ہے لہٰذا نماز عید کے بعد آپس میں ہدیہ

> تبریک پیش کرنا اور مصافحہ و معانقہ اخوت و محبت کے اظہار کے لیے مستحب ہے لیکن اسے بطور رسم نہیں اپنانا چاہیے بلکہ سینہ کو بھی بغض و کینہ سے پاک کر دینا چاہیے کیوں کہ دل نہ ملے تو سینے سے سینہ ملا دینے کا کیا فائدہ ہے ۱۲

اس کے بعد شان اولیا پر ایک مفصل مضمون پیش کیا گیا ہے جس میں اولیا کرام کی شان اور ان کے مقام و مرتبہ کو وسیع القلبی سے زیر بحث لایا گیا ہے اور اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ اللہ کے اولیا کو خوف و حزن کیوں نہ ہوگا یہ ایک عام بحث ہے جو ہر مصنف نے اپنے اس موضوع پر لکھے جانے والے مضمون میں کی ہے حافظ بصیر پوری کا سب سے اہم نفیس اور جمیل نکتہ اولیا کرام کی علامات پر ایک بحث ہے جو شاید بہت کم لوگوں نے اس طرح مدلل انداز میں کی ہو، ولایت کے بارے میں لوگوں کی عام رائے اور علامات ولی کے بارے میں حافظ بصیر پوری رقمطراز ہیں:

> لوگوں نے ولی کی علامات اپنی طرف سے مقرر کر لی ہیں۔ بعض اسے ولی سمجھتے ہیں جو عجوبے دکھائے۔ اس میں شک نہیں کہ ولی سے بھی کرامات کا صدور ہوتا ہے مگر عجائبات کو ہی مدارِ ولایت سمجھنا غلط ہے، کیوں کہ بہت سے کافر، سنیاسی، جوگی بھی عجیب و غریب کرتب دکھا لیتے ہیں اور دجال تو غضب ہی کرے گا، مردے جلائے گا، بارش برسائے گا اور عجائبات دکھائے گا۔ اسی لیے صوفیائے کرام نے فرمایا کہ اگر صرف ہوا میں اڑنا ہی ولایت ہے تو شیطان کو سب سے بڑا ولی ہونا چاہیے۔
>
> بعض کہتے ہیں ولی وہ جو تارک الدنیا ہو۔ لوگ کہا کرتے ہیں ولی کیا جو پیشہ رکھے مگر یہ بھی دھوکہ ہے۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام، حضرت عثمان غنی، حضور غوث الثقلین، امام ابو حنیفہ مولانا روم رضی اللہ عنہم بڑے مالدار تھے۔ کیا یہ لوگ ولی نہ تھے بلکہ یہ تو ولی گر تھے اور بہت سے سنیاسی، جوگی تارک الدنیا ہوتے ہیں۔ کیا وہ ولی ہیں؟ ہر گز نہیں بعض ہر بے عقل اور پاگل کو ولی سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ ہر وہ شخص جس کے دماغ کے پیچ ڈھیلے ہو جائیں ولی نہیں ہو جاتا بلکہ اولیاء کی ایک خاص نوع ہوتی ہے جنہیں مجذوب کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تجلیات الٰہی کی تاب نہ لا سکے اور ہوش و حواس کھو بیٹھے مگر ان سے بھی

سالکین کا مقام افضل ہے کیوں کہ مجذوب بے فیض ہوتا ہے سالک
فیض رساں، مجذوب کمزور ہوتا ہے سالک قوی۔ تو پھر ولی کی علامات کیا
ہیں؟آئیں قرآن حکیم سے فیصلہ کرائیں:

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ○

یعنی ولی وہ ہیں جو سچے ایماندار اور پرہیزگار ہیں۔ ۱۲۸

اولیائے کرام کی شان و مرتبہ کے بارے میں حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کا ایک مختصر اور ایمان افروز واقعہ بیان کیا گیا ہے جو چیخ چیخ کر شان ولایت بیان کرتا نظر آتا ہے۔

حضرت ابراہیم ابن ادھمؒ سلطنت بخارا چھوڑ کر مکہ معظمہ پہنچے اور وہاں
معتکف ہو گئے۔ ان کا بیٹا زیارت کے لیے وہاں حاضر ہوا، محبت پدری نے
جوش مارا، اُٹھ کر لخت جگر کو سینے سے لگایا۔ ندا آئی کہ اے ابن ادہم!
جس دل میں ہماری محبت ہو، کیا اُس میں کسی دوسرے کی بھی گنجائش
ہو سکتی ہے؟ ہمارے ساتھ مناجات ہو رہی تھی، ہمیں چھوڑ کر بیٹے سے
مشغول ہو گئے۔ عرض کیا۔ مولیٰ! میرے اس بیٹے کو موت دے دے۔
اب یہ خیال نہیں کہ لخت دل ہے، پارۂ جگر ہے، نور عین ہے، سینے کی
ٹھنڈک ہے، کلیجے کا چین ہے، راحت دل ہے، آرام جاں ہے، اب تو یہ
لحاظ ہے کہ محبوب کے سامنے آڑ بن گیا، اسے پھاڑ کر ہٹا دو۔ ۱۲۹

اس کے بعد مزاراتِ اولیائے کرام پر ایک مضمون ہے جس میں مزارات کی اہمیت اور افادیت اور اہل عرب کے مزارات منہدم کرنے کے عقائد کی مذمت ملتی ہے اس کے بعد دو اہم ترین مضمون "ماں، اور باپ" ہیں ماں کی عظمت، مقام و مرتبہ کے بارے میں اکثر مصنفین نے بہت عمدہ ذوق و شوق سے مضامین تحریر کئے ہیں جس میں اکثر مصنف احادیث نبوی سے ماں کی عظمت بیان کرتے ہیں اور ایسے مضامین کی بہت ہی کثرت ہے لیکن باپ کے مقام و مرتبہ کے بارے میں ہمیں بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر مضامین و مقالات ملتے ہیں "ماں" کے عنوان سے جو مضمون تحریر کیا گیا ہے اس میں کوئی اہم اور دقیق نکتہ بیان نہیں کیا گیا بلکہ عام طور پر وہی باتیں ہیں جو ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں اور اس سے بڑھ کر اور کچھ بھی بیان نہیں کیا، مثال کے طور پر، جنت ماں کے قدموں میں ہے، ماں کا حق ادا نہیں ہو سکتا، ماں بچے کو نو ماہ پیٹ میں لیے پھرتی ہے وغیرہ اسی طرح والد یعنی باپ کے لیے پیش کیا جانے والا مضمون بھی کسی اہم نکتہ یا کسی دقیق نکتہ کی وضاحت نہیں کرتا بلکہ اس کو بھی عمومی طور پر والدین کے عنوان پر بحث کا مرکز بنایا گیا ہے یا پھر اس مضمون میں وہ آیت پیش کی گئی ہیں جو نکاح کے باب میں وارد ہوئی ہیں جن میں مرد کے کفیل ہونے اور حق مہر اور نان نفقہ کی بات کرتے ہوئے کہا گیا ہے

کہ اس صورت میں مرد کو ایک درجہ فضیلت عطا کی گئی ہے۔

"ادب و ظرافت" کے عنوان سے کتاب کا پانچواں باب لکھا گیا ہے جس میں دو مضامین پیش کئے گئے ہیں اول "غالب بحیثیت شاعر" مضمون ہے جس میں غالب کی شاعری اور ان کی شاعری کے مختلف ادوار پر بحث کی گئی ہے اور غالب کے کلام سے کچھ نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ پہلے دور کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ آگرے کا عہد طفولیت سے جس میں جوانی کے ابتدائی سالوں کی رنگ رلیاں اور آزادیاں بلکہ بے راہ رویاں شامل ہیں۔ اور اس دور کی شاعری پر بات کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس دور کے اشعار میں شاعرانہ حسن کم ہے۔ آمد پر آورد غالب ہے۔

دوسرے دور کو ۱۸۲۱ء سے ۱۸۲۸ء بیان کیا گیا ہے اس دور میں ان کی طبیعت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اب مرزا کی طبیعت کا زنگ اتر گیا تھا۔ فارسی تراکیب اردو کلام میں کم ہو گئیں۔ خیالات بھی صاف اور خوشگوار ہو گئے۔ کلام میں بیدل اور صائب کی بجائے عرفی اور نظیری کا رنگ غالب ہو گیا۔

عشق کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا۱۳۰

تیسرے دور کی شاعری کو فنی پختگی کا دور کہا گیا ہے

"رزا نے اپنا دیوان مرتب کیا جو غزلیات پہلے لکھی ہوئی تھیں ان میں بعض جگہ ترمیم و تنسیخ بھی کی اور یہ حک و اضافت بڑی دلچسپ ہے۔ ذیل میں صرف دو شعر مثال کے لیے دیئے جاتے ہیں:

بوئے گل نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

یہی شعر پہلے یوں تھا

عشرت ایجاد و بوئے گل و دودِ چراغ
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا۱۳۱

پھر چوتھے دور کا ذکر کیا گیا ہے جس میں مصنف نے اس دور کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں اور یہ بیان کیا ہے کہ اس دور کی شاعری درباری دور کی شاعری کہلاتی ہے، حافظ بصیرپوری لکھتے ہیں:

یہ دور مرزا کی شاعری کا درباری دور ہے چونکہ دربار دہلی سے ان کے تعلقات قائم ہو گئے اس لیے انہیں درباری زبان یعنی اردو اپنانا پڑی۔ اس دور میں مرزا لطف زبان کو ندرت خیال پر ترجیح دینے لگے۔ آخری غزلیات میں تو خیالات، شگفتہ الفاظ اور دل پذیر طرز اظہار کے لیے محض زنگار آئینہ کا کام دیتے ہیں۔

اس نمایاں تغیر کی وجہ یہ تھی کہ بادشاہ اور شہزادے شاہ نصیر کے طرز کے مداح تھے جسے ذوق نے برقرار رکھا۔ چنانچہ مرزا بھی دیکھتے تھے کہ شاعروں میں وہی غزل مقبول ہوتی جس کی زبان سادہ اور آسان ہوتی اور جس میں تشبیہات و استعارات اس قدر کم ہوتیں جس طرح آٹے میں نمک اور جس میں روز مرہ اور محاورات کی افراط ہو۔ اس لیے مرزا کے رنگ تغزل میں بھی فرق آگیا مثلاً

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی
آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی[۱۳۲]

پروفیسر حافظ بصیر پوری کا بیان ہے کہ چوتھے دور کی شاعری میں ایسے بے شمار اشعار ہیں جن کے دو مصرعوں میں ہی شاعر نے جہانِ معانی سمو دیئے ہیں اور پڑھنے والے کے دل میں بھی لطیف خیالات اور شگفتہ تصورات ابھرتے ہیں، مثال کے طور پر:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

جب میکدہ چھٹا ہے تو پھر کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل ترا ہی سنگ آستاں کیوں ہو[۱۳۳]

سب سے آخر میں مرزا کی شاعری میں ظرافت کا ذکر کرتے ہوئے مصنف یوں رقمطراز ہیں:

ابتدائی دور میں مرزا کے اشعار اکثر معمہ ہوتے تھے۔ شاعرانہ حسن سے عاری، متین، اور سنجیدہ۔ لیکن جب مرزا کی زود حسی اور داخلی کشمکش پر ان کی عقل سلیم غالب آئی تو ان کے اشعار میں شگفتگی آگئی۔ جوں جوں انہیں زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہی ہوتی گئی وہ ان واقعات پر مسکرانے

لگے جن پر پہلے آنسو بہاتے تھے۔ مرزا کی عام شاعری کا میدان چونکہ وسیع تھا اس لیے شوخی اور ظرافت کو بھی انہوں نے چند مضامین تک محدود نہیں رکھا۔ ان کی ظرافت بھی پاکیزہ ہے اور تبسم زیر لب سے آگے کبھی نہیں بڑھی۔ تاہم اس میں وہ کسی کی رعایت نہ کرتے تھے۔ گاہے گاہے اپنے اوپر بھی ہنس لیتے تھے۔ مثلاً

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوبروؤں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں[۱۳۴]

غالب کے اس مضمون کا اختتام پانچویں دور کے بعد درباری تعلقات کے خاتمہ کے بعد دوبارہ سے فارسی اشعار گوئی کی طرف لوٹنے کا بیان ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بڑھاپے اور مصائب کے باعث وہ مضامین تو تلاش نہیں کر سکتے تھے اب محض الفاظ کو تراش خراش کر گزارا کر لیا کرتے تھے۔

پانچویں باب کا دوسرا مضمون "چلی جا رہی ہے خدا کے سہارے" ایک طنزیہ مضمون ہے جس میں ملکی حالات پر ایک بس، اس کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو علامت بنا کر گہری چوٹ کی گئی ہے۔ اس مضمون کا انداز مزاحیہ بھی ہے اور طنزیہ بھی۔ مضمون کی ابتدا حافظ بصیر پوریؒ نے یوں کی ہے:

> ہم اس بات کے کبھی قائل نہیں ہو سکے کہ کوئی ڈرائیور اچھا شاعر بھی ہو سکتا ہے.......... بالکل اسی طرح جس طرح کوئی شاعر اچھا ڈرائیور نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے.......... ڈرائیور شاعر ہو گا تو ہر قدم پر حادثہ ہو گا۔[۱۳۵]

مملکت خداداد پاکستان کو اس بس کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے اور اس بارے میں حافظ بصیر پوریؒ یوں رقمطراز ہیں:

> اگرچہ کچھ لوگ سرے سے ہی خدا کے قائل نہیں تاہم خدا رسیدہ لوگوں کو تو اس کے ماننے میں تامل نہیں ہونا چاہیے، آخر پاکستان کا نظام بھی تو

کسی کے سہارے چل رہا ہے۔۱۳۶

بس کی لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ایک طرف کھڑا کرنا اور پھر ڈرائیور کا فرار ہونا بھی اس ملکی نظام پر ہی چوٹ کی گئی ہے۔ ڈرائیور نے کنڈیکٹر سے جس چیز کے بارے میں سوال کیا وہی خراب تھی لیکن کنڈیکٹر کی جانب سے کوئی جواب نہ ملا۔ مضمون کا آخری پیراگراف ہمارے نظام خاص کر پولیس کے نظام پر ایک زبردست چوٹ ہے مگر افسوس کئی دہائیاں گزرنے کے بعد آج کا مصنف بھی ان معاملات کو بالکل اسی طرح لکھنے پر مجبور ہے جس طرح ہمارے اکابرین نے ان کو دیکھا، پرکھا اور لکھا ہے۔

> بس رکتی پڑتی خدا کے سہارے چلی جا رہی تھی، حتیٰ کہ اس چھوٹی سی نہر کے نازک موڑ پر جا پہنچی جو دیپالپور سے صرف ایک میل پر ہے، سامنے سے ایک ٹریکٹر مع ٹرالی آرہا تھا۔ دائیں جانب ایک گدھا گاڑی کپاس کی چھڑیوں سے لدی کھڑی تھی، ڈرائیور نے بس کو ذرا مزید بائیں جانب موڑا تاکہ ٹریکٹر گزر سکے، ادھر نشیب تھا پہیہ نیچے پھسل گیا بس بے قابو ہو گئی اور نہر میں اتر گئی۔ چھت کی سواریاں زور سے ایک دوسرے کے اوپر آگریں۔ جو اندر تھیں وہ بھی ٹکرا گئیں کئی ایک کو زخم آئے، خود میرے بازو پر سخت چوٹ لگی کہ درد سے بلبلا اٹھا۔ آخر بعد از خرابیٔ بسیار پیدل چل کر شہر تک پہنچے، راستہ بھر میں یہی سوچتا آیا کہ ناک کے بغیر بھی بس نے ڈوب مرنے کی کوشش کیوں کی اور اس پر اسے کیا سزا دلوائی جا سکتی ہے۔ بعد میں سنا تھا کہ پاکستان کی مستعد پولیس نے بس کے خلاف اقدام خودکشی کا مقدمہ درج کی بجائے بے گناہ ڈرائیور سے ایک ہزار روپے بطور تاوان وصول کر لیا ہے، خیر، کوئی قانونی بات ہو گی ہم سیدھے سادے لوگوں کو کیا خبر۔۱۳۷

کتاب کا چھٹا باب ''پاکستانیات'' کے عنوان سے مرتب کیا گیا ہے جس میں کل تین مضامین ہیں پہلا مضمون ''تحریک پاکستان کا پس منظر اور نظریۂ پاکستان'' جو ایک روایتی مضمون ہے جس میں پاکستان کے ایک نظریاتی مملکت ہونے سے ابتدا کی گئی ہے اور کچھ تاریخی حوالوں سے بات چلا کر ہندو، مسلم معاشرے کے بارے میں عمومی گفتگو کی گئی ہے اور تحریک آزادی سے دوقومی نظریہ اور نظریۂ پاکستان تک بات پہنچتی ہے۔ مسٹر جناح کی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے برصغیر کی علیحدگی کے بارے میں مسٹر جناح کی اس تقریر سے اقتباس پیش کیا گیا ہے جس میں مسٹر جناح نے ایک علیحدہ مملکت کا مطالبہ اور اس کی بنیادی وجہ کو محض ایک سطر میں پیش کر کے ثابت کر دیا تھا کہ حضرت قائد ایک عظیم مدبر، دانشور اور دوراندیش سیاسی بصیرت رکھنے والے مسلم رہنما ہیں

مسٹر جناح نے فرمایا:

ہم ہندوؤں سے کیسے مل جل کر رہ سکتے ہیں کہ جسے وہ پوجتے ہیں ہم اسے کھا جاتے ہیں۔۱۳۸

برصغیر میں انگریزوں کے مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کا تذکرہ کرتے ہوئے حافظ بصیر پوریؒ لکھتے ہیں:

انگریزوں نے ملک پر قبضہ جمانے کے ساتھ ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر انہیں اپنی حکومت کو مستحکم کرنا ہے تو ملک کے سابقہ حکمرانوں یعنی مسلمانوں کو پورے طور پر بے اثر بنانا ضروری ہے۔ اس منصوبے کے تحت مسلمانوں کی تباہی کا مکمل سامان کیا گیا، حکومت تو پہلے ہی ہاتھ سے نکل چکی تھی، سرکاری ملازمتوں کے دروازے بھی ان پر بند کر دیئے گئے۔ تعلیم، تجارت، ملازمت، غرضیکہ ہر میدان میں ہندوؤں کو آگے بڑھایا گیا۔ اس صورت حال کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۲ء تک دس سال میں ۲۴۰ ہندوستانیوں کو وکالت کی اجازت دی گئی جن مس صرف ایک مسلمان تھا۔ ۱۸۷۱ء تک ہندوستانی سرکاری ملازمین کی تعداد ۲۱۴۱ تھی جن میں صرف ۹۴ مسلمان تھے۔ ۱۳۹

حافظ بصیر پوریؒ نے یاددہانی کرائی ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے جس کی بنیاد اسلام کی بنیاد پر رکھی گئی تھی۔ آپ نے یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو بلند ترین دینی اور دنیاوی کامرانیوں کا ضامن و کفیل ہے۔

اس باب کا دوسرا مضمون قائداعظم محمد علی جناح کے یوم پیدائش کے حوالے سے لکھا گیا ہے جس میں عمومی باتیں کی گئی ہیں مسٹر جناح کی وکالت اور ان کے سیاسی تدبر اور ملت اسلامیہ کے لیے ان کا درد اور آزادی کے لیے جدو جہد کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف کے مضمون میں ایک تاسف اور افسوس کے ساتھ ایک المیہ کا ذکر ملتا ہے:

اب بھی اگر بابائے قوم کے فرمودات پر عمل کیا جائے تو عظمت رفتہ بحال ہو سکتی ہے اور ان کے دن منانے کا مقصد بھی پورا ہو سکتا ہے۔ کسی عظیم ہستی کے دن منانے کا اصل مقصد اس کے مشن کو زندہ رکھنا ہوتا ہے مگر افسوس کہ ہم نے پیغام کی بجائے صرف نام کو زندہ

رکھنے کی ٹھانی ہے۔۱۴۰

مسٹر جناح کے بعد قائد ملت نوابزادہ خان لیاقت علی خان کی شخصیت بارے مختصر مضمون ہے جو ان کی برسی کے موقع پر چھوٹے بچوں کی تقریب میں ایک تقریر ہے، اس میں بھی ان کے عمومی کاموں اور فرمودات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو ہمیں عام طور پر مطالعہ پاکستان کی کتابوں میں ملتی ہے۔ قائد ملت پاکستان کے پہلے وزیر اعظم اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے ان کو قائد اعظم محمد علی جناح کا قریبی معتمد ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ قائد ملت خان لیاقت علی خان پاکستان میں شرح خواندگی کو بلندی پر لے جانے کے خواہش مند تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ملک کی تعمیر و ترقی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو، اس بات کا ذکر کرتے ہوئے حافظ صاحبؒ رقمطراز ہیں:-

> آپ سارا زور حصول علم پر صرف کردیں۔ پاکستان کو ہر شعبۂ زندگی میں ماہرین کی ضرورت ہے۔ اگر آپ نے محنت نہ کی تو پاکستان کو چلانے کے لیے ہمیں مطلوبہ ماہرین نہ مل سکیں گے۔۱۴۱

مصنف موصوف نے قائد ملت کے دور کی یاد تازہ کرتے ہوئے بچوں کو بتایا کہ کس طرح ان کا مکا دنیا کے طول و عرض میں عمومی طور پر اور پاکستان میں شرقاً غرباً خصوصی طور پر مشہور ہوا اور آخر میں ان کے قتل کا ذکر کرتے ہوئے مضمون کا اختتام کردیا ہے۔

> مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ قائد ملت کے اس فولادی مکے پر چھوٹے چھوٹے منظوم قصے لکھے گئے جو بازاروں میں بکتے تھے اور بچوں کو کھانے کے لیے کھانڈ کی ایسی مٹھائیاں ملتی تھیں جو مکے کی شکل پر بن ہوئی تھیں۔۱۴۲

کتاب کا ساتواں باب تذکرہ اقبال پر مشتمل ہے جس کا عنوان "اقبالیات" رکھا گیا ہے جس میں مصنف نے علامہ اقبالؒ کا اپنے رسول ﷺ سے والہانہ محبت کا ذکر کیا ہے، اس کے ساتھ ہی تعلیم، سیاست، قوت ملیہ، تصور خودی اور اقبال کے مرد مومن بارے انتہائی اختصار کے ساتھ بات کی ہے اور موضوعات پر اپنی رائے کے ساتھ بطور ثبوت متعدد مقامات پر اقبال کے اشعار نقل کئے ہیں۔

> اگرچہ عشق کا لغوی معنی کسی ذات سے مخلصانہ اور والہانہ محبت ہے مگر وہ محبت ہی نہیں جو محب کو محبوب کی اطاعت اور اتباع سے عاری رکھے۔ پس عشق رسول اور طاعتِ رسول آپ میں لازم و ملزوم ہیں اور علامہ صاحب کی ذات میں یہ دونوں وصف جمع تھے۔ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے کہ پنجاب کی ایک دولت مند رئیس شخصیت نے ایک قانونی

مشورہ کے لیے علامہ صاحب اور بعض دیگر وکلاء و قانون دان اپنے ہاں بلائے۔ رات کو ڈاکٹر صاحب اپنے کمرہ میں آئے تو نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً خیال آیا کہ جس رسول پاک کی جوتیوں کے صدقے ہمیں یہ مرتبے نصیب ہوئے اس نے تو بوریے پر زندگی گزاری تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ برابر کے غسل خانے میں اپنا ذاتی بستر کھلوا کر سوتے رہے۔۱۴۳

مصنف حب رسول ﷺ کے واقعات میں ایک جگہ بیان کرتے ہیں:

"جب کوئی حاجی دیارِ حبیب سے آتا تو علامہ مرحوم اس سے بغل گیر ہو کر بچوں کی طرح بلبلا کر روتے۔ کیا عجب اسی درد و کرب میں گنبد خضرا کی زیارت بھی کرتے ہوں۔ وفات سے چند منٹ قبل بھی ان کی زبان پر یہی قطعہ تھا

سرودے رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید۱۴۴

حضرت علامہ اقبال آنحضرت ﷺ کا مقام عبدیت یوں بیان کرتے ہیں

عبد دیگر عبدہ چیزے دگر
ما سراپا انتظار او منتظر
عبدہ چند و چگونِ کائنات
عبدہ رازِ درونِ کائنات
مدعا پیدا نگردد زیں دو بیت
تانہ بینی از مقامِ مَارَمَیتَ۱۴۵

علامہ مرحوم شانِ مدینہ یوں بیان کرتے ہیں:

خاکِ طیبہ از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبراست۱۴۶

پیغمبر ﷺ سے محبت اور ان کی احادیث نبوی ﷺ کے بارے رائے مصنف علامہ کے الفاظ میں یوں پیش کرتے ہیں:

ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے یہ حدیث بیان کی اور تعجب کیا کہ حضور اصحاب ثلاثہ کے ساتھ احد پر تشریف لے گئے تو احد لرزنے لگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھہر جا! تیرے اوپر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں۔ اس پر پہاڑ ساکن ہو گیا۔ عمالہ درد کی تکلیف کے باوجود سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور زور دے کر کہنے لگے یاد رکھو! کہ ایک نبی کے زیر قدم مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز اٹھتے ہیں۔ مجازی طور پر نہیں واقعی لرز اٹھتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کے لیے کسی تاویل کی حاجت نہیں ہے ۱۴۷

علامہ اقبال کی شخصیت سے مصنف بہت عقیدت و محبت رکھتے تھے اور ان سے بہت متاثر بھی نظر آتے ہیں، اپنے ایک مضمون میں علامہ مرحوم کے تعارف میں اس طرح رقمطراز ہیں:

حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم اپنی ذات میں عظیم شخصیات کا مجموعہ تھے کیوں کہ وہ بیک وقت ایک نغز گو شاعر بھی تھے ایک ژرف بیں مفکر بھی، ایک نکتہ رس فلسفی بھی تھے، ایک بالغ نظر سیاستدان بھی، ایک صاحب طرز ادیب بھی تھے ایک مہربان استاد بھی، ایک ذہین قانون دان بھی تھے ایک فطین لیڈر بھی، ایک درد مند انسان بھی تھے ایک عاشق رسول مسلمان بھی، ایک جلیل القدر مقرر بھی تھے ایک عظیم ماہر تعلیم بھی ایک روشن دماغ ریفارمر بھی تھے اور ایک قلندر صفت درویش بھی۔ گویا وہ عظیم انسانوں کے اس قافلے کے فرد تھے جن کے متعلق میر نے کہا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں۱۴۸

تعلیم کے بارے میں مصنف نے علامہ اقبالؒ کے اشعار بھی نقل کئے ہیں، مصنف کا کہنا ہے کہ اسلام کا نظام تعلیم صرف دنیاوی ضروریات پر استوار کیا گیا ہے اور دینی علوم کو مرکزی حیثیت تو درکنار ثانوی حیثیت بھی نہ دی گئی اس کے بعد اقبال کا یہ شعر نقل کیا ہے:

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف۱۴۹

جب مسلمانوں میں تحقیق و جستجو کی بے قرار روح ختم ہو گئی اور انہیں مغربی علوم کا دست نگر ہونا پڑا تو انہوں نے ان مغربی علوم کو نقطۂ دین کے گرد منظم کرنے کی بجائے جوں کا توں رائج کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ علوم ہمارے پاس تو آگئے مگر پہلو میں الحاد اور بے دینی لیے ہوئے۔ علامہ اقبال مرحوم نے خود کافی عرصہ مغرب میں تعلیم پائی تھی اور مغربی تعلیم کے ان نقائص سے آگاہ تھے

عذابِ دانشِ حاضر ہے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل ۱۵۰

اساتذہ کرام کے بارے میں بھی مصنف کچھ مطمئن نظر نہیں آتے ان کے نزدیک یہ بھی ایک المیہ ہے اور اس المیہ کو محض انہوں نے ہی نہیں بلکہ اقبال نے بھی محسوس کیا تھا اور اقبال اپنے احساسات کو طنزیہ انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے ۱۵۱

اقبال اور سیاست کے عنوان سے پیش کئے جانے والے مضمون میں حافظ صاحب اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اگرچہ عملی سیاست میں انہوں نے نسبتاً کم حصہ لیا مگر بین الاقوامی سیاسی نظریات کی خوبیوں اور خامیوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے ایک مدت تک اپنے آپ کو عملی سیاست کی کشمکش سے الگ رکھا اور جب دوست نے انہیں مجبور کیا تو یہی جواب دیا

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش ۱۵۲

علامہ کی شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملوکیت کے نظام سے سخت نالاں رہے وہ سمجھتے تھے کہ دنیا نے زمین پر غاصبانہ قبضہ کرکے اس کو اپنی ملکیت بنالیا ہے اقبال کے مطابق ملوکیت کا یہ سیاسی نظام دراصل ابلیسی نظام ہے۔ اس بارے میں اقبال یوں بیان فرماتے ہیں:

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں ۱۵۳

اقبال توحید، نبوت ورسالت کو قوتِ ملی کے عناصر میں شمار کرتے ہیں اس کے ساتھ تسخیر کائنات کو بھی زندگی کی توسیع کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ تسخیر قرآن کے علم و عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ ملت اسلامیہ کو اپنے اندر قوت وتوانائی پیدا کرنے کے لیے اپنی سیرت کو پختہ بنانے کی تلقین کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اس حصول کے لیے صحرائے عرب کی طرف رخ کیا جائے۔ مسلمانوں کے روشن ماضی کے حوالے سے وہ کہتے

ہیں:

شرر زند از ماضیَ تو حال تو
خیزد از حال تو استقبال تو
مشکن ار خواہی حیات لازوال
رشتۂ ماضی ز استقبال و حال۱۵۴

اقبال کے مرد مومن کے بارے میں حافظ بصیرپوری نے یہ اشعار نقل کیے ہیں:

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو۱۵۵

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام تو ہے، جاوداں تو ہے۱۵۶

تصور خودی کے بارے میں اقبال نے کیا ہی خوب کہا ہے

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسیَ و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی۱۵۷

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق۱۵۸

اقبال کے کلام میں جو معنویت اور جمالیات پائی جاتی ہے اس کے لیے آج تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ان مختصر مضامین کی جمالیات پر بھی اگر بات کرنا چاہیں تو کئی دفاتر پر کئے جا سکتے ہیں:

(ج) دل میں اترتے حرف (نشری تقریریں)

اصل میں ریڈیو پاکستان سے مختلف اوقات میں نشر ہونے والے تقاریر جو بسلسلہ درسِ حدیث پیش کی گئی ہیں۔ ۲۴۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب کا زیرِ نظر ایڈیشن ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا اور اس کی اشاعت اکبر بک سیلرز، زبیدہ سنٹر ۴۰۔ اردو بازار لاہور سے ہوئی۔

مصنف موصوف نے کتاب کا انتساب اپنے استاد و مرشد مولانا ابوالخیر مولانا محمد نور اللہ نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کے نام کیا ہے۔ انتساب میں استاد مکرم وذی وقار کے لیے لکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد اگلے صفحات پر دو الگ الگ قطعات بھی لکھے گئے ہیں۔

جمالیات کے تصورات کی بات کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسے تمام مسودات جن کا مقصد اصلاح انسان ہے یہ ان کے درست راستے کی طرف راہنمائی کی گئی ہے ایسے مسودے کو جمالیات کا عمدہ منبع و مخرج قرار دیا جائے گا۔

آفاقی یا غیر آفاقی کسی بھی مذہب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر مذہب جس چیز پر بنیادی طور پر زور دیتا ہے وہ اچھے اخلاق ہیں۔ جب کہ اسلام کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسلام نہ صرف اچھے اخلاق پر زور دیتا ہے بلکہ وہ نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی شدت سے تلقین کرتا ہے۔ ظالم اور مظلوم دونوں کی مدد کا کہتا ہے۔ اسلام واحد مذہب ہے جو اپنے پیدا کرنے والے رب سے لے کر زمین پر موجود تمام مخلوقات کے حقوق کا تعین کرتا ہے اور یہ قرار دیتا ہے کہ اگر اس دنیا میں انسان کسی بھی طرح سے کسی دوسرے کا حق غصب کرکے بچ نکلے تو قیامت کے بعد میدان حشر میں اس کا جواب وحساب دیئے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔

ارسطو کے مطابق تنقیح کا عمل جمال اور افلاطون قانون اور اس کی عملداری کو بھی جمال کہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تنقیح کرنے والے ہر چیز اور مسودہ قانون کے تمام مصادر و مخارج جمالیات کے بہترین عناصر ہیں۔ جمالیات کی درست تعریف چند لفظوں میں مندرجہ بالا الفاظ میں کی گئی ہے اب اگر اس کو پھیلانے کی بات ہو تو اس پر دلائل بھی موجود ہیں جس کے لیے یہ صفحات بہت کم ہیں۔

اسلامی نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث سے زیادہ جمیل کوئی مسودہ دنیا میں ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن پاک صرف مسلمانوں کی کتاب نہیں ہے یہ ایک آفاقی پیغام ہے جو پوری انسانیت کے لیے رشد و ہدایت لیے ہوئے ہیں اور ہر اس انسان کے لیے منبع ہدایت ہے جو اس سے استفادہ کا خواہش مند ہو۔ اسی طرح پیغمبر اعظم ﷺ کی زندگی قرآن کی عملی صورت ہے۔ انہوں نے اپنے ابدی پیغام کو قرآن و سنت کی شکل میں ہمارے لیے چھوڑا جو بلا مبالغہ جمالیات کے عمدہ ترین اور جامع ترین منابع ہیں۔

زیر نظر کتاب چونکہ احادیث نبویہ کے دروس پر مشتمل ہے اس کا ہر ہر حرف جمالیات کا عمدہ نمونہ ہے۔ مذکورہ کتاب میں ستر تقاریر پیش کی گئی ہیں۔ کتاب میں اسماالحسنٰی، اسم اعظم، شکر، دعا، فضائل اہل بیت، تجارت، مسائل نماز، وضو، والدین کے لیے دعا، اور استغفار جیسے موضوعات پر بات کی گئی ہے۔ ان تمام موضوعات پر

مقصد انسانیت کی اصلاح اور اس کو درست راستے پر لانا اور قانون پر عمل داری کا سبق دینا ہے جو جمالیات کے عناصر میں سے ہیں۔

کتاب کے آغاز میں حافظ بصیرپوری اپنے پیغمبر ﷺ کا تعارف پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> کسی بھی الہامی مذہب میں نبی اور رسول کے بغیر ہدایت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ اسی پر ہدایت کا نزول ہوتا ہے، وہی بندوں کو اللہ کی ہدایت پہنچاتا ہے اور وہی اس کے اصولوں کی تشریح کرتا ہے۔ اس ہدایت کے نظام میں رسول کی حیثیت مرکزی اور بنیادی ہوتی ہے وہی انسانوں کی لیے ہدایت کا ماخذ ہوتا ہے، اس پر ایمان لانا اور اللہ کا مقرر کردہ رہنما ماننا نجات اور سعادت کی بنیادی شرط ٹھہرتا ہے۔ چونکہ اب دنیا کے آخری دن یعنی قیامت تک کے لیے اور پورے عالم انسانی کے لیے حضرت محمد ﷺ ہی اللہ کے نبی، رسول اور رہنما ہیں اور اللہ کی رضا اور اس کے قرب کے حصول کا وسیلہ انہی کی ذات ہے۔۱۵۹

کتاب کے ابتدائیہ میں حافظ بصیرپوری نے حافظ محمد نوراللہ کا شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے ان کے لیے یہ تقاریر ریڈیو پاکستان اسلام آباد سے نکلوا کر دیں جس سے اس کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی۔ یہ تقاریر دراصل ریڈیو پاکستان کے پروگرام حی علی الفلاح میں پیش کی گئی تھیں۔ یہ پروگرام بیک وقت دنیا کے ۲۳ سے زائد ممالک میں سنا جاتا ہے۔

کتاب میں پیش کئے جانے والے عناوین اور موضوعات کے بارے میں مصنف موصوف بیان کرتے ہیں کہ موضوعات اور عنوان کے اعتبار سے کچھ بیان مواتر اور مسلسل ایک ہی عنوان سے متعلق ہیں اور بعض مختلف اور متفادت، مصنف نے کچھ بیانات کی نقول دستیاب نہ ہونے پر قدرے تاسف کا اظہار بھی کیا ہے اور جن کتابوں سے استفادہ کیا ان کے لیے دعائے خیر کرتے ہوئے اپنا نوٹ ختم کیا ہے۔

''دل میں اترتے حرف'' کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس میں بیان کی جانے والی ایک بھی حدیث معلق نہیں ہے اور نہ ہی کوئی حدیث حوالے کے بغیر پیش کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ بصیرپوری ایک اعلیٰ پائے کے محقق بھی تھے انہوں نے اپنے تمام موضوعات کو مستند کتابوں سے نقل کیا ہے، ان کی ایک اور اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ شاعری ہو، غزل، نظم ہو یا نثر انہوں نے اپنی کسی بھی کتاب میں کوئی بھی اختلافی مسئلہ بیان نہیں کیا جس بنیاد پر انہیں اچھا جمالیات نگار تسلیم کیا گیا ہے۔

کتاب کی ابتدا اسمائے حسنیٰ سے کی گئی ہے مصنف نے بیان کیا ہے کہ مالک کائنات کا ذاتی نام صرف ایک ہی ہے ''اللہ'' جبکہ باقی نام صفاتی ہیں۔ واضح رہے کہ اللہ کے اسمائے گرامی قرآن و حدیث میں وارد ہوئے ہیں اور

انہی کو اسمائے حسنیٰ کہا جاتا ہے۔

> حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
> اللہ تعالیٰ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں جس نے ان کو محفوظ کیا اور ان کی نگہداشت کی وہ جنت میں جائے گا۔ ۱۶۰

حدیث کا مطلب و مدعا بیان کرتے ہوئے مصنف نے اپنے بیان میں واضح کیا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کو یاد کرلے گا اور ان کی نگہداشت کرے گا یعنی وہ ان کو پڑھتا رہے گا وہ جنت میں جائے گا۔

اسمائے حسنیٰ کے موضوع پر دو مختصر مضامین ہیں اس کے بعد اسم اعظم کے عنوان سے تین مضامین ہیں جن میں اسم اعظم کے بارے میں احادیث نقل کی گئی ہیں۔ اسم اعظم کے متعلق روایت میں ملتا ہے کہ ان اسمائے گرامی کو پڑھ کو ان کے وسیلہ سے دعا مانگی جائے تو مستجاب ہوتی ہے۔ اسم اعظم کے حوالے سے مندرجہ ذیل مشہور حدیث مبارکہ بیان کی گئی ہے:

> حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو اس طرح کہتے ہوئے سنا: اے اللہ! میں اپنی حاجب تجھ سے مانگتا ہوں اس وسیلے سے کہ بس تو ہی اللہ ہے، تیرے سوا کوئی مالک و معبود نہیں۔ تو یکتا ہے، بے نیاز ہے، نہ کوئی تیری اولاد، نہ تو کسی کی اولاد اور نہ تیرا کوئی ہمسر۔ رسول اکرم ﷺ نے سن کر فرمایا کہ اس بندے نے اللہ سے اس کے اسم اعظم کے وسیلہ سے دعا کی ہے کہ جب اس کے وسیلہ سے اس سے مانگا جائے تو وہ ضرور دیتا ہے اور جب اس کے وسیلہ سے دعا کی جائے تو ضرور قبول کرتا ہے۔ ۱۶۱

اسمائے حسنیٰ اور اسم اعظم کے متعلق خود مصنف نے یوں وضاحت فرمائی ہے جس سے بات پوری طرح واضح ہو کر روز روشن کی طرح عیاں واظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔ مصنف نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ حدیث میں کسی بھی طرح سے مختص نہیں کیا کہ یہ وہ اسما ہیں جن کے ساتھ لازمی دعا قبول ہوتی ہے۔

> مختلف احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے بعض وہ ہیں جن کے ذریعے دعا ضرور مقبول ہوتی ہے۔ ان اسما کو حدیث میں اسم اعظم کہا گیا ہے لیکن صراحت کے ساتھ اس کو متعین نہیں کیا گیا۔ ۱۶۲

اسم اعظم کے حوالے سے ایک اور حدیث بیان کی ہے جس میں تین آیاتِ کریمہ نقل کی ہیں جن کے بارے میں محققین نے بیان کیا ہے کہ ان کے وسیلہ سے دعا کی جائے تو مستجاب ہوتی ہے۔

اسما بن یزیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ
اللہ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں موجود ہے ایک وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ
اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۞ اور دوسری آیت آل عمران کی پہلی آیت
ہے.........الٓمّٓ ۞ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۞ ۱۶۳

قرآن و حدیث کو جمالیات کا عمدہ منبع و مخرج اسی بنیاد پر کہا گیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو کچھ بھی بیان کیا ہے اس کا مقصد انسانیت کی فلاح و اصلاح ہے اور ہر چیز کی تنقیح کرکے انسان کو ایک اچھے اور عمدہ راستے پر چلانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کے لیے دعا کرنے کا عمل بھی بتایا گیا ہے جس کی قرآن و حدیث میں تاکید ملتی ہے۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ظاہر اور باطن کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ کار پر گامزن کرے۔ ظاہر و باطن اور مال و اولاد کی پاکیزگی کے لیے احادیث نبوی میں مختلف دعاوں کا ذکر ملتا ہے اسی کو دعا کا موضوع بنا کر مصنف نے کچھ احادیث مبارکہ نقل کی ہیں۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایک دعا تعلیم فرمائی اور مجھ سے ارشاد فرمایا کہ ''تو کہہ اے اللہ! میرا باطن میرے ظاہر سے اچھا کر دے اور میرے ظاہر کو بھی اصلاح سے آراستہ فرما۔ اے اللہ تو اپنے بندوں کو (اپنے فضل و کرم سے) صالح گھر والے، صالح مال اور صالح اولاد عطا فرماتا ہے جو نہ خود گمراہ ہوں اور نہ دوسروں کے لیے گمراہ کن ہوں میں بھی تجھ سے ان چیزوں کا سائل ہوں۔ یعنی مجھے بھی اپنے فضل و کرم سے ایک اہل، پاکیزہ مال اور اچھی اولاد عطا فرما۔ ۱۶۴

حضرت ابوہریرہؓ سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے گو کہ یہ دعا کے موضوع میں ہے لیکن اپنی فکر اور اپنے مقام و مرتبہ کے اعتبار اس کا رتبہ بہت بلند ہے۔ ویسے تو اللہ کے رسول کا ہر ہر قول و عمل بلند مرتبہ اور اعلیٰ ہے مگر ان میں بھی کچھ ایسے ہیں جن کے مقام و مرتبہ کا تعین ہم لوگ محض اپنی سہولت کے لیے کرتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے آپؐ فرماتے ہیں کہ۔۔۔ میں نے ایک دعا رسول اللہ ﷺ سے سن کر یاد کی تھی۔ (وہ دعائیں میں برابر کیا کرتا ہوں) اس کو میں کبھی نہیں چھوڑتا (وہ یہ ہے) اے اللہ مجھے ایسا کر دے کہ میں تیری نعمتوں کے شکر کی عظمت و اہمیت کو سمجھوں (تاکہ پھر شکر میں کوتاہی نہ کروں) اور تیرا ذکر کثرت سے کروں اور تیری نصیحتوں کی پیروی کروں اور تیری وصیتوں اور حکموں کو یاد رکھوں (اور ان کی تعمیل سے غفلت نہ برتوں)۔ ۱۶۵

جہاں ہم اپنے لیے فلاح و اصلاح کی دعا کرتے ہیں وہاں ہمیں ایسے بہت سے معاملات پیش آتے ہیں جب ہمیں حاسدین شریر دشمنوں کا سامنا بھی رہتا ہے اس لیے ضروری تھا کہ ہماری رہنمائی کی جاتی کہ ایسے مواقع پر ہم اپنے رب کریم کو کس طرح پکاریں دعا کے اہم ترین موضوع میں اس موضوع کو بھی شامل کیا گیا ہے جس نے خطاب و کتاب کی شان و عظمت کے ساتھ حافظ بصیرپوری کو بھی مقام و مرتبہ عطا کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے، "اے میرے رب میری مدد فرما، میرے خلاف (میرے دشمنوں کی کارروائیوں میں ان کی) مدد نہ فرما، میری حمایت فرما (میرے مخالفین کی) میرے خلاف حمایت نہ فرما۔ اپنی لطیف خفیہ تدبیر میرے حق میں استعمال فرما، میرے خلاف استعمال نہ فرما۔ مجھے ٹھیک راستے پر چلا اور صراطِ مستقیم پر چلتے رہنا میرے لیے آسان فرما، جو کوئی مجھ پر ظلم و زیادتی کرے اس کے مقابلے میں میری مدد فرما۔ اے پروردگار! مجھے بنا دے اپنا خوب شکر ادا کرنے والا۔ خوب ذکر کرنے والا۔ اپنے سے بہت ڈرنے والا۔ سراپا اطاعت گزار و فرمانبردار، اپنے حضور میں عاجزی اور نیاز مندی سے جھکنے والا، نرم خو اور تیری بارگاہ کرم کی طرف رجوع کرنے اور پلٹنے والا۔ اے میرے رب میر توبہ قبول فرما لے، میرے گناہوں کے میل کچیل کو دھو دے۔ میری دعا قبول فرما، میرا ایمان (جو آخرت میں میرے لیے حجت بننے والا ہے اس کو) مستحکم کر دے، میری زبان کو ٹھیک چلنے والا بنا، میرے دل کو ہدایت بخش دے اور میرے سینے سے کینہ اور ہر قسم کی کھوٹ نکال دے۔ ۱۶۶

دنیا اور آخرت کے موضوع پر دعائیں تعلیم فرمائی گئی ہیں۔ علمائے کرام کا کہنا ہے بہترین دعا یہ ہے کہ دین دنیا اور آخرت کی بھلائی طلب کی جائے۔ اس بارے میں ایک عمدہ حدیث نقل کی گئی ہے۔

حضرت عائشہؓ سے رایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایک بار ایک جامع دعا تعلیم فرمائی "یعنی اے اللہ! میں تجھ سے ہر قسم کی خیر اور بھلائی مانگتی ہوں۔ دنیا کی خیر بھی اور آخرت کی خیر بھی، وہ خیر بھی جس کو میں جانتی ہوں اور وہ بھی جس کو میں نہیں جانتی اور میں تیری پناہ چاہتی ہوں ہر قسم کے شر اور برائی سے دنیا کے شر سے بھی اور آخرت کے شر سے بھی۔ اس شر سے بھی جس کو میں جانتی ہوں اور اس شر سے

بھی جس کو میں نہیں جانتی۔ اے میرے اللہ تیرے خاص بندے اور پیارے نبی ﷺ نے جس جس خیر کا بھی تجھ سے سوال کیا میں تجھ سے اس کی سائل ہوں اور جس جس شر سے انہوں نے تیری پناہ چاہی اے اللہ میں بھی اس شر سے تیری پناہ چاہتی ہوں۔ اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتی ہوں کہ جو فیصلہ تو میرے حق میں فرمائے وہ میرے لیے بھلائی اور خیر کا ضامن ہو۔١٦٧

دعا کے بعد لازم تھا کہ اس کے نتائج پر بھی بات ہوتی انسانی فطرت ہے کہ جب وہ کسی کام کو انجام دیتا ہے تو اس کے نتائج کے بارے میں بہت ہی سرعت اور اندیشہ سرعت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے ضروری تھا کہ لوگوں کی اس طرف بھی رہنمائی کی جاتی کہ دعا کرنے کے نتائج کیا ہوتے ہیں اور دعا قبول ہوتی ہے یا نہیں اگر دعا قبول نہیں ہوتی تو اس دعا کو کہاں رکھا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں بھی حافظ بصیرپوریؒ نے عمدہ حدیث بیان کی ہے جس سے روح میں فرحت اور تازگی کا احساس دو چند ہو جاتا ہے:

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مومن بندہ کوئی دعا کرتا ہے جس میں کوئی گناہ کی بات نہ ہو اور نہ قطع رحمی ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو تین چیزوں میں سے ایک چیز ضرور عطا ہوتی ہے یا تو جو اس نے مانگا ہے وہی اس کو ہاتھوں ہاتھ عطا فرما دیا جاتا ہے، یا آنے والی کوئی مصیبت اور تکلیف اس دعا کے حساب میں روک دی جاتی ہے۔ صحابہ نے عرض کیا جب بات یہ ہے کہ ہر دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور اس کے حساب میں کچھ نہ کچھ ضرور ملتا ہے تو ہم بہت زیادہ دعائیں کریں گے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔١٦٨

حضرت جابرؓ کی ایک حدیث ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اس بندے کو جس نے دنیا میں بہت سی ایسی دعائیں کی ہوں گی جو بظاہر دنیا میں قبول نہیں ہوئی ہوں گی ان دعاؤں کے حساب میں جمع شدہ ذخیرہ آخرت میں عطا فرمائیں گے تو بندے کی زبان سے نکلے گا "اے کاش کہ میری کوئی بھی دعا دنیا میں قبول نہ ہوئی ہوتی اور ہر دعا کا پھل مجھے یہیں ملتا۔١٦٩

دعا کے بعد اہل بیت اطہار کے مقام و مرتبہ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے اور ان کے فضائل بیان کئے گئے

ہیں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہیں کہ دنیا میں سب سے بہترین گھرانہ اللہ کے رسول کا گھرانہ ہے اس طرح ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ دنیا کا بہترین گھرانہ ہی بہترین جمالیاتی صفات و اعمال کا مرقع ہے۔ رسول کے گھرانے کی صفات ظاہری اور باطنی کے بارے میں خود اللہ رب العزت کی کیا چاہت رہی اس بارے میں یہ حدیث ملاحظہ ہو:

> حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا ایک صبح نبی کریم ﷺ نکلے اس حال میں کہ آپ ﷺ کے اوپر کالے بالوں کی بنی ہوئی ایک منقش چادر تھی پس حسن بن علیؓ آئے تو آپ ﷺ نے انہیں اس میں داخل کر لیا۔ پھر حسینؓ آئے تو ان کے ساتھ وہ بھی اس میں داخل ہو گئے۔ پھر فاطمہؓ آئیں تو آپ نے انہیں بھی داخل کر لیا۔ پھر علیؓ آئے تو انہیں بھی داخل کر لیا۔ پھر کہا اے اہل بیت اللہ تعالیٰ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے ہر قسم کا میل کچیل دور کر دے اور تمہیں خوب پاک و صاف کر دے۔۱۷۰

سیدہ فاطمہ الزہرہؓ کے فضائل میں ایک طویل حدیث نقل کی گئی ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے انہیں اس مادی دنیا سے اپنے پردہ فرمانے اور جنت میں سب سے پہلے ان سے ملنے کی بشارت کے ساتھ ساتھ انہیں جنتی عورتوں کی سردار ہونے کی بشارت بھی سنائی تھی۔ ایک دوسری حدیث بیان کی گئی ہے جس میں حضرۃ خاتون جنت کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا گیا ہے

> فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔۱۷۱

اہل بیت کے حوالے سے جناب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل نقل کیے گئے ہیں جن میں ایک اہم حدیث بیان کی ہے:

> حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کو فرمایا تو مجھے ایسے ہے جیسے ہارون موسیٰؑ کو تھے، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔۱۷۲

اس کے بعد جناب حسنین کریمینؓ کے بارے میں حدیث مبارکہ نقل کی گئی ہے

> عبدالرحمٰن بن ابی نعم سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے عبداللہ ابن عمر کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یخرج منہما اللولو والمرجان حسنؓ و حسینؓ دنیا میں میرے دو پھول

ہیں۔۱۷۳
اسی طرح ایک اور حدیث میں کائنات کے دو شہزادوں کے فضائل کی بابت یہ حدیث بیان کی گئی ہے:

> ''حسن اور حسین جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں''
> حسین مجھ سے ہیں اور میں حسین سے ہوں''۔۱۷۴

جہاں نبی کریم، رحمۃ العالمین ﷺ نے ہمیں اللہ سے ڈرنے اور اس کے حضور میں دعا کرنے اور عبادت کرنے کے آداب سکھائے وہاں اٹھنے بیٹھنے اور لباس پہننے کے بارے میں بھی رہنمائی کی ہے، اس موضوع کو بھی حافظ بصیر پوری نے اپنی تقاریر میں جگہ دی ہے۔ حدیث مبارکہ میں ہماری رہنمائی اس حد تک کی گئی ہے کہ لباس کے ساتھ ساتھ جوتے کی اہمیت تک کو واضح بیان کیا ہے۔ اور کس خوبصورتی کے ساتھ جوتے پہنے اور اتارنے تک کے بارے میں رہنمائی کی ہے:

> حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ جہاد کے ایک سفر پر روانہ ہو رہے تھے۔ میں نے آپ ﷺ کو سنا، آپ ﷺ ہدایت دے رہے تھے کہ لوگو! جوتیاں زیادہ لے لو کیونکہ آدمی جب تک پاؤں میں جوتا پہنے رہتا ہے تو وہ سوار کی طرح ہوتا ہے۔۱۷۵

اس سے بھی بڑھ کر یہاں تک بھی بیان کیا گیا ہے کہ جوتا کیسے پہنا اور کیسے اتارا جائے:

> حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی جوتا پہنے تو پہلے دائیں پاؤں میں پہنے اور جب نکالنے لگے تو پہلے بائیں پاؤں سے نکالے (الغرض) دایاں پاؤں جوتا پہننے میں مقدم اور نکالنے میں موخر ہو۔۱۷۶

عورتوں کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے بہت سے احکامات صادر فرمائے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عرب کے اس جاہل معاشرے میں جہاں عورتوں کو کوئی حیثیت تو کیا جینے کا حق تک حاصل نہیں تھا۔ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زمین میں زندہ گاڑھ دیا جاتا تھا۔ پیغمبر اعظم ﷺ نے جب اپنا سایہ شفقت نسل انسانی پر ڈالا تو سب سے پہلے تو عورت کو جینے کا حق دیا اور حکم دیا کہ آئندہ سے کوئی بیٹیوں کو قتل نہ کرے پھر ان بیٹیوں کو برابر کے حقوق عطا فرمائے اور ان لوگوں کی رہنمائی کے لیے اپنی بیٹی سے محبت کی مثال پیش کی۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے عورت کی اہمیت کو سمجھا اور اس کو واضح کیا۔ آپ ﷺ نے بتایا کہ عورت ایک انمول خزانہ ہے اور خزانہ نمائش کی نہیں چھپانے کی چیز ہوتی ہے یہی وجہ ہے اسلام نے عورت کو پردے میں رہنے کا حکم دیا۔ اس کا مقصد عورت پر پابندی لگانا نہیں بلکہ اس کی اہمیت اور بڑائی کو بیان کرنا تھا تاکہ معلوم ہو سکے کہ عورت کس قدر اہم اور خاص ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: عورت گویا ستر ہے (یعنی جس طرح ستر کو چھپا رہنا چاہیے، اسی طرح عورت کو گھر میں اور پردے میں رہنا چاہیے) جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیاطین اس کو تاکتے اور اپنی نظروں کا نشانہ بناتے ہیں۔ ۱۷۷ے

نبی کریم بعثت سے قبل تجارت فرمایا کرتے تھے اور احادیث نبویﷺ میں کاروبار کرنے کے بہترین اصول بیان کئے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے خرید و فروخت، کرنے کا طریقہ کار بتایا جس میں صارف اور تاجر دونوں کو برابر کے حقوق ملے۔ نبی کریم ﷺ نے ایسی کسی چیز کی بیع و فروخت سے روکا ہے جو آپ کے پاس موجود نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے صارف کو چیز پسند نہ آئے یا ہو سکتا ہے کہ وقت مقررہ پر کسی وجہ سے مطلوبہ چیز ہی دستیاب نہ ہو تو اس میں اندیشہ فساد ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کا کمال ہے کہ وہ فساد کے اندیشے پر ہی اس کام سے روکتے ہیں:

حضرت حکیم بن حزامؓ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے روک دیا کہ میں ایسی چیز کو بیع کروں یا فروخت کروں جس کا وجود ہی میرے پاس نہ ہو۔ ۱۷۸ے

اسی موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے اور فساد فی الارض کے اندیشے کے پیش نظر اللہ کے رسول نے فروخت کا ایک آفاقی اصول بیان کیا ہے

حضرت عبداللہ بن عمر فاروقؓ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص خوراک یعنی غلہ وغیرہ خریدے تو جب تک اسے اپنے قبضے میں نہ لے لے اُس وقت تک فروخت نہ کرے۔ ۱۷۹ے

انسان پر کبھی ایسا وقت آجاتا ہے کہ وہ اپنی کسی مجبوری کی بنا پر اپنی کسی ضرورت کے لیے اپنی کوئی چیز فروخت کرنے پر تیار ہو جاتا ہے ایسی خرید و فروخت سے سرکارِ دو عالم ﷺ نے منع فرمایا ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کی خدمت اور مدد کی جائے تاکہ اس کا مشکل وقت گزر جائے اور اسے کوئی چیز فروخت نہ کرنی پڑی۔ اسی طرح جو چیز موجود نہ ہو اس کی بھی خرید و فروخت سے منع کیا گیا ہے اس بارے میں گذشتہ حدیث بیان بھی ہو چکی ہے۔ اسی طرح کسی کھیتی یا باغ وغیرہ کی پیداوار کو اس کے تیار ہونے سے پہلے خریدنے اور بیچنے سے منع فرمایا ہے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل حدیث ملاحظہ ہو:

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ نے بیع

مضطر، بیع غرر اور پھلوں کی تیاری سے پہلے ان کی بیع سے منع فرمایا ہے۔
۱۸۰

اللہ کے نبی تجارت فرماتے رہے آپ ﷺ نے کاروبار کے لیے جو زریں اصول مرتب و مقرر فرمائے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تاجر اپنے مال کا عیب بتائے بغیر فروخت نہ کرے۔ یہ بھی ایسا ہی معاملہ ہے کہ اس سے اولاً تو صارف کو نقصان پہنچتا ہے اور دوسرے جب عیب معلوم ہو گا تو فریقین میں لازمی طور پر جھگڑا ہو گا اسی لیے آپ ﷺ نے عیب دار مال کو بغیر عیب بتلائے بیچنے سے منع فرمادیا۔ ایک حدیث مبارکہ اس بارے میں بھی ملاحظہ فرمائیں:

> حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ غلہ کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے جو کسی دکاندار کا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اُس ڈھیر کے اندر داخل کر دیا تو آپ ﷺ کی انگلیوں نے نمی محسوس کر لی۔ اس پر آپ ﷺ نے اس غلہ فروش دکاندار سے فرمایا کہ تمہارے ڈھیر کے اندر یہ نمی کیسی؟ اس نے عرض کیا غلہ کے ڈھیر پر بارش کی بوندیں پڑ گئی تھیں تو میں نے اوپر کا بھیگ جانے والا غلہ نیچے کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس بھیگے ہوئے غلے کو تم نے ڈھیر کے اوپر کیوں نہیں رہنے دیا؟ تاکہ خریدنے والے اس کو دیکھ سکتے۔ سن لو جو آدمی دھوکے بازی کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ ۱۸۱

پیغمبر اعظم ﷺ کے کلام کو جمالیات کا نمونہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں ہر شخص کے لیے احکامات ہیں اور ہر کسی کے لیے رہنمائی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جب کوئی آپ ﷺ کے ارشادات پر عمل کرے اور اپنی زندگی کو آپ ﷺ کے فرامین کے مطابق بسر کرے تو اس کے لیے مقام و مرتبہ کا تعین بھی فرماتے ہیں تاکہ لوگوں میں ذوق و شوق پیدا ہو سکے اور لوگ اللہ کے احکامات کی طرف بڑھ چڑھ کر رجوع کریں۔ گذشتہ صفحات میں کاروبار اور تجارت وغیرہ کے لیے کچھ احکامات بیان کئے ہیں لازم تھا کہ اس طریقہ کار کو اختیار کرنے والوں کے مقام و مرتبہ کو بھی بیان کیا جائے اس سلسلہ کو حافظ بصیر پوری نے بھی بہت ہی عمدگی اور خوبصورتی کے ساتھ آگے بڑھایا ہے جو از خود ذوق و شوق کی عمدہ مثال ہے۔

> حضرت ابو سعدؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا راست گو اور امانتدار تاجر انبیاء، صدیقین اور شہدا کے ساتھ ہو گا۔ ۱۸۲

اسی طرح بے ایمان تاجروں کے بارے میں بھی سخت سزاؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے:

حضرت عبید بن رفاعہ اپنے والد ماجد حضرت رفاعہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے یہ بات روایت کی کہ آپ نے فرمایا تاجر لوگ قیامت کے دن زیادہ تر بدکار اور فاسق و فاجر اٹھائے جائیں گے یعنی عام تاجروں کا حشر بدکاروں کا سا ہوگا سوائے ان خداترس اور خداپرست تاجروں کے جنھوں نے تجارت میں تقویٰ، حسنِ سلوک اور سچائی سے کام لیا۔۱۸۳

انسان کی فطرت میں سرکشی اور بھولنا شامل ہے یہ بھولنے کی سرشت انسان کے ہاں ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام سے آئی ہے۔ انسان اکثر احکام خداوندی میں سرکشی کرتا ہے اور خدا کی ناراضی کا باعث بنتا ہے ہمارے پیغمبر ﷺ کا خاصہ ہے کہ انہوں نے غلطیوں کو سدھارنے اور گناہوں سے رجوع کرنے کے لیے استغفار کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے اور ساتھ ہی اس کی فضیلت بھی بیان فرمائی:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت میں کسی مردِ صالح کا درجہ یکدم بلند کر دیا جاتا ہے تو وہ جنتی بندہ پوچھتا ہے کہ اے میرے پروردگار! میرے درجہ اور مرتبہ میں یہ ترقی کس وجہ سے اور کہاں سے ہوئی؟ جواب ملتا ہے کہ تیرے واسطے تیری فلاں اولاد کے دعائے مغفرت کرنے کی وجہ سے۔۱۸۴

اسی طرح ایک دوسری حدیث ہے:

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بندہ عام ایمان والوں، ایمان والیوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگے گا اس کے لیے ہر مومن مرد و عورت کے حساب سے ایک نیکی لکھی جائے گی۔۱۸۵

اسی طرح تیسری حدیث میں بیان کیا گیا ہے:

حضرت ابودرداء سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بندہ عام مومنین و مومنات کے لیے ہر روز ۲۷ مرتبہ دعا کرے گا۔ اللہ کے ان مقبول بندوں میں سے ہو جائے گا جن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور جن کی برکت سے دنیاوالوں کو رزق ملتا ہے۔۱۸۶

کسی انسان کا اپنے برے اعمال و اقوال پر نادم و شرمندہ ہونا اور پچھتانا بھی جمالیات کے اجزا میں سے ایک جزو ہے کیونکہ اس کا مقصد اپنے گناہوں سے رجوع کرکے اللہ کی راہ پر چلنا یعنی راہ اصلاح اور تنقیح کرنا ہے۔ اس

عمل سے گزرنے والے انسان کو اللہ کے ہاں آسانی اور فروانی ملتی ہے۔ حافظ بصیرپوری نے ایک حدیث مبارکہ پیش کی ہے جس سے توبہ کرنے والے کے مقام کا علم بھی ہوتا ہے اور اللہ کی اپنے بندوں سے محبت کا روشن پیغام بھی ملتا ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ: تم سے پہلے کسی امت میں ایک آدمی تھا جس نے ننانوے بندے قتل کئے تھے (ایک وقت اس کے دل میں ندامت اور اپنے انجام اور آخرت کی فکر پیدا ہوئی) اس نے لوگوں سے دریافت کیا کہ اس علاقہ میں سب سے بڑا عالم کون ہے (تاکہ اس سے جا کر پوچھے کہ میری بخشش کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟) لوگوں نے اس کو ایک راہب (کسی بزرگ درویش) کے بارے میں بتایا۔ چنانچہ وہ ان کے پاس گیا اور ان سے عرض کیا کہ میں (ایسا بدبخت ہوں) جس نے ننانوے خون کئے ہیں، تو کیا ایسے آدمی کی بھی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ (اور وہ بخشا جا سکتا ہے؟) اس راہب بزرگ نے کہا: بالکل نہیں تو ۹۹ آدمیوں کے اس قاتل نے اس بزرگ راہب کو بھی قتل کر ڈالا اور سو کی گنتی پوری کر دی (لیکن پھر اس کے دل میں وہی خلش اور فکر پیدا ہوئی) اور پھر اس نے کچھ لوگوں سے کسی بہت بڑے عالم کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے اس کو کسی بزرگ عالم کا پتہ بتا دیا وہ ان کے پاس بھی پہنچا اور کہا کہ: میں نے سو خون کئے ہیں تو کیا ایسے مجرم کی توبہ بھی قبول ہو سکتی ہے (اور وہ بخشا جا سکتا ہے) انہوں نے کہا ہاں ہاں! (ایسے کی توبہ بھی قبول ہوتی ہے) اور کون ہے جو اس کے اور توبہ کے درمیان حائل ہو سکے یعنی کسی مخلوق میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کی توبہ کو قبول ہونے سے روک دے۔ پھر انہوں نے کہا میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو فلاں بستی میں چلا جا، وہاں اللہ کے کچھ عبادت گزار بندے رہتے ہیں تو بھی وہیں چلا جا اور ان کے ساتھ عبادت میں لگ جا (اس بستی پر خدا کی رحمت برستی ہے) اور پھر وہاں سے کبھی اپنی بستی کی طرف نہ آ کہ وہ بڑی خراب بستی ہے۔ چنانچہ وہ اس دوسری بستی کی طرف چل پڑا۔ یہاں تک کہ جب آدھا راستہ اس نے طے کر لیا تو اچانک اس کو موت آگئی۔ اب اس کے بارے

> میں رحمت کے فرشتوں نے کہا کہ یہ توبہ کی نیت سے آیا ہے اور اس نے صدق دل سے اپنا رخ اللہ کی طرف کرلیا ہے (اس لیے یہ رحمت کا مستحق ہو چکا ہے) اور عذاب کے فرشتوں نے کہا کہ اس نے کبھی بھی کوئی نیک عمل نہیں کیا ہے (اور یہ سو خون کرکے آیا ہے اس لیے یہ سخت عذاب کا مستحق ہے) اس وقت ایک فرشتہ ((اللہ کے حکم سے) آدمی کی شکل میں آیا، فرشتوں کے دونوں گروہوں نے اس کو حاکم مان لیا، اس نے فیصلہ دیا کہ دونوں بستیوں تک کے فاصلہ کی پیائش کرلی جائے۔ پھر جس بستی سے وہ نسبتاً قریب ہو اس کو اسی کا مان لیا جائے، چنانچہ پیائش کرلی گئی تو وہ اس بستی کے زیادہ نزدیک پایا گیا جس کے ارادے سے وہ چلا تھا، تو رحمت کے فرشتوں نے اس کو اپنے حساب میں لے لیا۔۱۸۷

جب انسان پر کوئی مصیبت یا مشکل پڑتی ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ بندہ اس پر آہ و فغاں کرتا ہے اور شور و غوغا کرتا ہے جب کہ دوسری صورت اللہ کے رسول ﷺ کی سنت مبارکہ کے مطابق عمل کرتے ہوئے اس پر صبر کرتا ہے، اگر وہ صبر کرتا ہے تو اس کے لیے اجر و ثواب کا باعث ہوتا ہے، اسی بات کو سمجھانے اور ذوق و شوق دلانے کے لیے صبر کی تلقین کے ساتھ اس کے اجر و ثواب کا ذکر بھی احادیث مبارکہ میں ملتا ہے۔:

> حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: جب اللہ کے کسی بندے کا بچہ انتقال کر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ روح قبض کرنے والے فرشتوں سے فرماتا ہے کہ تم نے میرے بندے کے بچے کی روح قبض کی؟ وہ عرض کرتے ہیں، جی ہاں! پھر فرماتا ہے کہ تم نے اس کے دل کا پھل توڑ لیا، وہ عرض کرتے ہیں جی ہاں! پھر فرماتا ہے کہ اس بندہ نے اس حادثہ پر کیا کہا؟ (اور اپنا کیا تاثر ظاہر کیا؟) فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اس بندے نے آپ کی حمد کی، آپ کا شکر کیا اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا (ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ (اس کے صابرانہ رویہ پر) اس کے لیے جنت مین ایک عالیشان گھر بناؤ اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔۱۸۸

وقت کی جمالیات

اسلامی جمالیات کا ایک عنصر وقت اور قانون کی پابندی ہے، قرآن و حدیث میں اس کی سختی سے تاکید کی گئی ہے، مثال کے طور پر نماز کے بارے میں قرآن نے کہا کہ "اے ایمان والو تم پر نماز مقررہ اوقات میں فرض کی گئی ہے" ہر نماز اور ہر عبادت کے لیے اوقات مقرر کئے گئے ہیں اور اس کا ایک خاص طریقہ کار مختص کیا گیا ہے تاکہ انسان کو وقت کی پابندی کا علم ہو اور وہ ان قواعد و ضوابط پر بھی عمل پیرا ہو جن کا اس سے تقاضا کیا گیا ہے۔ اس کے جملہ مقاصد میں سے ایک مقصد انسان کی عمدہ خطوط پر تربیت کرنا بھی ہے۔ حج کے لیے مخصوص ایام و مقام مقرر ہے، اسی طرح فرض روزے بھی عام طور پر رمضان کے مہینے میں ہی رکھے جا سکتے ہیں، البتہ اگر کوئی مجبور یا بیمار ہو تو اس کے لیے متعدد قسم کی رعایات بھی دی گئی ہیں، نماز کے متعلق جہاں قرآن میں احکامات ملتے ہیں وہیں احادیث مبارکہ میں بھی ان احکامات پر عمل پیرا ہونے کے لیے ترغیب دلائی گئی ہے۔

> حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ تو منافق کی نماز ہے کہ بے پروائی سے بیٹھا سورج کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ جب وہ زرد ہو گیا اور شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان پہنچ گیا یعنی غروب کے قریب پہنچ گیا تو نماز کے لیے کھڑا ہوا، مرغ یا چڑیا کی طرح چار ٹھونگے مارے اور اللہ کا ذکر ان میں بھی نہ کیا مگر بہت تھوڑا۔ ۱۸۹

اسلام صرف عبادت کا ذوق شوق ہی نہیں دلاتا بلکہ اس کے لیے امام کو متانت اور میانہ روی اختیار کرنے کا درس دیتا ہے تاکہ لوگ مشکل میں نہ پڑ جائیں۔ اسی طرح کا ایک معاملہ ملاحظہ فرمائیں:

> حضرت قیس بن ابی حازم سے روایت ہے کہ مجھ سے ابو مسعود انصاری نے بیان کیا کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ بخدا میں فلاں شخص کی وجہ سے صبح کی نماز میں شریک ہونے سے رہ جاتا ہوں کیونکہ وہ بہت طویل نماز پڑھاتے ہیں۔ راوی ابو مسعود انصاری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پھر اس بارے میں خطبہ دیا اور میں نے کبھی آپ ﷺ کو وعظ و خطبہ کی حالت میں اس دن سے زیادہ غضبناک نہیں دیکھا۔ پھر اس خطبے میں آپ نے فرمایا کہ تم میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنے نامناسب طرزِ عمل سے اللہ کے بندوں کو دور بھگانے والے ہیں۔ جو کوئی تم میں سے لوگوں کو نماز پڑھائے یعنی ان کا امام بنے اس کے لیے لازم ہے کہ جائز حد تک اختصار سے کام لے۔ کیونکہ مقتدیوں میں کوئی کمزور، کوئی عمر رسیدہ اور

کوئی حاجت مند ہوتا ہے یعنی کسی ضرورت کے باعث نماز کے اختصار کا
طالب ہوتا ہے۔۱۹۰

سید الانبیاء و امام الانبیاء کی طرف توجہ کی جائے تو ہمیں زندگی میں پیش آنے والے کسی بھی ضروری سوال کا جواب لازمی طور پر مل جائے گا۔ جہاں اسلام خوشی کے موقع پر ایک ترتیب اور ضابطہ کا تعین کرتا ہے اسی طرح دکھ، تکلیف اور المیہ کی صورت میں بھی جس رویہ کو اختیار کرنا چاہیے اس بارے میں ہماری پوری پوری رہنمائی کرتا ہے، اسی طرح احادیث مبارکہ میں ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ کسی المیہ کی صورت میں تعزیت کا کیا طریقہ کار ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں حافظ بصیر پوری کی طرف سے حضور ﷺ کا ایک تعزیت نامہ بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

اللہ کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام۔
سَلامٌ عَلَیکَ!

میں پہلے تم سے اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں (بعد ازاں) دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو اس صدمہ پر اجر عظیم دے اور تمہارے دل کو صبر عطا فرمائے، ہم کو اور تم کو نعمتوں پر شکر کی توفیق دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں اور ہمارے مال اور ہمارے اہل و عیال یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے مبارک عطیے ہیں اور اس کی سپرد کی ہوئی امانتیں ہیں (اس اصول کے مطابق تمہارا لڑکا بھی اللہ تعالیٰ کی امانت تھا) اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا خوشی اور عیش کے ساتھ تم کو اس سے نفع اٹھانے اور جی بہلانے کا موقع دیا اور جب اس کی مشیت ہوئی اپنی اس امانت کو تم سے واپس لے لیا وہ تم کو اس کا بڑا اجر دینے والا ہے۔ اللہ کی خاص نوازش اور اس کی رحمت اور اس کی طرف سے ہدایت (کی تم کو بشارت ہے) اگر تم نے ثواب اور رضائے الٰہی کی نیت سے صبر کیا۔ پس اے معاذ! صبر کرو اور ایسا نہ ہو کہ جزع و فزع تمہارے قیمتی اجر کو غارت کر دے اور پھر تمہیں ندامت ہو (کہ صدمہ بھی پہنچا اور اجر سے بھی محروم رہا) اور یقین رکھو کہ جزع و فزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا اور نہ ہی اس سے رنج و غم دور ہوتا ہے اور اللہ کی طرف سے جو حکم اترتا ہے وہ ہو کر رہنے والا ہے بلکہ یقیناً ہو چکا ہے۔

والسلام"۱۹۱

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ قرآن و حدیث سے زیادہ کوئی مسودہ جمالیات کا حامل نہیں ہو سکتا، مذکورہ کتاب "دل میں اترتے حرف" میں احادیث مبارکہ کے دروس ہیں، اس کتاب کا ہر ہر لفظ جمالیات کی عمدہ مثالیں ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مولانا سیف اللہ رحمانی، متاع سفر (سفر نامہ حج) سہارنپور، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، یوپی ص: ۱۲، ۱۳۔

۲۔ حافظ بصیر پوری، اس دیار میں، مکتبہ گہوارۂ ادب بصیر پور، اوکاڑہ، ۲۰۰۷، ص پیش لفظ

۳۔ ایضاً، ص ۱۳

۴۔ ایضاً، ص ۱۴، ۱۵

۵۔ ایضاً، ص ۱۶

۶۔ ایضاً، ص ۱۷

۷۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۸۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۹۔ ایضاً، ص ۸۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۸۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۱، ۲۲

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۶، ۲۷

۱۵۔ ایضا، ص ۲۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۸

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۴

۱۹۔ ایضا، ص ۸۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۹۶

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۱۶، ۲۱۷

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۳۳

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۱۰
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۰۳
۲۸۔ ایضاً، ص ۶۲
۲۹۔ ایضاً، ص ۷۱
۳۰۔ ایضاً، ص ۷۶
۳۱۔ ایضاً، ص ۹۸
۳۲۔ ایضاً، ص ۹۱
۳۳۔ ایضا، ص ۱۰۳
۳۴۔ ایضا، ص ۱۵۷
۳۵۔ ایضاً، ص ۱۵۸
۳۶۔ ایضاً، ص ۱۷۰
۳۷۔ ایضاً، ص ۱۷۰
۳۸۔ ایضاً، ص ۱۶۶
۳۹۔ ایضاً، ص ۱۶۷
۴۰۔ ایضاً، ص ۱۶۸
۴۱۔ ایضاً، ص ۱۰
۴۲۔ ایضاً، ص ۱۱
۴۳۔ ایضاً، ص ۱۱
۴۴۔ ایضاً، ص ۲۶
۴۵۔ ایضاً، ص ۵۴
۴۶۔ ایضاً، ص ۶۳
۴۷۔ ایضاً، ص ۹۱
۴۸۔ ایضاً، ص ۹۲
۴۹۔ ایضاً، ص ۱۵۰
۵۰۔ ایضاً، ص ۱۶۹
۵۱۔ ایضاً، ص ۱۷۲
۵۲۔ ایضاً، ص ۲۰۵

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۲

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۴

۵۵۔ ایضاً، ص ۲۰

۵۶۔ ایضاً، ص ۲۵

۵۷۔ ایضاً، ص ۴۱

۵۸۔ ایضاً، ص ۹۹

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۶۰۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۶۲۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۶۳۔ ایضاً، ص ۱۴۰

۶۴۔ ایضاً، ص ۱۷۸

۶۵۔ ایضاً، ص ۲۰۷

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۳۳

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵

۶۸۔ ایضاً، ص ۱۳۶تا۱۳۹

۶۹۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۶۲

۷۱۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۷۲۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۷۳۔ ایضاً، ص ۹۲

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۰۷، ۱۰۸

۷۵۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۷۶۔ ایضاً، ص ۴۶

۷۷۔ ایضاً، ص ۴۷

۷۸۔ حافظ منظور حسین بصیر پوری، دامن گلچیں، لاہور، اکبر بک سیلر، زبیدہ سنٹر ۴۰ اردو بازار، ۲۰۱۶ء، ص، ۱۳

۷۹۔ ایضاً، ص، ۱۸

۸۰۔ ایضاً، ص، ۱۹

۸۱۔ ایضاً، ص، ۲۱

۸۲۔ ایضاً، ص، ۲۵

۸۳۔ ایضاً، ص، ۲۵

۸۴۔ ایضاً، ص، ۳۱

۸۵۔ ایضا، ص، ۳۳، ۳۴، ۳۵

۸۶۔ ایضا، ص، ۳۷

۸۷۔ ایضاً، ص، ۳۸

۸۸۔ ایضا، ص، ۳۹

۸۹۔ ایضاً، ص، ۴۲

۹۰۔ ایضاً، ص، ۴۳

۹۱۔ ایضاً، ص، ۴۵

۹۲۔ ایضا، ص، ۵۶

۹۳۔ ایضاً، ص، ۴۶

۹۴۔ ایضاً، ص، ۴۸

۹۵۔ ایضاً، ص، ۵۵

۹۶۔ ایضا، ص۵۹، ۶۰

۹۷۔ ایضاً، ص، ۶۲

۹۸۔ ایضاً، ص، ۶۳

۹۹۔ ایضاً، ص، ۶۴

۱۰۰۔ ایضاً، ص، ۷۲

۱۰۱۔ ایضاً، ص، ۷۲

۱۰۲۔ ایضاً، ص، ۷۳

۱۰۳۔ ایضاً، ص، ۷۴

۱۰۴۔ ایضاً، ص، ۷۵

۱۰۵۔ ایضاً، ص، ۷۸، ۷۹

۱۰۶۔ ایضاً، ص، ۸۲

۱۰۷۔ ایضاً، ص، ۱۰۱

۱۰۸۔ ایضاً، ص، ۱۰۱

۱۰۹۔ ایضاً، ص، ۱۰۱، ۱۰۲

۱۱۰۔ ایضا، ص، ۱۰۵

۱۱۱۔ ایضا، ص، ۱۰۵

۱۱۲۔ ایضاً، ص، ۱۰۸

۱۱۳۔ ایضاً، ص، ۱۰۹

۱۱۴۔ ایضاً، ص، ۱۱۳، ۱۱۴

۱۱۵۔ ایضاً، ص، ۱۲۰

۱۱۶۔ ایضاً، ص، ۱۲۰، ۱۲۱

۱۱۷۔ ایضاً، ص، ۱۲۴

۱۱۸۔ ایضاً، ص، ۱۲۵

۱۱۹۔ ایضاً، ص، ۱۲۶

۱۲۰۔ ایضاً، ص، ۱۳۰

۱۲۱۔ ایضاً، ص، ۱۳۲

۱۲۲۔ ایضاً، ص، ۱۳۹، ۱۴۰

۱۲۳۔ ایضاً، ص، ۱۴۴

۱۲۴۔ ایضاً، ص، ۱۴۴

۱۲۵۔ ایضاً، ص ۱۴۷

۱۲۶۔ ایضاً، ص ۱۴۹

۱۲۷۔ ایضاً، ص، ۱۵۹

۱۲۸۔ ایضاً، ص ۱۶۵، ۱۶۶

۱۲۹۔ ایضاً، ص ۱۶۹

۱۳۰۔ ایضاً، ص، ۱۹۷

۱۳۱۔ ایضاً، ص، ۱۹۸، ۱۹۹

۱۳۲۔ ایضاً، ص، ۲۰۱، ۲۰۲

۱۳۳۔ ایضاً، ص، ۲۰۳
۱۳۴۔ ایضاً، ص، ۲۰۳، ۲۰۴
۱۳۵۔ ایضاً، ص، ۲۰۸
۱۳۶۔ ایضاً، ص، ۲۰۹
۱۳۷۔ ایضاً، ص، ۲۱۳
۱۳۸۔ ایضاً، ص، ۲۱۷
۱۳۹۔ ایضاً، ص، ۲۱۸
۱۴۰۔ ایضاً، ص، ۲۲۴
۱۴۱۔ ایضاً، ص، ۲۲۷
۱۴۲۔ ایضاً، ص، ۲۲۷
۱۴۳۔ ایضاً، ص، ۲۳۱
۱۴۴۔ ایضاً، ص، ۲۳۴
۱۴۵۔ ایضاً، ص، ۲۳۵
۱۴۶۔ ایضاً، ص، ۲۳۵
۱۴۷۔ ایضاً، ص، ۲۳۶
۱۴۸۔ ایضاً، ص، ۲۳۸
۱۴۹۔ ایضاً، ص، ۲۳۹
۱۵۰۔ ایضاً، ص، ۲۳۹
۱۵۱۔ ایضاً، ص، ۲۴۳
۱۵۲۔ ایضاً، ص، ۲۴۶
۱۵۳۔ ایضاً، ص، ۲۴۷
۱۵۴۔ ایضاً، ص، ۲۵۴
۱۵۵۔ ایضاً، ص، ۲۵۶
۱۵۶۔ ایضاً، ص، ۲۵۶
۱۵۷۔ ایضاً، ص، ۲۵۹
۱۵۸۔ ایضاً، ص، ۲۵۹

۱۵۹۔ حافظ منظور حسین بصیر پوری، دل میں اترتے حرف، لاہور، اکبر بک سیلر، زبیدہ سنٹر ۴۰ اردو بازار، ۲۰۱۶ء، ص، ۱۱

۱۶۰۔ ایضاً، ص، ۱۵

۱۶۱۔ ایضاً، ص، ۲۲

۱۶۲۔ ایضاً، ص، ۲۳

۱۶۳۔ ایضاً، ص، ۲۸

۱۶۴۔ ایضا، ص، ۳۱

۱۶۵۔ ایضا، ص، ۳۵

۱۶۶۔ ایضا، ص، ۳۸، ۳۹

۱۶۷۔ ایضا، ص، ۴۱، ۴۲

۱۶۸۔ ایضاً، ص، ۱۵۸

۱۶۹۔ ایضا، ص، ۱۵۹

۱۷۰۔ ایضاً، ص، ۵۷

۱۷۱۔ ایضاً، ص، ۷۵

۱۷۲۔ ایضاً، ص، ۸۰

۱۷۳۔ ایضا، ص، ۸۰

۱۷۴۔ ایضاًص، ۸۹

۱۷۵۔ ایضاً، ص، ۹۶

۱۷۶۔ ایضاً، ص، ۹۲

۱۷۷۔ ایضا، ۱۰۲

۱۷۸۔ ایضاً، ۱۰۵

۱۷۹۔ ایضاً، ص، ۱۰۹

۱۸۰۔ ایضاً، ص، ۱۱۱

۱۸۱۔ ایضاً، ص، ۱۱۳

۱۸۲۔ ایضاً، ص، ۱۳۶

۱۸۳۔ ایضاً، ص، ۱۵۱

۱۸۴۔ ایضاً، ص، ۲۰۵

۱۸۵۔ ایضاً، ص، ۲۰۷

۱۸۶۔ ایضاً، ص، ۲۰۹

۱۸۷۔ ایضاً، ص، ۲۲۲، ۲۲۳

۱۸۸۔ ایضاً، ص، ۲۱۵، ۲۱۶

۱۹۰۔ ایضاً، ص، ۱۸۷

۱۹۱۔ ایضاً، ص، ۱۹۱، ۱۹۲

باب پنجم

(الف)

پروفیسر حافظ بصیرپوری کی مکتوب نگاری میں جمالیاتی عناصر

"سوز و ساز" حافظ بصیرپوری کا خطوط کا مجموعہ ہے جو ۱۹۹۲ء میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ خطوط کا یہ مجموعہ کل ڈیڑھ سو صفحات پر مبنی ہے جس میں کم و بیش دس شخصیات کے حوالے سے مختلف اوقات میں لکھے گئے خطوط کو جمع کر کے ایک مجموعہ کی شکل دے دی ہے۔ حافظ بصیرپوری کے اس مجموعے پر بات کرنے سے پہلے خطوط نگاری کی روایت کے حوالے سے کچھ باتیں جان لینا بہت اہم ہے۔ اس لیے کہ اس سے خطوط نگاری کی افادیت اور اہمیت بھی واضح ہوتی ہے اور فن خطوط نگاری جو انسان صدیوں سے کرتا چلا آرہا ہے۔ مذہب کی معلوم تاریخ میں بہت سے انبیاء نے تبلیغ کے لیے خطوط کو استعمال کیا ہے۔

خطوط نگاری کا پس منظر

خطوط نگاری کے آغاز وارتقا کے حوالے سے بات کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کے مذہبی صحائف اور کتابوں میں خطوط نگاری کا تذکرہ ضرور سامنے آیا ہے۔ ادبیات عالم میں جہاں گرد کی واپسی، "اوڈیسی" جو ہیومر کی داستان ہے اس میں بھی خطوط کا تذکرہ بہت اہم ہے۔ اس لیے اردو خطوط نگاری کے حوالے سے جب ہم بات کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسد اللہ خان غالبؔ سے پہلے غلام غوث بے خبر اور رجب علی بیگ سرور کے مکتوبات تاریخ کا حصہ بن چکے تھے۔ انہی کے ساتھ مرزا غلام غوث کا مجموعہ "انشائے بے خبر" اور "فیضان بے خبر" بھی منظر عام پر آچکے تھے۔

اس کے باوجود اسد اللہ خان غالبؔ کو خطوط نگاری میں صف اول کے لکھنے والوں میں جگہ دی جاتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے خطوط کو اردو خطوط نگاری میں معیاری مانا گیا ہے۔ مکتوب نگاری کی معلوم تاریخ کے مطابق پہلا خط چین میں چار ہزار سال پہلے لکھا گیا تھا۔ یہ صرف مفروضہ ہے اور اس کے حوالے سے ماہرین آثار قدیمہ کے پاس کوئی واضح ثبوت موجود نہیں۔ کچھ سال پہلے عراق میں کھدائی کے دوران تین سو مٹی کی تختیاں دریافت ہوئی تھیں اور جب ان کے حوالے سے تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا یہ خطوط ہیں جو شہنشاہ مصر کے نام لکھے گئے ہیں۔ ماہرین کا کہنا یہ ہے کہ یہ تحریر تین ہزار سال قبل کی ہے۔ ایرانیوں کی ہندوستان پر فتح کے بعد یہاں فارسی زبان بولی جاتی تھی اور ایران سے کچھ لوگ ایسی بھی آئی تھی جو اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام دینا چاہتے تھے انہوں نے اپنی خانقاہوں میں بیٹھ کر فارسی زبان میں خطوط لکھے اور مختلف ریاستوں کے حاکموں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ فارسی زبان میں ابوالفضل کے خطوط نہایت اہمیت کے حامل تھے جہاں سے اردو خطوط اخذ

کیے گئے۔اس دور میں منیر لاہوری کی کتاب "انشائے منیری جی" خطوط نگاری کے حوالے سے اہمیت رکھتی ہے۔اردو میں مکتوب نگاری کا رواج فورٹ ولیم کالج کے قیام سے بہت پہلے کا ہے جب رجب علی بیگ سرور اور غلام غوث نے اردو میں بہت سے خطوط لکھے تھے۔

غالب کے اسلوب نے خطوط نگاری میں بہت سی ایسی تبدیلیاں کی ہیں جنہوں نے آنے والے خطوط نگاروں کو ایک راستہ بنا کر دیا ہے جس پر وہ چل رہے ہیں۔بر صغیر میں خطوط نگاری کے حوالے سے قمر منصور لکھتے ہیں۔

> اردو میں مکتوب نگاری کا رواج فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے ہو گیا تھا۔عام طور پر رجب علی بیگ سرور اور غلام غوث بے خبر کو اردو کا پہلا مکتوب نگار کہا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر لطیف اعظمی نے اپنے مقالے اردو مکتوب نگاری میں بات اگر تحقیق یہ بات ثابت کی ہے کہ کرناٹک میں حرکات کے نواب وراجہ کے چھوٹے بیٹے حسام الملک بہادر نے اپنی بڑی بھابھی نواب بیگم کے نام دسمبر ۱۸۲۲ کو خط لکھا تھا۔ڈاکٹر لطیف اعظمی کی تحقیق کے مطابق یہ اردو کا پہلا خط ہے۔گیان چند جین اور عنوان چشتی نے بھی اس تحقیق کی تائید کی ہے"۔۱

اُردو ادب میں غالب کے مکتوبات کی تدوین بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے کی ہے۔خطوط نگاری کے حوالے سے غالب کے تین مجموعے عود ہندی، اردوئے معلٰی اور مکاتیبِ غالبؔ اہم ہیں۔اسد اللہ خان غالب کے خطوط کو تاریخ کے اعتبار سے اہمیت دی جاتی ہے۔تاریخ کے اعتبار سے انیس سو انچاس میں آفاق حسین آفاقی نے نوادرات غالب کے نام سے غالب کے خطوط کو شائع کیا۔ان خطوط نے جہاں خطوط نویسی کو جلا بخشی ہے وہیں اپنے دامن میں اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کے حالات و واقعات اور ایک حساس دل شاعر کی کیفیات ان خطوط کی قدر و قیمت کو اور بڑھا دیتے ہیں۔اس کے بعد دور سر سید میں، سر سید احمد خان کے خطوط، مولانا شبلی نعمانی اور حالی کے خطوط، مولوی عبد الحق، جگر مراد آبادی، محمد حسین آزاد، رشید حسن خان کے خطوط نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔نذیر احمد دہلوی، اختر حسین رائے پوری، رفیع الدین ہاشمی، سید سلمان ندوی، غلام رسول مہر، نظیر صدیقی اسی طرح سے دیکھا جائے تو پروین شاکر کے خطوط بھی نذیر احمد صدیقی کے نام ہمیں ملتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ مشفق خواجہ، اکبر حیدری، وزیر آغا سب ہی نے خطوط نگاری کو اپنایا ہے اور اس کے حوالے سے بہت سے خطوط لکھے ہیں جن کا پیرایہ عموماً غالبؔ کے خاتون سے ملتا جلتا ہے۔غالب نے خطوط کے متن میں جو بنیادی تبدیلیاں کی تھیں آگے چل کر لکھنے والوں نے خطوط نگاری میں ان تبدیلیوں کو ملحوظ خاطر رکھا اور غالب کی روش پر چل کے اس صنف کو قابل قبول بنایا۔

غالب کے خطوط کو شہرت ملنے کے بعد آنے والے تمام ادیبوں نے خطوط کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ مجموعی طور پر غالب کے بعد دیکھا جائے تو رسمی طور طریقہ جو خط کے لیے فارسی زبان سے اخذ کیا گیا تھا اس میں بنیادی تبدیلیاں کی گئیں اور خط کو آدھی ملاقات کہا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ خط میں بے تکلفی کا انداز جو پہلے خطوط نگاری کی روایت میں موجود نہیں تھا بلکہ لمبے لمبے القاب و آداب لکھنے کا رواج تھا جو خطوط غالب کے ذریعے ہیں ختم ہوا اور لوگوں نے خط کے اندر بے تکلفی کو برتنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ خط میں مقصدیت کا بیان جس مقصد کے لئے خط لکھا جارہا ہے وہ واضح طور پر پتہ چلنا چاہیے۔

عہد سرسید کے بہت سے لکھنے والوں نے خطوط میں ادبی علمی اور سماجی ہیں قدروں کو بھی جگہ دی ہے۔ مولانا حالی کا مجموعہ مکاتیب حالی انیس سو پچاس میں شائع ہوا ہے۔ انشائے داغ، بیگمات اودھ، رشید حسن خان اور رفیع الدین ہاشمی کا" کلمات آبدار "خطوط نگاری میں قابل ذکر ہیں جن سے خطوط نگاری کی روایت مستقل آگے بڑھ رہی ہے۔ ابوالکلام آزاد کا "غبار خاطر" خطوط کے اہم مجموعے میں شمار کیا جاتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کا مجموعہ "غبار خاطر" ان کے قید کے دنوں میں لکھے گئے خطوط کی یادگار ہے۔ جب مولانا ابوالکلام آزاد کی احمد نگر میں ۱۹۴۲ تا ۱۹۴۵ کے درمیان زمانے اسیری میں وہاں تھے تو انہوں نے یہ خطوط لکھے۔ ان دنوں جیل میں ان کو کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی کسی کو خط لکھنے کی اجازت تھی اس لیے انہوں نے دل کا غبار نکالنے کے لیے یہ خطوط لکھ لیے اور آج یہ خطوط ادب کا حصہ ہیں۔ اِن خط میں اپنے ایک دوست کو کہتے ہیں کہ میں جیل میں ہوں اور مجھے پتا ہے کہ میری بات تم تک نہیں پہنچ سکے گی لیکن پھر بھی دل میں اتنا غبار ہے کہ میں اسے خاطر میں لائے بغیر خط میں تحریر کر رہا ہوں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جب یہ خطوط لکھے تھے تو انہوں نے کبھی بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ان خطوط کو میں شائع کرواؤں گا بلکہ یہ خطوط صرف انہوں نے اپنے لیے لکھے تھے جو بعد میں محمد اجمل خان نے انیس سو چھیالیس میں مرتب کرکے ادب کے قارئین کی نذر کر دیئے۔

اردو خطوط نگاری کو غالب کے خطوط کے چھپنے کے بعد بہت زیادہ مقبولیت ملی۔ غالب نے اپنے خطوط میں جن چیزوں کو ملحوظ خاطر رکھا آگے چل کر وہ خطوط نگاری میں بڑی اہمیت اختیار کر گئی۔

مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام خطوط میں غالب لکھتے ہیں۔

> "میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے، ہزاروں کوس سے بازبان قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات نہ کرنے کی قسم کھائی ہے ؟اتنا تو کہوں کہ کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے ؟برسوں ہوگئے کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیریت و عافیت لکھی، نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا۔ ہاں مرزا تفتہ نے ہاترس سے یہ خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچوں کتابوں کے

آغاز کے ان کو دے آیا ہوں اور انہوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے"۔۲

خطوط نویسی کے حوالے سے دیکھا جائے تو اردو کے بیشتر مصنفین اور ادیبوں کے خطوط علمی اور ادبی سرمایہ ہیں۔ ان خطوط کے ذریعے ان کی ذاتی زندگی اور ان کی ادبی حوالے سے پوشیدہ گوشے بھی خطوط نگاری کے ذریعے ہی روشن ہوتے ہیں۔ مرزا غالب نے اردو خطوط نگاری کا آغاز ۱۸۴۶ء میں کیا تھا۔ اس سے قبل اردو میں زیادہ تر خطوط نہیں لکھے گئے تھے بلکہ فارسی زبان و ادب میں خطوط لکھنے کا رواج موجود تھا۔ مرزا غالب نے ہزاروں خطوط کے ذریعے اس صنف کو مضبوط بنیادوں پر لکھا اور آنے والوں نے غالب ہی کی پیروی کی۔ اس کے بعد آنے والوں میں مولانا حالی سرسید احمد خان محمد حسین آزاد ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے نامور ادیبوں کے خطوط منظر عام پر آچکے ہیں جو اردو مکتوب نگاری کی صنف کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔

علامہ محمد اقبال نے بھی خطوط لکھے ہیں۔ انہوں نے اپنے والد کے نام ایک خط لکھا ہے

لاہور ۳ جون ۱۹۴۲

کعبہ و قبلہ السلام علیکم

آپ کا والا نامہ ملا۔ الحمد للہ کہ آپ کی صحت اچھی ہے اور مجھے یقین ہے اللہ تعالی دیر تک آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے گا۔ بھائی صاحب نے اس سے پہلے کسی خط میں آپ کے انتظام خوراک وغیرہ کے بارے میں لکھا تھا۔ یہ طریقہ اچھا ہے اور اسی کو دستور عمل بنانا چاہیے۔ میں نے یورپ کے مشہور حکیم کی کتاب میں دیکھا ہے کہ جو شخص ہر روز دہی کی لسی پیا کرے اس کی عمر بڑھتی ہے۔۳

علامہ اقبال کے خطوط میں بھی یہ خاص بات ہے کہ وہ اپنے مقصد کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ انہوں نے خطوط میں جو بھی بات کہنی ہوتی ہے اس کا بیان واسطے، علمی اور کسی حد تک فلسفانہ ہوتا ہے۔ انہوں نے بابائے مولوی عبدالحق کے نام بھی بہت سے خطوط لکھے ہیں اور ان خطوط میں علمی حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ ادبی خطوط نگاری کی یہ خاص بات ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی علمی نکتے پر لکھے ہوتے ہیں۔ اسی طرح آگے چلتے چلتے خطوط رشید احمد صدیقی کی بات کی جائے تو انہوں نے بھی خطوط نگاری میں عمدہ اسلوب بیان اپنایا ہے اور اپنی باتوں کو واضح اور مدلل انداز میں خطوط کی نذر کیا ہے۔ دیکھا جائے تو رشید احمد صدیقی ایک صاحب طرز انشاپرداز تھے۔ اس لئے ان کے خطوط اسلوب نگاری کے حوالے سے عمدہ ہیں۔ رشید احمد صدیقی اپنے خط میں بشیر الدین کو لکھتے ہیں۔

اکتوبر کا نوازش نامہ مل گیا تھا۔ جواب میں دیر ہو گئی ورنہ خطوط کا جواب عموماً ہم روزانہ دیتا ہوں۔ اپنے اوپر کسی قسم کا بار نہیں رکھنا

چاہتا۔ معلوم نہیں کب کیا ہو جائے تو کوئی یہ نہ کہے کہ مجھ پر اس کا کوئی واجب الادا تھا۔ کچھ دنوں سے ہجوم میں تنہائی کا احساس ہونے لگا ہے جو روز بروز گہرا ہوتا جاتا ہے۔آپ نے خود اپنے مطالعے، علی گڑھ کی زندگی اور الہ آباد کے موجودہ شب و روز کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ ۴

سر سید احمد خان کے عہد کے بعد خطوط نگاری نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ اس کے بعد آنے والے شعراء اور ادیبوں نے مختلف وقتوں میں ذاتی اور ادبی خطوط کے ذریعے اپنی فکر کو قارئین تک پہنچایا ہے۔ اردو ادب میں خطوط نگاری ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ سعادت حسن منٹو نے بھی کچھ خیال ہے خطوط "چچا سام" کے نام لکھے ہیں۔ اس طرح "لیلیٰ کے خطوط" بھی منظر عام پر اب آچکے ہیں۔ اس سے خطوط کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ غالب نے خطوط نگاری میں جن چیزوں کو لازمی قرار دیا تھا آنے والوں نے بھی اسی کی پیروی کی۔

خطوط نگاری کیونکہ فارسی زبان سے اردو میں رائج ہوئی ہے اس لیے پہلے ادوار میں جو خطوط لکھے گئے وہ فارسی خطوط کے زیر اثر تھے۔ جن میں لمبے لمبے القاب و آداب، حیثیت، مقام و مرتبہ، خیریت اہل و عیال، سب ایک ترتیب سے ادا کیا جاتا تھا۔ اردو خطوط نگاری کے ابتدائی نمونے انہیں کہ جیسے ہیں۔ غالب نے جب خطوط نگاری کا آغاز کیا تو سب سے پہلی چیز اس میں یہ مختص کی کہ لمبے لمبے القاب و آداب نہیں لکھے جائیں گے۔ بات کرنے کا انداز ایسا ہونا چاہیے جیسے آپ کسی کے سامنے بیٹھ کر بات کر رہے ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ مدعا نگاری پر غالب نے خاص توجہ دی ہے اور اس بات کو بیان کیا ہے کہ خط جس مقصد کو بیان کرنے کے لیے لکھا جا رہا ہے اسے سب سے پہلے بیان کرنا چاہیے اور باتوں باتوں میں اس کا بیان بھی ایسا ہو کہ دوسرے شخص کو ناگوار نہ گزرے بلکہ یہ خط ایک خوشگوار ملاقات کے جیسا ہو۔ جیسا کہا جاتا ہے کہ خط آدھی ملاقات ہوتا ہے۔ غالب نے خطوط میں جو انداز اپنایا ہے اس سے دیکھ کر واقعی اندازہ ہوتا ہے کہ خط آدھی ملاقات ہی ہے۔ یہ مراسلہ نہیں بلکہ مکالمہ ہے۔

خطوط کو اگر اقسام میں تقسیم کیا جائے تو اس کی چار بڑی اقسام ہیں۔

۱۔ حکومتی یا دفتری خطوط

۲۔ اخباری خطوط

۳۔ ادبی خطوط

۴۔ نجی اور ذاتی خطوط

اگر خطوط نگاری کی روایت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادب میں ان چاروں اقسام کے خطوط لکھی گئے ہیں۔

نجی یا ذاتی خطوط بھی اردو ادب کا حصہ رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو بہت سے شاعر اور ادیبوں کے حالات

زندگی اور ان کے کوائف ان کے خطوط سے حاصل کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ خطوط نگاری میں علمی اور ادبی مباحث بھی موجود ہیں جو ادبی خطوط نگاری کی ذیل میں آتے ہیں۔ فیض احمد فیض کی بھی بہت سے خطوط منظر عام پر آچکے ہیں۔ یہ خطوط نجی سطح کے یا ذاتی خطوط ہیں وہی وہ فیض کی شخصیت کو بھی سامنے لانے میں اہم رہے ہیں۔

دفتری خطوط عموماً دفتری معاملات پر لکھے جاتے ہیں لیکن بہت سے ادارے ایسے ہیں جن کا براہ راست تعلق ادب سے ہے اور ان کی ادیبوں سے خطوط کے ذریعے رابطے بھی ادبی خطوط کے موضوعات میں رہے ہیں۔ ان سے بہت سے شخصی اور علمی کوائف ملتے ہیں جو کسی بھی شخصیت کو سمجھنے کے لئے اہم ہو سکتے ہیں۔

بیسویں صدی کی آخر دو دہائیوں میں بھی خطوط نگاری کے حوالے سے کام کیا جارہا تھا۔ اس دور میں بھی خطوط کی مقبولیت کم نہیں ہوئی۔ اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے نصاب کی کتابوں میں بھی خطوط کو ایک خاص اہمیت دی جاتی ہے اور درسی کتابوں میں اسے شامل کیا جاتا ہے۔ اسی اہمیت کو پیش نظر مختلف شاعر اور ادیب بھی خطوط کے ذریعے اپنی علمی اور ادبی فکر کو آگے منتقل کرتے ہیں۔ اس دور میں بھی جو خطوط لکھے جارہے ہیں۔ ان کا اسلوب غالب کے اسلوب کے قریب قریب ہے۔ غالب خط میں مدعا نگاری پر بہت زور دیتے ہیں اور اپنی بات کو اس قدر احسن طریقے سے بیان کرتے ہیں کے قائل ہوئے بنا نہیں رہا جاسکتا۔

جب سے اردو میں خطوط نگاری کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے تب سے اس صنف کو برتنے کے لیے بہت سی اصولوں مقاصد متعین کیے گئے ہیں جن میں رہ کر ادبی خطوط نگاری کی جاسکتی ہے۔ خطوط نگاری کے حوالے سے بہت سی ایسی باتیں ہیں جو ہمیں روایت سے حاصل ہوتی ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ روایت میں بھی ان باتوں کو مِن وعَن تسلیم کیا جاتا ہے اور اسی حوالے سے لکھا جاتا ہے۔

خطوط نگاری کے حوالے سے سب سے پہلے لمبے لمبے القاب وآداب کو ختم کرکے مختصر نام یا مخاطب سے رشتہ خط میں لکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پہلے خط لکھنے والے کے عہدے اور اس کے منصب کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا تھا لیکن جدید خطوط نگاری نے خطوط میں سے ان چیزوں کو ختم کرکے مدعا نگاری پر زور دیا ہے کے خط لکھنے والے سے اپنامدعا بیان کیا جائے اور واقعات کا بیان ایسا ہو کہ سننے والا آپ کی بات کو قبول کیے بنا رہ بھی نہ سکے اور آپ کی بات تسلیم کرلے۔

خطوط نگاری میں پہلے صرف نجی اور ذاتی حالات ہیں درد کیے جاتے تھے لیکن اردو ادب میں خطوط کی قدر وقیمت نے بہت سے شعرا ادیبوں کو خط لکھنے کی طرف راغب کیا ہے جو ادب کے حوالے سے اہم دستاویز اور علمی اور ادبی حیثیت کے حامل ہیں۔ ادبی حوالے سے اور ادبی شخصیات کے حوالے سے علمی اور ادبی مباحث اور فلسفیانہ نوعیت کے مسائل اور مباحث کو خطوط میں بیان کرنا اس دور کی شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی ضرورت بھی تھی اس لیے کہ دور رہ کر ابلاغ کا سب سے بہتر ذریعہ تھا جو آپ کی بات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچادیتا

تھا لیکن عہد حاضر میں خط کی جگہ ای میل (e-mail) نے لے لی ہے جو آپ کی بات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بہت آسانی سے اور بہت کم وقت میں پہنچا سکتی ہے۔ اس لیے خط میں ایسی باتوں کا بیان نہ کیا جائے جس کا خط کے اصل مدعا سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ اپنے شہر کے حالات اور عصری صورتحال کے حوالے سے اپنے مخاطب سے بات کر سکتے ہیں۔ یہ انداز بھی غالب کا ہے جس کو بعد میں آنے والے خطوط نگاروں نے اپنے خطوط میں جگہ دی ہے۔

خطوط نگاری کی زبان کے حوالے سے جب بات کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خط بنیادی طور پر مکالمہ ہوتا ہے اور مکالمہ دو لوگوں کی یادوں سے زیادہ لوگوں کی گفتگو کو کہا جاتا ہے۔ خط میں اچھا مکالمہ آپ کے شخصی اوصاف اور آپ کے علم کا پتا بھی دیتا ہے کہ آپ اپنی بات کو کس حد تک صاف طریقے سے بیان کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر غالب نے خط کو مکالمہ لکھا ہے اور اس بات کو بیان کیا ہے کہ خط کی زبان ایسی ہونی چاہیے جیسے دو لوگوں کے درمیان مکالمہ کی ہوتی ہے یہی چیز آپ کے خط کے متن کو جاندار بناتی ہے اور آپ کا مطالعہ اور مقصد واضح ہوتا ہے۔

خط کو عموماً بہت زیادہ طویل نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ گفتگو کے دوران بہت زیادہ بولنا اور پھر کافی وقت تک اسی طرح بولتے رہنا ممکن نہیں ہوتا کیونکہ جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی ہے تو ملاقات میں ماحول بھی بڑا اثر انداز ہوتا ہے جتنا اچھا اور سازگار ماحول ہوگا اتنی ہی ملاقات اچھی رہے گی۔ اسد اللہ خان غالب اپنی بات چیت سے اپنے ارد گرد اور شہر کی صورتحال کو بیان کرتے تھے جو گفتگو میں اس قدر جڑی ہوئی ہوتی تھی کے اسد اللہ خان غالب کی زبان دانی پر رشک آنے لگتا ہے۔ یہ سب بھی ان کے اچھے مکالمے کی خصوصیات کی وجہ سے ہے۔ خط میں مکالمہ جتنا دلچسپ اور معنی خیز ہوگا اتنا ہی خط دلکش اور بھرپور ہوگا۔

علمی اور ادبی خطوط میں بہت سی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جو ذوق والوں سے شخصیات کو جاننے اور سمجھنے کا موقع دیتی ہیں۔ علامہ محمد اقبال نے مولوی عبدالحق کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں بہت سی علمی دستاویز ہمارے سامنے آتی ہیں اور دو اردو کی بڑی شخصیات ہونے کے ناطے ان کی باتوں کو اہمیت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنے والے خطوط نگاروں نے خطوط کو بھی علمی اور ادبی حوالوں سے مربوط کیا ہے۔ مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو میں جو پبلشنگ ہاؤس بنانا چاہ رہے تھے اس کے حوالے سے علامہ محمد اقبال اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

> آپ انجمن اردو سے متعلق بل ہینگ ہاؤس قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی کامیابی بھی لاہور ہی ہو سکتی ہے کیونکہ یہ ایک بڑا پبلشنگ سنٹر ہے اور بہت سا طباعت کا کام مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ انگریزی پبلشنگ کی طرف بھی یہاں کے مسلمان توجہ دے رہے ہیں۔[۵]

خطوط کی زبان پر بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے اور مکالماتی انداز کو اپنایا گیا ہے۔ عہد سر سید اور علامہ محمد اقبال کے خطوط کے بعد جو بھی خطوط لکھے گئے ان کو علمی اور ادبی حوالوں سے ادبی دستاویز کی جگہ دی گئی اور بہت سے ادیبوں نے اپنی آپ بیتیوں میں بھی خطوط کا ذکر کیا ہے۔ عطیہ فیضی کے خطوط بھی بہت سے ادیبوں کے نام ملے ہیں جن میں ادیبوں کی زندگی کے حالات ملتے ہیں۔

حافظ بصیر پوری کے خطوط میں جمالیات

خطوط نگاری کی روایت سے واقفیت حاصل کرتے ہوئے جب ہم حافظ بصیر پوری کے خطوط کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ان کے خطوط میں اسلامی فلسفہ جمالیات کی بنیادی عناصر بدرجہ اتم نظر آتے ہیں۔ ان کے خطوط کا مجموعہ "سوز و ساز" انیس سو بانوے میں مکتبہ گہوارہ ادب بصیر پور اوکاڑہ سے چھپ کر منظر عام پر آیا۔ اس مجموعہ میں دس لوگوں کے نام خطوط شامل ہیں۔ یہ خطوط مختلف وقتوں میں پروفیسر حافظ بصیر پوری نے اپنے دوستوں اور کولیگ ساتھیوں کو جو ادب سے محبت رکھنے والے ہیں ان کو لکھے گئے تھے۔

حافظ بصیر پوری گو کہ حق اور سچ بات کہنے والے ہیں اور اسلامی فلسفہ جمالیات کے قائل ہیں اس لیے انہوں نے ان خطوط میں کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ خطوط نگاری کے حوالے سے یہ حرف آغاز میں لکھتے ہیں:

> اچانک ایک محترم دوست نے راقم السطور کے خطوط کی بات چھیڑ دی۔ طرح مصرع کی طرح دوستوں نے اس پر گرہ لگانا شروع کر دیں۔ میں نے اسے حوصلہ افزائی کہہ کر شکریہ ادا کیا اور بات ٹالنے کی کوشش کی مگر بعض دوستوں نے بات کو مزید سنجیدہ کر کے ان خطوط کی طباعت کا تقاضا بھی کر دیا جو بڑھ کر ایسا اصرار بن گیا۔ میرے پاس اس کا سیدھا سا جواب تھا کہ میں نے اپنے خطوط کو کبھی کوئی نقل اپنے پاس نہیں رکھی لہٰذا طباعت کس چیز کی کروائی جائے۔ اس کا حل کچھ احباب نے نکال لیا کہ ان کے پاس میرے چند مکتوب موجود تھے اور کچھ ڈھونڈ نکالنے کا وعدہ بھی کیا۔ بہر حال میں ان دوستوں کی کاوش کے لیے شکر گزار ہوں جنہوں نے یہ خطوط کسی نہ کسی طرح سے جمع کر لیے اور اب آپ کے سامنے ہیں۔[۶]

ان خطوط کی اہمیت حافظ بصیر پوری کی فلسفہ جمالیات کے حوالے سے ہے۔ اس لیے کہ ان خطوط میں حافظ بصیر پوری کی شخصیت علمی اور ادبی حوالوں سے بڑی نمایاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں اسلامی فلسفہ جمالیات سے بھی کام لیا ہے۔ انکا دوستوں سے بے تکلفی کا رویہ بھی ایک خاص حد تک نظر آتا ہے جہاں بے تکلفی کو الگ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں اسلامی حوالے سے مختلف موضوعات پر مختصر باتیں کی

ہیں یہ باتیں عموماً مکالماتی ہیں جس سے حافظ بصیر پوری کی ذہنی بصیرت کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط جہاں ادبی چاشنی لیے ہوئے ہیں۔ ہماری تہذیب و ثقافت اور مذہبی عقائد کا بیان بھی سلیقے سے کیا گیا ہے۔ پروفیسر حافظ بصیر پوری کیونکہ خود علم وادب کے ساتھ کے وابستگی رکھتے تھے اس لئے ان کے خطوط میں بھی ان کی شخصیت ایک علمی اور دانا آدمی کی ہی نظر آتی ہے۔ خطوط نگاری کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ یہ کسی بھی شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں جس میں شخصیت کے خدوخال موجود ہوتے ہیں اور آپ کسی بھی شخصیت کے بارے میں محتاط اندازہ لگا سکتے ہیں۔ حافظ بصیر پوری کے خطوط کی اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے زبان دانی اور الفاظ کے مناسب استعمال کو ترجیح دیتے ہوئے اتنے احسن انداز میں برتا ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن و قلب کو ایک لطیف اور مسحور کن احساس سے مزین کرتے چلے جاتے ہیں۔ یقیناً اسی بنیاد پر ان کے یہ خطوط چھپ کر منظر عام پر آچکے ہیں اور عام قارئین کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہیں۔

حافظ بصیر پوری کی خطوط نگاری کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کے خطوط کا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب کے دیباچے میں اس بات کو یوں بیان کیا ہے کہ خطوط غالب اور سرسید احمد خان نے خطوط نگاری کے حوالے سے بہت اچھا کام کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے رشید احمد صدیقی اور جوش ملیح آبادی کے خطوط کو بھی عمدہ قرار دیا ہے۔ حافظ بصیر پوری کی شخصیت اور ان کے مزاج میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو علامہ محمد اقبال کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں۔ انہوں نے خطوط اقبال کے حوالے سے بھی بات کی ہے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

حافظ بصیر پوری کے خطوط نگاری میں اسلامی فلسفہ جمالیات بھی واضح دکھائی دیتا ہے۔ ان کے خطوط کے اسالیب، زبان، منظر نگاری، جزئیات نگاری کا ایک بڑا حصہ اسلامی جمالیات کے تابع نظر آتا ہیں۔ اسلامی جمالیات کے حوالے سے مجیب الرحمٰن لکھتے ہیں:

> اسلامی فلسفہ جمالیات میں اسلامی فکر کے عناصر موجود ہیں جن کی بنیاد پر فلسفہ جمالیات رونما ہوا اور جس میں مختلف اسلامی فلسفیوں کے علاوہ ابن رشد نے بھی اپنے خیالات اور فلسفہ جمالیات کو پیش کیا چونکہ انہوں نے اسلام کے نظریات کی روشنی میں ارسطو کے خیالات کو پیش کیا ہے۔ اسلامی فلسفے میں کوئی چیز ایسی موجود نہیں ہے جس کا اسلامی تہذیب و ثقافت و تمدن کے ساتھ رشتہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قدامت کی موزونیت، جاذبیت اور شکل و شباہت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ شکل اللہ تعالیٰ نے بنائی ہیں اور اس کو مت بگاڑو۔۔۔۔ اللہ کو اسلامی فلسفہ جمالیات میں حسن مطلق شمار کیا گیا ہے لہٰذا ہر شے کو اس کی اخلاقی

حیثیت میں پہچانا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ ے

اگر اسلامی فلسفہ جمالیات میں جمالیاتی قدروں کی بات کی جائے تو اس فلسفے کو ماننے والے جمالیاتی اقدار کو قرآن مجید کے ذریعے ثابت کرتے ہیں اور اس بات کو بیان کرتے ہیں کہ قرآن نے جمالیات کا جو معیار مقرر کیا ہے ہمیں اس کے مطابق چیزوں کو دیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔ حافظ بصیر پوری نے جمالیاتی اقدار کو اسلامی فکر و فلسفے کی روشنی میں دیکھا ہے۔ جمالیاتی قدروں کے حوالے سے ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> قرآن مجید میں حسن اور وجود کی بناوٹ اور تکمیل کے چار مراحل کو بیان کیا گیا ہے۔ اول تخلیق۔ کسی شے کا ہیولہ تیار کرنا۔ دوم تعدیل۔ اس میں اعتدال اور تناسب پیدا کرنا سوم تسویہ۔ اس میں مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنا۔ چہارم ترکیب صوری۔ خد و خال یا صورت بنانا۔ خدا نے تخلیق کے لیے ان جمالیاتی قدروں کو ضروری قرار دیا ہے۔ ۸

اسلوب

حافظ بصیر پوری کے خطوط کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انہوں نے مکالماتی انداز میں خطوط لکھے ہیں۔ ان کے یہاں مکالمہ نہایت روانی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ خطوط کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دو لوگ آمنے سامنے بیٹھے محو گفتگو ہوں اور محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شخصیت ہمارے سامنے مکالمہ کر رہی ہے۔ انہوں نے جملوں کی بناوٹ اور الفاظ کے انتخاب میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے جس سے ان کی تحریر دلچسپ انداز میں آگے بڑھتی ہے۔

حافظ بصیر پوری ایک مثبت سوچ کے حامل مصنف کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں، وہ کسی منفی بات سے مثبت پہلو بیان کرنے اور نکالنے کا ملکہ دوسرے سے کہیں زیادہ رکھتے ہیں۔ یہ چیز ان کے ذوق جمال کا پتہ دیتی ہے، اسی سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تصوف سے بھی ان کا گہرا رشتہ تھا، وہ ایک صوفی کی طرح دوسروں میں اوصاف تلاش کر کے ان کو دوسروں کے سامنے رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ گو ان کی تحریر عام فہم اور سادہ اسلوب کی حامل ہے اور وہ اپنی تحریر میں بوقت ضرورت فارسی کے اشعار اور محاورے کا استعمال بھی کرتے ہیں، انہوں نے اپنے شاگردِ خاص پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی کے نام خط میں لکھا:

> بھئی تم نے میرا کھوج صحیح لگایا۔ میں واقعی ان دونوں بوریوالہ میں ہوں۔ دراصل جون ۷۷ء میں جب بھٹو حکومت آخری ہچکی لے رہی تھی مجھے غالباً داڑھی رکھنے کی پاداش میں یا کسی مہربان کے کہنے پر کہ "ایں ہم شتر بچہ است" گورنمنٹ ڈگری کالج بوریوالہ سے تبدیل کر دیا گیا۔ اس کا مجھے کچھ فائدہ ہوا اور کچھ نقصان بھی۔ فائدہ تو یہ ہوا کہ ہر روز گھر

> سے آنے جانے کی کوفت ختم ہو گئی۔ کیوں کہ پاکپتن سے روزانہ یہاں
> آنا جانا ممکن نہ تھا۔
> بوریوالہ کالج عمارت کی شان و شوکت اور چمن زاروں کی زیب و زینت
> ہے اس لحاظ سے یہ گورنمنٹ کالج ساہیوال کا مثیل ہے اور نظم و نسق بھی
> خود کفیل ہے۔ سٹاف کی اکثریت محنتی فرض شناس اور بے کینہ ہے۔
> دو چار حضرات سخن فہم بھی ہیں، اگرچہ ایک دو غالب کے طرفدار بھی
> ہیں۔ بالخصوص پرنسپل جناب محمد اکبر خان سنبل نہایت مخلص مہربان
> اور صاحب دل شخص ہیں۔ ۹

حافظ صاحب کے خطوط میں منظر نگاری بھی ملتی ہے جیسا کہ انہوں نے پروفیسر تحسین فراقی کو لکھے گئے اپنے خط میں فریدیہ کالج پاک پتن کے بارے میں لکھا کہ "فریدیہ کالج پاکپتن کے کھنڈروں سے نکل گئے" اسی طرح ان کے خطوط میں کچھ منظر کشی اور علم بیان کی جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے ایک خط میں بصیر پور کی گلیوں کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

> "کیا تم اب یہاں کبھی نہیں آو گے؟ میاں! میری آنکھوں سے دیکھو! میرے
> کانوں سے سنو! بصیر پور کی گلیاں تیری راہ دیکھتی ہیں اس شہر کے
> ....در و دیوار تیرا انتظار کرتے ہیں.........یہاں سے درس کی
> طرف جاتے ہوئے سر راہ واقع ایک پرانی سی بستی کے کھنڈروں سے مجھے
> بارہا ایک دلدوز صدا سنائی دیتی ہے..........جیسے ایک ماں، بے چاری،
> دکھیاری، مامتا کی ماری اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے کو پکار رہی ہو..........
> دو تین مرتبہ ہم نے اس بے کس کے گھروندے کی مرمت وغیرہ بھی
> کروائی ہے، مگر انتظار کی حدت سے جلتی ہوئی آنکھوں اور پیاری شدت
> سے تڑپتے ہوئے دل کو تو اس کا وہ بیٹا ہی تسکین دے سکتا ہے جو دور کہیں
> بہت دور ایک نئے دیس میں جا چکا ہے اور نئی بستی بسا چکا ہے۔ اسے کیا
> خبر کہ اس کا من موہنا منظوم علم و عقل کی بلندیوں پر پہنچ کر محبت کی
> فرسودہ روایتوں کو بھلا بیٹھا ہے" ۔ ۱۰

دین اسلام سے ان کی رغبت اور راہِ سلوک میں ان کو ایک مقام و مرتبہ حاصل تھا اور اس کے ساتھ باطنی طہارت اور بصیرت کے حامل انسان تھے، ایک کامل شیخ کی طرح دوسروں کی رہنمائی کرتے ان کو راہ خدا کی دعوت دیتے اور اس پر رغبت دلانے کی بھرپور کوشش کرتے۔ ڈاکٹر محمد اکبر خان صاحب سنبل کے نام اپنے ایک

خط میں دعوت اور تلقین کا ایک خوبصورت انداز ملاحظہ ہو:

آپ نے کوئی خاص عمل یا دعا لکھ بھیجنے کے متعلق ارشاد فرمایا تھا۔ اس سلسلے میں پہلی گزارش تو یہ ہے کہ اپنے شیخ کے تلقین کردہ وظائف پر زیادہ سے زیادہ عمل فرمائیں۔ ان کے علاوہ کوئی عمل کریں تو اس کے لیے بھی شیخ کی اجازت حاصل کرنا نہایت سود مند رہتا ہے۔ شیخ کامل سالک اور منزل کے درمیان واسطۂ رابطہ اور وسیلہ جلیلہ ہوتا ہے۔ ویسے اگر آپ میرے اخلاص پر اعتماد کریں اور خوشامد نہ سمجھیں کہ میں خود خوشامد کو معصیت گردانتا ہوں تو علی وجھہ البصیرۃ عرض کرتا ہوں کہ آپ کے واصل وکامل والد ماجد علیہ الرحمۃ کا آخری دو چار ایام کے لیے آپ کے پاس آجانا، علاوہ دوسرے مصالح کے جو آپ کو معلوم ہوں گے ایک خاص مقصد کے لیے تھا وہ ایک روحانی وراثت منتقل کرنا چاہتے تھے جو نگاہِ عاطفت کے ذریعے بطریق احسن منتقل ہو چکی۔ مجھے اس بات کا یوں احساس ہوا ہے کہ ان کی رحلت کے بعد سے کبھی کبھی آپ کی صحبت میں میرے دل کی کیفیت بالکل اسی طرح بدلتی ہے جس طرح بعض اوقات کسی صاحبِ تصرف کے مزار پر حاضری کے وقت بدل جاتی ہے۔

۱۱

نیکی کی بات کرنا اور کسی کو سیدھے راستے پر بلانا بھی ایک جمال ہی ہے، حافظ صاحب دنیا داری کے امور، ادب کے ساتھ ساتھ خالق حقیقی کی طرف بلاتے بھی نظر آتے ہیں اور اس سلسلہ میں بھی ان کا اسلوب ایک صوفی کی طرح ہے جو اسلامی شعار کی پابندی کے ساتھ دنیا کے بے وقعت اور آخرت کو اصل سرمایہ قرار دیتے ہیں اپنے ایک خط میں حافظ صاحب سنبل صاحب کو اس طرح لکھتے ہیں:

انسانی زندگی کا دوام، ایک صبح وشام سے بیش نہیں ۱۲

اسی طرح دنیا کی بے ثباتی اور دین کی طرف رغبت دلانے کا خوبصورت انداز ہمیں دوسرے خطوط میں بھی ملتا ہے جس میں وہ اپنے دوستوں کو دنیا سے دل لگانے سے روکتے ہیں اور اللہ کی طرح رجوع کرنے کی تلقین کرتے ہیں ان کا انداز اس قدر خوبصورت ہے کہ بات جیسے دل میں گھر کر جاتی ہے۔

ہو سکے تو اللہ اور اس کے رسول کی محبت کو اپنا شعار بناؤ۔ اللہ والوں سے پیار کرو۔ دل کو بتخانہ بنا کر کیا لوگے۔ اسے کعبہ ہی رہنے دو.........
اس سے پہلے کہ آواز آئے کہ انور غیور نہیں رہا........ ۱۳

ان کے اسلوب کی یہ خاص بات ہے کہ یہ سنجیدگی میں بھی مزاح کا پہلو پیدا کر لیتے ہیں اور تحریر میں شگفتگی آجاتی ہے جسے ہر صاحب دل محسوس کر سکتا ہے۔ ان کا اسلوب بیان ایسا ہے کہ خطوط کے بہت سے واقعات میں سے کچھ اشارے نکال کر وہ خطوط میں جگہ جگہ طنز، مزاح یا خوش طبعی کے لیے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں فارسی زبان وادب کا گہرا عمل دخل نظر آتا ہے اس لیے کہ ان کی علمی گفتگو میں فارسی اور عربی کے الفاظ متواتر اور کثرت کے ساتھ ملتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اکبر سنبل کے نام اپنے خط میں خفیف سی طنز سے کچھ احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں، حافظ صاحب لکھتے ہیں:

> آپ اپنے مکینک کو کہہ کر مجھے کوئی اچھی سی کار دلوا ہی دیں، شاید اس طرح مجھے آپ تک پہنچنے میں بھی سہولت رہے۔ یہ بھی خیال آتا ہے کہ مزید افتادہ ودرماندہ نہ ہو جاؤں۔ آخر آپ کے پاس بھی تو اپنی گاڑی ہے مگر ۱۴

ان کے اسلوب میں جا بجا اور واضح طور پر عالمانہ اور مبلغانہ انداز نظر آتا ہے۔ اسلامی فلسفہ جمالیات کے ماننے والے اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ذات تمام حسن کا منبع ہے اور اس نے جو کچھ انسان کے لئے کہہ دیا ہے اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ اس لئے ان کے اسلوب کہ ایسے رنگ ان کے فلسفہ اسلامی جمالیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اسلوب میں اور باتوں کے انداز میں مختلف قسم کے مباحث کیے ہیں جن کی نوعیت علمی ادبی اور فلسفیانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب کی یہ انفرادیت ان کی تحریر سے بھی عیاں ہوتی ہے۔

> کچھ گستاخ کہہ دیتے ہیں حضرت آدمؑ نے ہمیں بھی جنت سے نکلوایا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان گستاخ روحوں نے حضرت کو نکلوایا جو آپ کی پشت میں تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آدم جاؤ، ان کو نکال کر تم پھر یہاں آجانا۔ خیر باتیں وعظ کا رنگ اختیار کر گئیں ۔ یہ سب باتیں آپ بخوبی جانتے ہیں۔ مقصود یہی تھا کہ کچھ بات چیت ہو جائے۔ روزہ، تراویح، اعتکاف اور سخاوت کا آپ یقیناً اہتمام فرمارہے ہوں گے کہ یہ نیکی کا سیزن ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو برکات صیام سے بہرہ ور فرمائے اور قیام اللیل کی توفیق ارزانی کرے، اہل خانہ اور بچوں کو سلام و دعوات و تبریکات۔۱۵

ان کے عالمانہ انداز تحریر کا نمونہ ہمیں اس خط سے ملتا ہے جس میں انہوں نے پروفیسر محمد امین عازم کو لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحب کو صرف ونحو کے ماہر استاد بھی تھے۔ اس میں کچھ الفاظ کے

حوالے سے وہ پروفیسر عازم کی رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔
حافظ صاحب لکھتے ہیں:

"(۱) زلف۔ کانوں پر پڑی ہوئی لٹ۔ کاکل۔ آگے پیشانی پر گرے ہوئے بال یا چوٹی کے بال۔ گیسو۔ سر کے دونوں طرف لٹکے ہوئے بال

(۲) رعنا۔ ایسا خوبصورت جس میں غرور کا عنصر بھی ہو۔ نخرہ اور بانکپن ہو۔ زیبا۔ ایسا خوبصورت جس میں سجاوٹ کا پہلو غالب ہو۔ خوشنمائی ہو۔

(۳) اعتذار اور معذرت دونوں کا مادہ عذر ہے مگر معذرت عربی لحاظ سے ثلاثی مجرد کی مصدر ہے اور اعتذار ثلاثی مزید فیہ ہے۔ للذا اعتذار میں معذرت کی بہ نسبت مبالغہ ہے۔"[۱۶]

حافظ بصیر پوری اپنے خطوط میں کئی جگہوں پر مذہبی تہواروں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے خطوط پڑھیں تو زندگی کا بھرپور احساس اجاگر ہوتا ہے، ان کے ہاں خوشی غمی دکھ تکلیف درد سبھی کچھ ملتا ہے جو ہر طرح سے زندگی کے محسوسات و روابط کو ہمارے سامنے لے آتا ہے۔

ماہ رمضان میں لکھے گئے خطوط میں رمضان المبارک کا تذکرہ بہت ہی محبت اور خوشی کے ساتھ کرتے ہیں اسے کے ساتھ ہی مکتوب الیہ کو رمضان کی فیوض و برکات سے بھرپور استفادہ کرنے اور اس میں نیکی کرنے کی ترغیب دلاتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح عید و بقر عید کی مبارکبادیں بھی پیش کرتے ہیں۔

۳۰ اگست ۱۹۸۱ء کو پرنسپل بوریوالہ کالج محمد اکبر سنبل کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

رمضان المبارک اپنی برکات کا دامن سمیٹ کر جا چکا۔ صبح عید مسکرائی اور ایک نگاہ غلط ڈال کر دامن فشاں گزر گئی.......... میں نے زبان حال سے ایک سدائے تہنیت و تبریک عید آپ کو دی تھی مگر جانتا ہوں کہ آپ تک نہ پہنچ سکی ہو گی۔[۱۷]

اچھے مسلمان گھرانوں میں ہمیشہ سے رمضان کی آمد پر خوشی اور رخصتی پر ایک تاسف کا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے اور آمد رمضان پر یہی خوشی اور اختتام رمضان پر دکھ کا اظہار بھی ان کے خطوط میں ملتا ہے۔ اپنے خطوط میں عید و رمضان کے علاوہ دیگر اسلامی تہواروں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی مصروفیات کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

آپ کا خط نومبر میں موصول ہوا تھا۔ عید میلاد النبی کے جلسوں کی کثرت و مصروفیات خط کے جواب میں مانع رہیں۔[۱۸]

ان کے خطوط زندگی سے لبریز ہیں اور زندگی کے تمام احساسات و جذبات بھی حافظ بصیر پوری کی خطوط

نگاری میں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کچھ خطوط میں اپنے بچوں اور بزرگوں کی بیماری اور اپنے پیاروں کے گزر جانے کا احوال بھی بیان کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تعزیت اور ایصال ثواب کی نیت سے اس کو خطوط میں شامل کیا ہے۔ اور انہی سطور میں اس غم واندوہ سے نجات پانے کا نسخہ بھی تحریر کرتے ہیں

جہاں تک اپنا تعلق ہے، بزرگوں کی بیماریوں، بچوں کی بیکاریوں، دل و جان کی بے قراریوں اور طبع نارسا کی بیزاریوں میں گھرے ہوئے تنہا شخص کے لیے عید کیا سامانِ نشاط مہیا کر سکتی ہے۔ اِلا یہ کہ دو رکعتیں بطور شکرانہ ادا کر لیں کہ اللہ تعالیٰ نے صیام و قیام کی توفیق مہینہ بھر عطا کئے رکھی۔ ۱۹

اسی طرح سیالکوٹ میں مقیم اپنے دوست پروفیسر افتخار احمد چوہدری کے نام خط میں اپنی ہمشیرہ کے انتقال کی خبر مندرجہ ذیل الفاظ میں دیتے ہیں۔

حافظ بصیر پوری لکھتے ہیں۔

یادِ رفتگان میں اضافہ ہوگیا۔ شراب سہ آتشہ ہو گئی۔ زہر غم کا پیالہ چلا گیا۔ میرے مکان کی چھت گر گئی ہمشیرہ محترمہ جن کی بیماری کا شاید تمہیں ذکر بھی کیا ہو مورخہ ۲۰-۰۵-۸۲ کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئی ہیں۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

دعائے مغفرت کرنا اور ہو سکے تو کچھ قرآن کریم پڑھ کر یا نوافل ادا کر کے ان کی روح کو ثواب پہنچانا۔ میرے لئے صبر جمیل کی اور اجر جزیل کی دعا کرنا۔ ۲۰

حافظ بصیر پوری کے خطوط میں ایک خاص طرح کی انفرادیت پائی جاتی ہے مندرجہ بالا خط کی ابتدا جس خوبصورت انداز میں کی گئی ہے اس طرح سے آغاز کی مثال کم ہی ملتی ہیں، ان کے ہاں بعض مقامات پر اطلاع بالکل ہی عام اور سادہ سے انداز میں دی گئی ہے ان انتہائی سادہ اسلوب کی مثال ہمیں اس خط میں ملتی ہے جو انہوں نے سعودی عرب کے شہر ریاض میں مقیم اپنے دوست انور غیور کو لکھا جس میں انہوں نے اپنے والد کے انتقال کی خبر سادہ اور مختصر الفاظ میں تحریر کی ہے۔

حافظ صاحب لکھتے ہیں:

اواخر جنوری میں آپ کا خط موصول ہوا تھا، میں رہین ستم ہائے روزگار رہا یاد تو کرتا رہا مگر جواب نہ لکھ سکا۔ قبلہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ دس دسمبر

کو رحلت فرما گئے تھے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۲۱

اسی طرح اپنے دوست رانا مختار کے انتقال کی خبر بھی احسن طریقے سے پیش کرتے ہیں جس کا مقصود نہ صرف اطلاع تھا بلکہ اس سے تنبیہ کرتے ہوئے موت کی یاد دلانے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے۔

> رانا مختار احمد مرحوم نے بی اے کیا۔ سعودی عرب رہا۔ کمائی کی۔ واپس آیا ایک بنک میں تقرری کا آرڈر لیا۔ join کرنے جارہا تھا کہ ویگن اُلٹ گئی، شہید ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ یہ فروری کا واقعہ ہے اب بھی ہماری چشم عبرت بند رہے گی۔۲۲

غزل، نظم اور نثر پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ حافظ بصیری پوری علوم اسلامی پر بھی پوری دسترس رکھتے تھے اور اس سلسلہ میں بھی ان کی حیثیت ایک مسلم رہنما اور مفتی کی تھی۔ دوست احباب ان سے دینی علوم کے بارے عام مسائل دریافت کرنے کے ساتھ ساتھ فتاویٰ کے لیے بھی رجوع کرتے تھے یہاں بھی حافظ صاحب کے ہاں ایک صوفی کی خوبصورت جھلک نظر آتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ علوم وفنون کا منبع تھے وہ انتہائی بارک بینی کے ساتھ مسائل سے آگاہ کرتے اور پوری طرح سے جزیات کو سامنے رکھ کر خوبصورتی کے ساتھ ایک ایک نکتہ پر بات سمجھاتے۔ وہ دینی مسائل کے ساتھ اخلاقی طور پر بھی بلند مقام و مرتبہ پر فائز ہونے کی طرف توجہ دلاتے اور اس کی ترغیب دلاتے ہیں۔ چونکہ اسلام بنیادی طور پر اخلاق بلند رکھنے کی تلقین کرتا ہے اسی ترتیب کو مد نظر رکھتے ہوئے حافظ صاحب بھی پہلے اخلاق کی تربیت و ترغیب دیتے ہیں اور اس کے بعد اصل مدعا پر بیان کرتے ہیں۔ پروفیسر محمد امین عازم کے خط کے جواب میں انہوں نے جس طرح مضمون باندھا اس کو حافظ صاحب کا خاصہ کہنا بے جانہ ہوگا۔

حافظ صاحب لکھتے ہیں:

> استفتاء کے سلسلہ میں پہلے آپ ایک اصول مد نظر رکھیں کہ شرع شریف میں ایک فتویٰ ہوتا ہے اور ایک تقویٰ۔ اگرچہ ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے مگر بعض اوقات تقاضے تھوڑے تھوڑے مختلف ہو جاتے ہیں۔
>
> مثلاً فتویٰ یہ ہے کہ اگر کپڑوں پر درہم بھر یا کم نجاست لگی ہو تو اُن سے نماز ہو جائے گی مگر تقویٰ یہ ہے کہ اسے بھی دھو لیا جائے۔ اخلاقی اور بعض اچھے سماجی تقاضے بھی تقویٰ کے ضمن میں آتے ہیں۔ ان تقاضوں کو سامنے رکھنا اگرچہ فرض عین تو نہیں مگر ان کا لحاظ رکھنے سے تقویٰ صورت پذیر ہوتا ہے اور عظمتِ کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنی

منکوحہ سے استمتاع کر سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ سُسر کے سامنے ایسا کرنا اخلاقی طور پر معیوب اور تقویٰ کے خلاف ہے۔ شرم وحیا خود شریعت مطہرہ کا تقاضا ہے۔

رخصتی شرعی لحاظ سے کوئی حد نہیں۔ کیونکہ شادی کا مقصد نکاح کا عقد ہے نہ کہ دھوم دھام اور رخصتی۔ لہٰذا اگر وہ رخصتی سے قبل حاملہ ہو گئی تو خاوند پر کوئی شرعی حد نافذ نہیں ہوتی کیوں کہ رخصتی محض حدود معاشرہ میں سے ہے۔ کتنی ہی لڑکیاں اپنے خاوند سمیت میکے میں ہی رہ جاتی ہیں۔ ۲۳

حافظ صاحب کے خطوط میں دینی امور پر بات کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرتی برائیوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے نہ صرف یہ بلکہ اس کے لیے انتہائی غیر محسوس طریقے سے تنقید بھی کرتے نظر آتے ہیں اور ان مسائل کے حل کی تجویز بھی پیش کرتے ہیں جو لازمی طور پر معاشرتی اعتدال کے استحکام ضامن ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ انہوں نے ایک خط میں بیان کیا ہے۔

حافظ صاحب لکھتے ہیں:

خاوند چاہے تو اپنی منکوحہ کی جلد رخصتی کا تقاضا کر سکتا ہے اور جہیز کے لیے اپنی خوشی سے بلا جبر واکراہ مدد بھی دے سکتا ہے۔ ۲۴

اس سے آگے بڑھیں تو اسی معاشرتی اعتدال و توازن کے لیے کوشش کرتے ملتے ہیں

اسلام نے جائز سماجی روایات جو سنت سے متصادم نہ ہوں بحال رکھی ہیں تاکہ معاشرتی زندگی پر سکون رہے۔ اس لیے کسی کو ان قدروں سے خوامخواہ الجھ کر اپنی زندگی کو جہنم کدہ نہیں بنانا چاہیے، وقتی سکون دائمہ پریشانیوں کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ ۲۵

ان کا روحانیات اور تصوف کی طرف روجحان ان کے متعدد خطوط میں ملتا ہے وہ اپنے دوستوں کو انتہائی خوبصورتی کے ساتھ روحانی علاج بھی بتاتے ہیں:

میرے تجربہ میں فاتحہ شریف سب سے بڑھ کر رہی ہے جس کے بائیس نام تفاسیر میں مذکور ہیں جن میں سے دو شافیہ اور شفا ہیں۔

رسول اکرم ﷺ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ یہ ہر مرض کے لیے دوا ہے۔ مفسرین نے لکھا کہ اسے چالیس روز تک صبح سویرے سفید چینی کے برتن میں آبِ زمزم، عرقِ گلاب یا کنویں کے پانی سے لکھ کر اور دھو کر

پلایا جائے تو موت کے سوا ہر مرض کا علاج ثابت ہوگی۔ اگر موت مقدر
ہو چکی ہے تو تکلیف سے نجات ہو جائے گی۔ ہمشیرہ مرحومہ کو میں پلاتا
رہا۔ چالیسویں روز انتقال ہو گیا اور تکلیف سے نجات پا گئیں۔ ویسے بھی
پڑھ کر پھونکتے رہا کریں۔ ضرور فائدہ ہوگا۔[۲۶]

ان کے اسلوب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ اشعار کا استعمال بھی بخوبی کرتے ہیں۔ حافظ بصیرپوری کیوں کہ خود شاعر ہیں اور نظم اور غزل دونوں ہی لکھتے ہیں۔ اس لیے خطوط میں ان کا شاعرانہ مزاج ان کی شخصیت کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں بہت جگہ بات کہنے کی بجائے شعر لکھ کر اس بات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خطوط کے مجموعے میں اردو اور فارسی دونوں طرح کے اشعار موجود ہیں۔ حافظ صاحب کے ہاں فارسی شاعری کا گہرا مطالعہ ملتا ہے اور حافظ شیرازیؔ اور سعدیؔ کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے کہ انہیں فارسی زبان و ادب سے اپنے کلچر اور خطے کی وجہ سے اچھا لگتا ہے جس کا ذکر وہ اپنے خطوط میں بھی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں بات اشعار محبت کے حوالے سے اور جام کے حوالے سے یہ ملتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو حافظ بصیرپوری کا اسلوب خطوط میں فلسفیانہ بصیرت کا بھی حامل ہے جس کی وجہ سے انہوں نے بڑے بڑے موضوعات پر اشعار لکھ دیے ہیں۔ حافظ بصیرپوری کیونکہ ادب سے اور اسلامی قدروں سے گہری واقفیت رکھنے والے تھے اس لیے انہوں نے منطقی دلائل کی طرف رجوع کیا ہے۔

ان کے اسلوب میں شاعرانہ وسائل نثر میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ جب کوئی شاعر لکھتا ہے تو اس کی جملوں کی بناوٹ اور الفاظ کا چناؤ نہایت ہی بہتر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ شاعر کو الفاظ اور اس کے انتخاب پر عبور حاصل ہوتا ہے تب ہی وہ دو جملوں میں زندگی کے بڑے بڑے رموز کو سمو دیتا ہے۔ حافظ بصیرپوری چونکہ شاعر تھے اس لئے ان کے خطوط میں شاعرانہ رنگ بڑا واضح انداز میں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ بصیرپوری کے اسلوب میں شاعرانہ اصطلاحات کا استعمال ان کے واقعات کو مزید دلچسپ بناتا ہے۔

اس حوالے سے حافظ بصیرپوری کے خطوط کے چند اشعار دیکھئے۔

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا مقبول
تیرا کرم کے تو نے دیا دل دکھا ہوا

میں نے اس نعمت عظمیٰ کے حصول کے لیے کتنے ہیں زخم کھائے ہیں اور کتنی ہی بار پھر بہار میں آرزو کے مہکتے پھول مرجھائے ہیں۔

دل پہ لیا ہے داغ عشق کھو کی بہار زندگی
اس گل تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا

ہم سب آپ کی دل جوئی اور ہمدردی کے شکر گزار ہیں۔ جملہ افراد خانہ کی

طرف سے آپ کو اور آپ کے والدین کو سلام پہنچے ۲۷

انہوں نے اپنے اسلوب میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ان کا بیان کبھی بوجھل نہ ہو اس لیے وہ خط میں باتوں کے ایک دو رخ ہی متعین کرتے ہیں اور پھر انہیں پر ہی بات کرتے ہیں۔ ان کی اسلوب نگاری کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اپنے متن کے ساتھ جڑ جاتے ہیں اور پھر اس کے حوالے سے جو کچھ علمی اور ادبی حوالے سے وہ بیان کر سکتے ہیں ان کو بیان کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں خطوط میں بہت سے اشارے علمی اور ادبی نوعیت کے ہوتے ہیں جو صاحب علم آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ حافظ بصیر پوری نے خطوط میں کی جگہ واحد، جمع، ضرب المثل، کہاوت، متضاد، مترادف کا استعمال اپنے خطوط میں جا بجا کیا ہے جس سے ان کے اسلوب میں ایک خاص طرح کی علمی اور ادبی فضا پیدا ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے کی تحریر میں ایک ہی لفظ کو مختلف معنی میں بھی استعمال کیا ہے جو ان کی زبان دانی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

خطوط کا اختتام بھی ان کے فلسفہ اسلامی جمالیات کے حوالے سے اہم ہوتا ہے کہ یہ خطوط کا اختتام بڑے اچھے اور موثر انداز میں کرتے ہیں۔ ان کے یہ ادا یہ انداز اور الفاظ کا استعمال بڑے محتاط انداز میں کیا جاتا ہے۔ وہ خطوط نگاری کی روایت کے فارسی انداز کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے خطوں کا اختتام کرتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ انداز دعایہ بھی ہوتا ہے اور اللہ رب العزت کے لئے تمام تعریفیں ہوتی ہیں۔

وہ دل کی گہرائیوں اور اپنے پر خلوص جذبات سے اپنے مخاطب کو الوداع کرتے ہیں۔ ان کے خطوط میں عموماً اسی انداز کو سامنے رکھا جاتا ہے اور وہ ان مخصوص باتوں کے علاوہ بھی کوئی ایک آدھ بات یا شعر درج کر دیتے ہیں جس سے پورے خط کا ماحول خوشگوار ہو جاتا ہے۔

ان کے خط کا اختتام دیکھیے:

> ہاں تو تم نے یہ فقرہ کتنا اچھا لکھا ہے کہ خدا مجھے ہر تشنہ وفا کی پیاس بجھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ مگر نہ جانے کیوں؟ مجھے اس فقرے سے تکلیف ہو رہی ہے۔۔۔ اگر تم بتا سکو تو مہربانی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت کے سارے امتحانوں میں تمہیں کامیاب و کامران رکھے۔ حیات جاوید پاؤ اور ہمیشہ مسکراؤ۔ اپنے چچا جان کو سلام کہنا بلکہ اپنے والدین کو بھی میرا سلام ہے ۲۸

زبان و بیان

حافظ بصیر پوری کے خطوط میں زبان کا مطالعہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے انہوں نے علمی اور فلسفیانہ زبان کا زیادہ استعمال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایسے الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے جن کا استعمال خطوط

میں عموماً کیا جاتا ہے۔ حافظ بصیرپوری کی میلان طبع کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے وہ نہایت شائستہ گفتگو کرنے والے تھے اور علمی اور ادبی حوالے سے وہ عموماً گفتگو کیا کرتے تھے۔ علمی اور ادبی حد والے سے ان کی گفتگو معنی خیز ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا مکالماتی انداز ان کی شخصیت کو اور نمایاں کرتا ہے۔

حافظ بصیرپوری کے خطوط میں روایتی الفاظ کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے خط کے شروع میں بہت سے الفاظ ایسے استعمال ہوتے ہیں جن کو روایتی الفاظ کہا جاتا ہے۔ دور جدید کے ساتھ ساتھ خط کہ وہ روایتی الفاظ جن کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ یہ فارسی انداز بیان ہے ان کا سہارا لیا ہے۔

جیسے مزاج عالی، السلام علیکم، مزاج گرامی، بسر و چشم، غمگسار جان سنبل صاحب، جان مہر، واجب الاحترام، مکرم، شگفتہ رو، جیسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جو خط کے شروع میں درج ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے عربیاور فارسی کے الفاظ بھی خطوط میں استعمال کیے ہیں اور ان سے جو معنی متعین کیے ہیں وہ اردو طریقہ کار کے مطابق اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے عربی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔

اردو میں عربی الفاظ کو استعمال کرنے کا قاعدہ یہ ہے کہ جن عربی الفاظ کو استعمال کرنا مقصود ہو ان کو عربی زبان میں ہی لکھا جائے۔ انہوں نے بھی عربی کے اس قاعدے کو ٹھیک طریقے سے برتا ہے اور عربی الفاظ جہاں عبارت میں آتے ہیں ان کو عربی انداز میں ہی لکھا ہے۔ بعض شعرا اور ادیبوں کے یہاں اس کا اہتمام نہیں کیا جاتا لیکن ان کے یہاں اس کا بطور خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

انھوں نے محاورات اور ضرب الامثال کا بھی بعض جگہ پر استعمال کیا ہے اور موقع محل کے مطابق یہ استعمال اتنا درست ہے کے پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ ان کے یہاں علمی اور ادبی حوالے سے لکھے اور پڑھے جانے والے الفاظ جو عام اردو میں پڑھے اور لکھے نہیں جاتے ان کا بھی استعمال کیا ہے۔ یہ عموماً فارسی کے الفاظ ہیں جو مشکل تراکیب کے ساتھ ان کی تحریر میں کہیں نہ کہیں نظر آتے ہیں۔ ایسے الفاظ اور عبارتوں سے ان کی تحریر عالمانہ اور محققانہ انداز بھی اختیار کر لیتی ہے جو خط کے لطف کو کم کرتی ہے۔ خطوط نگاری میں جہاں بھی علمی اور ادبی مباحث طوالت پکڑتے ہیں وہی ان کا اثر بھی قاری پر کم ہوتا ہے۔

حافظ بصیرپوری کے کچھ خطوط بہت طویل ہیں اور ان کی صفحات کی تعداد دس تک ہے۔ ایسے خطوط عموما ان کے علمی اور ادبی دوستوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔

حافظ بصیرپوری مختلف زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ عربی کے حوالے سے بھی انہوں نے کافی کچھ پڑھا اور سیکھا تھا جس کا اظہار ان کی خطوط نگاری میں بڑے خوبصورت انداز میں سامنے آتا ہے۔ حافظ بصیرپوری کیونکہ استاد تھے تو استاد کا رنگ بھی ان کی زبان دانی میں نظر آتا ہے

حور عربی زبان کے لحاظ سے جمع ہے جس کے معنی ہیں سیاہ چشم عورتیں۔
واحد اس کا حورآ ہے۔ تاہم اردو میں حور بطور واحد مستعمل ہے اور ایسے

تغیرات زبان میں ہوتے رہتے ہیں۔ یہ نور سے پیدا شدہ مخلوق ہے اور
جنتی مردوں کو عطا کی جائیں گی۔ موجودہ بیویوں کو بھی حسن و جمال عطا
کرکے ان کا سردار بنایا جائے گا اور یہ بشرطیکہ مغفور ہوں اپنے مغفور
خاوندوں کے گھر میں ہی ہوں گی اور حوریں ان کی کنیزوں کی حیثیت
میں رہیں گی۔ یہ بات علیحدہ کہ جنتی مرد ان سے بھی متمتع ہوں گے
جس طرح ابتدائی دور میں لوگ زرخرید کنیزوں سے بھی استمتاع
کرتے تھے۔ رہ گئی کنواری یا مطلقہ مغفور عورتیں تو وہ کنوارے جنتی
مردوں سے بیاہ دی جائیں گی۔۲۹

زبان کے حوالے سے ان کی ایک اور خوبی شاعرانہ وسائل کا استعمال ہے انہوں نے نہایت مہارت سے شاعرانہ وسائل کا استعمال کرکے زبان کو خوبصورت اور پر وقار بنایا ہے جسے قاری پڑھتے ہوئے محسوس کرلیتا ہے اور لفظ تصویروں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ انہوں نے شاعرانہ زبان میں مختلف شعراء کے اشعار کے مصرعے بھی استعمال کیے ہیں جس سے ان کی نثر پڑھنے میں زیادہ دلکش ہو گئی ہے۔

اشعار کے استعمال سے انہوں نے اپنے مخاطب سے کئی ایسی باتیں بھی کرلی ہیں جو نثر میں کئی صفحات کی جگہ گھیر لیتی ہیں۔ شاعر کیونکہ اس کام میں ماہر ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے بڑے بڑے فلسفوں کو دو لائنوں میں بند کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اپنی نثر میں چھوٹے جملوں کو استعمال کیا ہے جو بامعنی ہیں اور اپنا مطلب اور مقصد بہتر طریقے سے ادا کر رہے ہیں۔ فلسفہ جمالیات کی طرف میلان رکھنے والے شاعرانہ فکر کے بہت قریب ہوتے ہیں کیونکہ حافظ بصیر پوری بھی اسلامی فلسفہ جمالیات سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی جمالیات کے قائل ہیں اور بامعنی باتوں کی طرف زیادہ سوچتے ہیں۔ ان کے نزدیک فن پارے میں معنویت جزو لاینفک ہے۔ اگر کسی بھی فن پارے سے معنویت کو غائب کر دیا جائے تو اس کے کوئی معنی باقی نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں ان کی سوچ اور فکر کی عکاسی نظر آتی ہیں۔

اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔
غمگسار جاں سنبل صاحب۔
السلام علیکم ورحمۃاللہ وبرکاتہ

اب میں ہوں اور ہجر کی تاریک خلوتیں
وہ روشنی کہاں جو تیری انجمن میں تھی

آج آپ سے بچھڑے چھٹا روز ہے۔ ابھی تک دل و دماغ سے دھواں اٹھ
رہا ہے۔ ایک حادثہ تھا گزر گیا۔ خود میرے لیے بھی غیر متوقع۔ اللہ مجھے

یقین بلکہ گمان تک نہ تھا کہ آپ سے اتنی جلدی اور اتنا اچانک جدا ہو جاؤں گا۔ ۲۰ مئی تک میرے دل میں تبادلے کی تگ و دو کا کوئی حتمی پروگرام نہ تھا گھریلو الجھنیں اور ذاتی مسائل تو پہلے بھی تھے۔ ۲۰ مئی کو کسی ہمدرد نے ایک بات کہی بس آپ اس تجسّس میں نہ پڑیں کہ وہ کیا تھی۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا۔ ۳۰

مجموعی طور پر حافظ بصیر پوری نے جو زبان استعمال کی ہے یہ علمی اور ادبی زبان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے شاعرانہ وسائل اور نثر کی ہنر کاریوں سے کام لیا ہے۔ انہوں نے جابجا عربی آیات، اشعار، ضرب الامثال اور بہت سی علمی اصطلاحات کو خطوط نویسی میں خوبصورتی سے برتا ہے۔ انہوں نے اپنے خطوط کو زبان کے حوالے سے دلکش بنانے کے لیے شاعرانہ وسائل سے اور کلاسیکل شعرا کے شعر خطوط کے شروع میں یا آخر میں یا درمیان میں بات کرتے ہوئے انھوں نے لکھے ہیں جو نہایت خوبصورتی سے استعمال ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ بصیر پوری کے خطوط زبان کے اعتبار سے عمدہ ہیں۔

اسلامی فلسفہ جمالیات

حافظ بصیر پوری کا شمار ان شعرا اور ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اسلامی فلسفہ جمالیات کو بہت اہمیت دی ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کو اول و آخر کتاب سمجھا اور خدا نے اس کتاب میں جو حکم دیا ہے یہ اسی حکم کے تعبیر کر کام کرنے والے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے تفسیر کے لئے اس دنیا میں بہت سی چیزوں کو پیدا کیا جو جمالیاتی نقطہ نظر سے انسان کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ حافظ بصیر پوری کے خطوط میں اسلامی فلسفہ جمالیات کے حوالے سے بہت سی حیرتی موجود ہیں جن کا تذکرہ وہ مختلف خطوط میں کرتے رہتے ہیں۔

اگر اسلامی فلسفہ جمالیات کے حوالے سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے یہ لوگ خدا تعالیٰ کو حسن کل مانتے ہیں۔ دنیا میں تمام حسن خدا تعالیٰ کی ذات کی مرہون منت ہے اور خدا تعالیٰ کی تخلیق ہے اس لئے خدا تعالیٰ سے زیادہ حسین و جمیل اور جمالیات کو سمجھنے والا اور دوسرا کوئی نہیں ہے۔ تسوید کے حوالے سے دیکھا جائے جو اسلامی فلسفہ جمالیات میں اہم حیثیت رکھتی ہے تو اس حوالے سے ان کے خطوط بڑے مضبوط نظر آتے ہیں۔ انہوں نے خطوط کو باقاعدہ ایک ایسی شکل میں تحریر کیا ہے جو اس زمانے میں لکھی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ خطوط کے بنیادی عناصر بھی اس میں بدرجہ اتم نظر آتے ہیں۔

تسوید میں بنیادی طور پر کوئی بھی لکھنے والا اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ وہ کوئی غیر متعلقہ بات نہ لکھے اور اپنے مدعا کو بہتر اور احسن طریقے سے بیان کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی بنیادی شرائط میں موزونیت ہے

کہ تحریر میں اس قدر جاذبیت اور منطقی دلائل کہ آپ کی باتیں مناسب اور موزوں طریقہ سے سامنے آئی۔

حافظ بصیر پوری نے اسلامی فلسفہ جمالیات کے حوالے سے کچھ ایسی چیزیں بھی بیان کی ہیں جو ماورائے عقل ہیں لیکن ان کو کسی بھی طور پر جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ حافظ صاحب خدا تعالیٰ پر کامل یقین رکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے خطوط میں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے اور خدا تعالیٰ سے لو لگانے کے لئے بہت سے ساتھیوں کو تلقین کی ہے اور بتایا ہے کہ ہماری زندگی اسی راستے پر چل کر ہی آسان ہو سکتی ہے۔ اس حوالے سے حافظ بصیر پوری شیخ شبلیؒ کا ایک واقعہ خط میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> شیخ شبلی نے ایک بار کسی عارف سے پوچھا مشکل ترین صبر کونسا ہے؟ فرمایا الصبر من اللہ یعنی اللہ سے صبر کرنا شیخ کی چیخ نکل گئی۔ بے ہوش ہو کر گرے۔ قریب تھا کہ جان نکل جاتی۔ یہ باتیں اللہ والوں کی ہیں ہم کم ظرفوں کو یہ مرتبہ کہاں حاصل؟ خداوند اقدس پاک بندوں کے طفیل ہمیں نعمتوں میں شکر اور مصیبت میں صبر کی توفیق عطا فرمائے شکوہ شکایت سے بچیے۔[۳۱]

انہوں نے اپنے خطوط میں جابجا اسلامی فکر و فلسفے کی جمالیات کی عکاسی کی ہے اور زندگی کے بہت سے شعبوں میں جہاں ہمیں مذہبی حوالے سے رہنمائی دی گئی ہے اس پر غور و خوص کرنے کی دعوت اور خدا تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط رکھنے کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ دیکھا جائے تو یونانی کے اثرات عرب پر پڑے تو عرب میں مذہبی حوالے سے بہت سے معاملات میں انتشار پھیل گیا تھا جسے ارسطو اور افلاطون کی فکر کہہ کر آگے منتقل کیا جارہا تھا۔ وہی کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اسلامی فکر و فلسفے اور منطق کو سمجھ کر ان لوگوں کو تلقین کر رہے تھے کہ وہ غلط باتوں پر یقین نہ کریں بلکہ وہ فکر جو انہیں قرآن مجید میں دی گئی ہے اس سے کسی بھی طور پر دوری اختیار نہ کریں۔

اس دور میں اسلامی فکر و فلسفہ نے بھی بڑا عروج اختیار کیا اور یہ عرب سے نکل کر دنیا میں پھیل گیا۔ حافظ بصیر پوری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے خطوط میں اسلامی طرز زندگی اور اسلامی عبادات پر بہت زور دیا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اپنی زندگی مذہب اور اس کے اصول و قواعد کے تابع رہ کر گزارنی چاہیے۔ وہ مختلف فلسفیوں کے حوالے سے جب بات کرتے ہیں تو ان کے نقطہ نظر میں اسلامی فکر و فلسفہ نظر آتا ہے۔ حافظ بصیر پوری نے خطوط میں ان موضوعات پر بات کرکے ان کو وسعت بخشی ہے اور اپنے علمی اور ادبی سوچ اور فکر کا اظہار کر دیا ہے۔

حافظ بصیر پوری نے اپنے خطوط میں جابجا قرآنی الفاظ اور قرآنی آیات کو حوالے کے طور پر درج کیا ہے۔ وہ اپنی بات کی مدلل تائید کے لئے قرآن مجید کی آیت کو بطور سند پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کے مختلف اصول اور قوانین کے مطابق اپنی زندگی کو ترتیب دیا ہے۔ انہوں نے خطوط میں اپنے دوستوں سے جب اسلامی فلسفے

اور اسلامی تعلیمات کا کوئی سوال کیا ہے تو انہوں نے اس میں قرآنی آیات کا استعمال بطور سند کے کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے مختلف احادیث کو بھی اپنے خطوط میں جگہ دی ہے۔ انہوں نے احادیث کے حوالے اسلامی طرز فکر کو نمایاں کرنے کے لئے متعدد جگہوں پر دیے ہیں۔ انہوں نے خط میں ایک جگہ بیان کیا ہے۔

> مختلف آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی کا جو مجموعہ میرے پاس ہے وہ یہ ہے کہ کافر کے لیے جملہ تکالیف باعث عذاب ہیں اور بندہ مومن کے لئے باعث ثواب۔ یہ ثواب کیوں کہ گناہ گار ہوگا تو گناہ مٹیں گے اور پرہیز گار ہوگا تو درجات بلند ہوں گے البتہ صبر وشکر شرط ہے شکر سے نعمت بڑھتی ہے۔ فرمان خداوندی ہے۔
>
> لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ
>
> (اگر تم شکر کروگے تو تمہاری نعمت زیادہ کردوں گا)........یعنی شکر کا حق ادا کرنے سے عاجزی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ ۳۲

حافظ بصیر پوری نے اسلامی طرز فکر کے ساتھ ساتھ مختلف انبیاء کی زندگی کے واقعات کو بھی بیان کیا ہے اور وہ سمجھتے تھے کہ ہماری آنے والی نسل کو اپنے اصول و قوانین بنانے چاہیے اور اسلامی طرز زندگی کو اپنانا چاہیے۔ انہوں نے مذہبی فلاسفی کو بڑے غور سے پڑھا ہے اور انبیاء کے ایسے واقعات کو پیش کیا ہے جس میں اسلامی طرز فکر کی جمالیات واضح ہوتی ہیں۔ جمالیات کے ماننے والے فنکارانہ وسائل سے کام لینا خوب جانتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اپنی بات کو اس قدر بہتر طریقے سے پیش کرنا ہے کے سننے والے اس کے کچھ واقعات کو یاد رکھیں۔ انہوں نے بہت سے واقعات کا تذکرہ کیا ہے جو ہماری زندگی کے موافق ہے اور ہمیں ان کی طرف توجہ دینی چاہئے۔

انہوں نے شاعری کے حوالے سے علامہ محمد اقبال کے کافی اشعار کو مذہبی حوالوں کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کی شاعری اسلامی طرز فکر اور اسلامی فلسفے کو بہتر طریقے سے پیش کرتی ہے اس لئے انہوں نے اقبال کے اشعار کو جا بجا استعمال کیا ہے۔ اسلامی فلسفہ جمالیات کے حوالے سے حافظ بصیر پوری علامہ اقبال سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں اس لیے کہ اقبال کی فکر ان کے نزدیک مسلمانوں کی آواز ہے جس کو ہر طرف گونجنا چاہئے۔ اس لیے کہ اقبال نے جس دیانتداری کے ساتھ اپنے مذہب اور قوم کو پیش کیا ہے شاید ہی پچھلی صدی میں کوئی اتنی بڑی شخصیت گزری ہو۔

انہوں نے اسی فکر کو آگے بڑھایا۔ ان کے خطوط میں مجموعی طور پر اسلام کی جو فضا نظر آتی ہے وہ ان کے فلسفے کے قریب قریب ہے۔ ان کی زندگی کے مشاہدات اور تجربات ان کی فکر کی آبیاری میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

حافظ بصیر پوری نے اسلامی تہواروں کا بھی اپنے خطوط میں ذکر کیا ہے اور خاص طور پر عید کے تہوار کا

ذکر ان کے خطوط میں کی جگہ نظر آتا ہے۔ بنیادی طور پر ان کے خطوط میں مذہبی کلچر اور ثقافتی حوالوں سے بھی بہت سی چیزیں نظر آتی ہیں جن کو انہوں نے خطوط میں بڑے واضح انداز میں بیان کر دیا ہے۔ ان کے خطوط میں پنجاب کا کلچر اور ثقافت بھی کہیں نہ کہیں دکھائی دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مذہبی حوالوں سے، ماہ رمضان، عید، انبیاء کی پیدائش کے دن، اولیاء اور صوفیوں کا ذکر ان کے خطوط میں کی جگہ نظر آتا ہے۔ ان کے خطوط کے حوالے سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے خطوط زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں زندگی کے متنوع رنگ نظر آتے ہیں جو انسان کو کسی نہ کسی حوالے سے ضرور متاثر کرتے ہیں۔ یہ شاعر بھی ہیں اس لیے ان کی نثر میں ایک ایسا آہنگ پیدا ہو گیا ہے جو انسان کے احساسات کو چھیڑتا ہے اور انسان سوچنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ایک خط میں یہ عید کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں۔

ان کے خطوط میں بہت سے دوستوں کی وفات اور پیارے عزیز اور رشتہ داروں کی وفات کا بھی تذکرہ موجود ہے اور ان خطوط کی نوعیت دوسرے خطوط سے مختلف ہے۔ انہوں نے بہت سے خطوط میں اپنی شاعری اور کتابوں کی بھی بات کی ہے جو ان خطوط میں بہت اہم نظر آتی ہے۔ انہوں نے جب اپنا سفر نامہ حج لکھا تو اس کا تذکرہ بھی خطوط میں کیا۔

حافظ بصیر پوری لکھتے ہیں۔

> اپنی اس تصنیف کی طباعت کے سلسلے میں جس کا مسودہ غالباً تمہاری نظر سے گزرا ہوگا۔ مدینہ منورہ کے حالات و واقعات اور زیارت اور مشاہدات کے بیان پر مشتمل نام "اس دیار میں" ویسے تو دو اور کتابوں کے مسودات بھی تیار ہو چکے ہیں اور کسی صاحب نظر کے منتظر ہیں ایک اشعار کا مجموعہ دوسرا مختلف مقالات کا۔ خدا کسی ناصر کو بھیج دے یا کسی منظور کو تو اس کے حوالے کر دوں تاکہ تا حد امکان اصلاح ہو جائے۔
>
> ۳۳؎

حافظ بصیر پوری کے خطوط میں بہت سے موضوعات پر خطوط تحریر کیے ہیں۔ خطوط کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ شاعر خطوط میں اس مقصد کے تحت بھی اپنی باتیں شامل کرتے ہیں کہ وہ بعد میں حوالے کے طور پر کسی نہ کسی جگہ پر تحقیق کرنے والوں کے لیے کام آسکتی ہیں۔ حافظ بصیر پوری نے بہت سے خطوط میں اپنے حوالے سے بھی بات کی ہے اور اپنے حوالے سے کچھ ایسی باتوں کا بیان کیا ہے جو آنے والوں کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث ہوتی ہیں۔ حافظ بصیر پوری سیلف میڈ انسان تھے۔ انہوں نے اپنے خط میں بتایا ہے کہ ان کی ساری زندگی محنت اور مشقت کے کاموں میں گزری ہے۔ ایک خط میں یہ تحریر کرتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ افق شام کا شاعر ایک سیلف میڈ شخص

ہے۔ جس نے میٹرک سے لے کر ایم اے تک اپنی ذاتی محنت سے اپنے
گاؤں میں بیٹھ کر پرائیویٹ طور پر پڑھا۔ نہ طبقاتی جنگوں کا ماحول دیکھا
اور نہ ہی معاشرتی ناہمواریوں کے کچھ زیادہ موثر مناظر دیکھے۔ بس اپنے
گداز دل کے باعث کچھ نہ کچھ لکھتا رہا اور اپنی ذہنی پس منظر میں
ہی۔۔۔ نہ اسے وسیع ادبی ماحول ملا اور نہ ہی زیادہ ادبی صحبتیں۔ وہ اگر
کبھی اپنے اشعار سنانا بھی چاہتا تھا تو صرف نہم اور دہم کے طلباء کو۔ اب
ایسے شخص سے آپ کیا توقع کر سکتے ہیں۔ ۳۴

حافظ بصیر پوری کے کچھ خطوط ایسے ہی جن میں کچھ علمی اور ادبی مباحث کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو حافظ بصیر پوری علمی اور ادبی حوالے سے خطوط نگاری کو ٹائم دیتے تھے اور خطوط بیٹھ کر لکھا کرتے تھے۔ ان کے خطوط پڑھ کر حافظ بصیر پوری کی شخصیت کا پورا عکس نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے خطوط میں بعض روایات کا بھید کر کیا ہے، جو خط کا موضوع نہیں تھا بلکہ ویسے ہی باتوں میں بات آئی تو انہوں نے موضوع سے ہٹ کر ایک الگ ہی بات شروع کر دیتے ہیں بنیادی طور پر حافظ بصیر پوری ایک مذہبی شخصیت کے حامل ہیں اور ان کی زندگی میں مذہب اور علم و فن ہمیشہ ہی غالب رہے ہیں۔ انہوں نے دنیا کو جس گہری نظر سے دیکھا اور اس کا مشاہدہ کیا ہے ان کا عکس خطوط میں بھی نظر آتا ہے۔ حافظ بصیر پوری نے بہت سے خطوط میں اپنے دوستوں کی عیادت کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں جب کسی دوست پر مشکل وقت آیا ہے تو انہوں نے خط لکھ کر ضرور اس کی خیریت دریافت کی ہے۔

حافظ بصیر پوری نے کچھ خطوط میں اپنے دوستوں سے اپنی مالی مجبوریوں کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ ان کی مدد کیوں نہیں کر سکے۔ ان خطوط کا شمار ان کے ذاتی خطوط میں ہوتا ہے لیکن ان خطوط کو پڑھنے کے بعد ان کا مقصد واضح ہوتا ہے کہ کچھ دوستوں کو حافظ بصیر پوری سے کچھ شکایات تھیں جن کو دور کرنے کے لئے انہوں نے یہ خط لکھا ہے اور اس خط میں ان تمام تحفظات کا اظہار کیا ہے جو ان کو دوستوں سے تھے۔ زندگی میں انسان کے ساتھ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو خواہ مخواہ ہی کوئی موضوع اختیار کر لیتی ہیں حالانکہ کے ان باتوں کی کوئی اتنی حیثیت نہیں ہوتی۔ ان سے ایک دوست نے مالی طور پر مدد مانگی تھی جس کے لیے حافظ بصیر پوری نے مالی معاونت کرنے سے انکار کر دیا اور بتایا کہ میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ اس کے بعد دوست ناراض ہو گیا اور پھر اس ناراضگی کو دور کرنے کے لئے خط لکھا گیا ہے۔ یہ دوست ان کا شاگرد بھی تھا تو حافظ بصیر پوری نے استادانہ انداز میں اپنے شاگرد سے اس موضوع پر بات کی ہے۔

اس خط کا مقصد اپنے شاگرد کو کچھ باتیں باور کروانا تھا۔ اس میں ناراضگی کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس حوالے سے حافظ بصیر پوری خط میں لکھتے ہیں:

میں نے آپ سے اس طویل عرصہ میں کچھ نہ کچھ محبت یا حسن سلوک بھی
کیا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ میرے اس قدر قریب ہی کیوں آتے؟ اس
محبت اور خلوص کو سامنے رکھ کر اس ناراضگی کو بھلا دینے کی کوشش کرنا۔
میں تمہارے لیے دعا کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ اللہ تعالی تمہیں دنیا اور
آخرت میں کامران کرے۔ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے مصائب سے
بچائے۔ حاضرین مجلس کو سلام۳۵

کچھ خطوط محبت اور ہمدردی سے لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط کے موضوعات اور ان میں بات کرنے کا انداز حافظ بصیر پوری کے دوسرے خطوط سے مختلف ہے۔ ان کے یہاں کچھ خطوط علمی اور ادبی حوالے سے لکھے گئے ہیں اور ان میں کسی ادبی موضوع پر یا ان کی اپنی شاعری یا کسی کتاب پر گفتگو کی گئی ہوتی ہے۔ انہوں نے آپ نے ان خطوط میں زندگی کے ہر گوشے کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے اور خطوط میں متنوع موضوعات کو بیان کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط میں فلسفہ جمالیات کے تمام ترنگ واضح ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حافظ بصیر پوری نے اپنے خطوط میں فنون لطیفہ کا تذکرہ بھی متعدد جگہ پر کیا ہے۔ حافظ بصیر پوری کی شخصیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فنون لطیفہ سے خاص طور پر محبت کرنے والے ہیں۔ انہوں نے اپنے خطوط میں جابجا فارسی اشعار لکھے ہیں اور فارسی نثر نگاروں کے جملے مثال کے طور پر پیش کیۓ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بیشتر اور موضوعات کو بھی خطوط میں برتا ہے جس میں فلسفہ ومنطق، دینیات، اسلامی جمالیات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ حافظ بصیر پوری نے تاریخ کا بھی متعدد جگہ پر ذکر کیا ہے اور تاریخ دانوں نے جو کوئی نئی دریافتیں کی ہیں ان کے حوالے سے خطوط میں بھی ذکر ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پرانے زمانے میں ہونے والی جنگوں اور تہذیبوں کے حوالے سے کیا شعر ہے ہمیں خطوط میں نظر آتے ہیں۔

شاعری کے حوالے سے حافظ بصیر پوری نے بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ میں نے کسی استاد سے باقاعدہ طور پر شاعری کی تربیت حاصل نہیں کی اور نہ ہی نثر لکھنے کی تربیت میں نے کسی استاد سے حاصل کی ہے بلکہ میں پنجاب کے ایک گاؤں میں خود ہی لکھتا اور پڑھتا رہا ہوں۔ میرے نزدیک کوئی علمی اور ادبی لوگ نہیں تھے اور نہ ہی میں علمی اور ادبی بڑوں سے واقف تھا۔ بلکہ میں نے تو ادبی جلسے بھی کبھی اٹینڈ نہیں کیے۔ اس کے باوجود بھی دیکھیے کہ حافظ بصیر پوری نے شاعری اور نثر میں بھرپور مطالعہ کیا ہے اور تخلیقی سطح پر اس کا اظہار بھی کیا ہے۔

یہی کسی بھی لکھنے والے کی کامیابی ہوتی ہے کہ وہ اپنی اصلاح سے کس حد تک جھگڑا رہتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے خوبصورت مناظر اور دلکش باغات کی تشبیہات اور استعارات بھی اپنے خطوط میں اس طرح استعمال کیۓ ہیں کے پڑھنے سے انسان اسی ماحول میں پہنچ جاتا ہے اور

حیرت سے دیکھنے لگتا ہے۔ حافظ بصیر پوری کیہہ فنون لطیفہ سے محبت ہے کہ وہ پر خلوص انداز میں اس کا اہتمام کرتے ہیں۔

حافظ بصیر پوری لکھتے ہیں:

> جن لوگوں نے کلاسک کا زیادہ مطالعہ کیا ہو اس کے ذہن میں روایت رچی ہوتی ہے اور جن کا جدید انگریزی ادب سے دماغی رابطہ ہو وہ نئے زاویوں سے فن پر نگاہ ڈالنا پسند کرتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں صرف فرسودہ مضامین کی حد تک قدیم اور جدید کی بحث کو مانتا ہوں۔ شاعری جذبات کا نام ہے جنہیں موضوع اور پر اثر الفاظ میں ادا کرنا چاہیے تاکہ تاثیر میں اضافہ ہو۔ جدت کا یہ مطلب نہیں کہ اچھی روایت سے کھلا انحراف کیا جائے۔ میرے نزدیک وہ شاعر عظیم ہے جو اپنے محسوسات خیال اور جذبات کے حسین امتزاج سے پیش کرسکے۔ ۳۶

اپنے احساسات کا ذکر ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

> ایک ساعت وقت کے دھارے سے بچھڑ گئی۔ ایک لمحہ حال سے جدا ہو کر ماضی کے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ میں آپ سے ۸۰ میل دور نکل آیا۔ طویل فاصلے درمیاں میں حائل ہو گئے۔ اب میں آپ کو دیکھ سکتا ہوں مگر صرف تصور کے دریچے سے.......آپ اس وقت بھی میرے سامنے ہیں۔ ۳۷

احساس بھی جمالیات کے عناصر میں سے ایک ہے اور یہ احساس حافظ صاحب کے ہاں دوسروں سے کہیں زیادہ پایا جاتا ہے جس کا اظہار انہوں نے سنبل صاحب کو لکھے گئے ایک خط میں اس طرح کیا ہے:

> صاحب دل ہوں، صاحب درد ہوں، جب چاہوں رو لیتا ہوں، جب چاہوں دوسروں کو بھی رلا لیتا ہوں، جب چاہوں آنسو مسکراہٹوں میں چھپا لیتا ہوں۔ اگرچہ کسی محفل میں اظہار نہیں ہونے دیا مگر آپ کو کیا خبر کہ آپ کے شہر و دیار کو چھوڑتے ہوئے دو دن کتنے آنسو بہائے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آنسو بے قیمت متاع ہیں اور میرے پاس تو اور بھی ارزاں ہیں۔ اگر دنیا میں ان کی کچھ قیمت پڑ سکتی تو مجھ سا درویش بے نوا کروڑ پتی ہوتا۔ ۳۸

مندرجہ بالا خط میں نہ صرف حافظ بصیر پوری کے حساس انسان ہونے کا معاملہ سامنے آتا ہے بلکہ یہاں

ہمیں ایک خوبصورت نثر کا نمونہ بھی ملتا ہے جو علم بیان کے حوالے سے بھی ایک خوبصورت نمونہ ہے۔

حافظ بصیر پوری نے لفظی مصوری کے ساتھ ساتھ بڑے اچھے انداز میں مترنم بحروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کے یہاں شاعری میں موسیقیت بڑی اہمیت کی حامل ہے جس سے ان کے فنون سے لگاوٹ کا مکمل احساس ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ حافظ بصیر پوری پھول سے محبت رکھنے والے ہیں۔ ان کے یہاں مترنم الفاظ متراوف بحریں اور رواں جملے ان کے اندر کے علمی بے کراں سمندر کا بتا دیتا ہے۔ انہوں نے شاعری میں چھوٹے چھوٹے مصرے بنائے ہیں اور خطوط میں ایسے شامل کیے ہیں کہ وہ خطوط کا جزولاینفک لگتے ہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس جگہ پر شعر یا یہ مصرع نہیں لکھا جاتا تو شاید یہ نامکمل رہتا۔ حافظ بصیر پوری نے جہاں اپنی زندگی تعلیمی شعبے میں گزاری وہی انہوں نے مطالعہ کتب اور اپنی ذہنی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی وقت دیا اور بہتر طریقے سے قارئین کے سامنے پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج حافظ بصیر پوری کی کتابیں اردو ادب کے قارئین پڑھ چکے ہیں۔

(ب) دردوداغ

حافظ بصیر پوری کی یہ کتاب ستمبر ۱۹۹۲ء میں پہلی بار مکتبہ گہوارۂ ادب بصیر پور اوکاڑہ سے شائع کی گئی۔ مذکورہ کتاب ان کے دوستوں بزرگوں اور دیگر عزیز و اقارب کی وفات پر لکھے گئے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب کا انتساب بھی انہوں نے اپنے دوستوں کے نام بہت ہی خوبصورت انداز میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"انتساب......... یارانِ رفتہ کے نام۳۹

حافظ صاحب ایک انتہائی سلیقہ شعار اور کہنہ مشق ادیب، شاعر اور اعلیٰ پائے کے نثر نگار ہیں ساتھ ہی ساتھ اسلامی علوم کے علاوہ عربی و فارسی زبان پر بھی بھرپور دسترس رکھتے ہیں اور اپنے مضامین میں اردو، عربی اور فارسی اشعار اور محاورات کا بر محل استعمال کرتے ہیں۔ مذکورہ کتاب کا انتساب بھی فارسی کے شعر پر ہی ختم کیا ہے

بآں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند

سلامِ ما برسانید ہر کجا ہستند۴۰

کتاب کے آغاز میں پروفیسر ناز ایم۔ اے کی طرف سے ایک انتہائی مختصر مگر جامع اور تعارفی نوٹ لکھا گیا ہے۔ مذکورہ کتاب تمام نثری مجموعوں کی طرح بہت سے محاسن کی حامل ہے جن میں جمالیاتی عناصروں کے ساتھ رومانی عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔

کتاب کے آغاز میں مصنف کی طرف سے کوئی نوٹ نہیں لکھا گیا ایسی صورت کو بہ یک وقت حسن اور عیب کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ جس دور میں یہ کتاب لکھی گئی اس زمانے میں بہت سے مصنفین کا خیال تھا کہ لوگوں کے لیے کتاب پر مصنف کی رائے یا مصنف کے نوٹ کی ضرورت نہیں کیونکہ اس عمل سے قاری کی اصل رائے گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ پروفیسر حافظ منظور حسین بصیر پوری بھی اسی نظریے کے آدمی ہوں۔

کتاب میں کل ۲۰ مضامین ہیں اور تمام تر مضامین علم و ہنر اور فن و آگہی کے ساتھ محبت و مروت کا بھی اعلیٰ نمونہ ہیں۔ تمام مضامین کسی کی موت پر یا برسی کے موقعہ پر لکھے گئے ہیں۔

کتاب "درد و داغ" دراصل "المیہ" پر لکھی گئی ہے۔ ارسطو کے ساتھ اسلام بھی اس بات کا قائل ہے کہ "المیہ" بھی جمال کی ایک قسم ہے۔ ارسطو کے مطابق

> "المیہ (ٹریجڈی) ایک خاص قسم کی نقالی ہے۔ خصوصاً قابل رحم اور دہشت ناک معروضات۔ اس لیے اس کی حقیقی لذت اس رحم اور خوف کی نقالی ہے جس سے ہم لذت اندوز ہوں۔ ارسطو کے اس مفروضے کی تشریح اگر ممکن ہے تو وہ اسی طرح ہوگی کہ غم (افسوسناک) وہ امر ہے جس کی ہم نقل دیکھ کر اور اس سے پیدا ہونیوالی بدمزگی پر قابو پا کر غم سے رہائی (نجات) حاصل کرتے ہیں۔"[۴۱]

اسی طرح اسلامی فلسفہ جمالیات میں بھی المیہ ایک جمال ہے۔ کیونکہ اسلامی نکتہ نظر سے کوئی بھی دکھ تکلیف اور مصیبت کا بنیادی مقصد تنقیح ہے انسان پر آنے والی کوئی بھی مصیبت یا تو اللہ کی طرف سے امتحان ہے یا تنبیہ کہ انسان اپنے عمل کو درست کرے جس کے نتیجے میں تنقیح طہارت و پاکیزگی ملتی ہے جیسا کہ قرآن عظیم میں ارشاد خداوندی ہے

> وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝
>
> اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو (خدا کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو [۴۲]

اسی طرح قرآن و حدیث سے بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن یہاں محض ایک مزید مثال پر اکتفا کیا جائے گا۔

> يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ
>
> اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے (مجھ سے) مدد چاہا کرو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ (ہوتا) ہے۔[۴۳]

مذکورہ آیات کریمہ سے معلوم ہوا کہ یہاں پر پیش آنے والے واقعات، آزمائشیں، مشکلات اور مصیبتیں یا پیاروں کا بچھڑ جانا اور اس پر صبر و تحمل سے کام لینا بہت عمدہ انعامات کے حصول کا سبب بنے گا جس سے

یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ المیہ بھی جمال کا ایک قسم ہے کیونکہ اس کے فنی منطقی اور حتمی نتائج بھی ایک عمدہ چیز کے حصول پر پہنچ کر اختتام پذیر ہوتے ہیں۔

اسلوب و زبان و بیان

حافظ بصیر پوری کا اسلوب سادہ مگر بہت ہی جاندار ہے۔ ان کے ہاں سادہ عام فہم اسلوب بھی ہے اور فلسفیانہ اور خطیبانہ انداز بھی۔ ان کی کتاب ''درد و داغ'' کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ مضامین کسی ضرورت یا فرمائش پر نہیں لکھے گئے مضامین کا تسلسل اور بیان ظاہر کرتا ہے جیسے یہ ورود کی ایک کیفیت سے گزرتے شخص کی محبت اور جذبات سے لبریز روداد ہو۔

مذکورہ کتاب کے تمام مضامین کئی طرح سے اہمیت کے حامل ہیں اور دوسرے مضمون نگاروں سے حافظ بصیر پوری کو منفرد مقام عطا کرتے ہیں۔ ۲۰ مضامین اور ۱۰۳ صفحات پر مشتمل کتاب کے تمام تر مضامین کے عناوین کسی اردو فارسی مصرع یا محاورے پر مشتمل ہیں اور ہر مصرع و محاورہ انتہائی بر محل ہے۔

اک شجر سایہ دار تھا، نہ رہا۴۴

''نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا''۴۵

''رفتید، ولے نہ از دل ما''۴۶

''وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں''۴۷

''ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق'' ۴۸

''اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے''۴۹

''تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو''۵۰

''قصاص خون تمنا کا مانگئے کس سے'' ۵۱

''سُن، اے غارتگرِ جنس وفا، سُن'' ۵۲

"ڈھونڈو اسے وہ خواب پریشاں کی طرح تھا"۵۳

میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں" ۵۴

"یہ سہارا بھی ہائے جاتا ہے" ۵۵

دل کی دل ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی" ۵۶

"اُف یہ بے درد زمانہ یہ زمانے والے" ۵۷

"یاد آتا تھا خدا دیکھ کے صورت تیری" ۵۸

حافظ بصیر پوری کا شمار ہر لحاظ سے منفرد اور ثقہ مصنفین میں ہوتا ہے ان کے ہاں جمالیات کے سیل رواں دیکھنے کو ملتے ہیں وہ ایک شاعر، مصنف، خطیب اور باعمل صوفی بھی ہیں انہیں یہ کمال حاصل ہے کہ وہ کسی بھی بات کو انتہائی خوبی کے ساتھ قرآن و حدیث سے دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مذکورہ کتاب کے مضامین میں انہوں نے جہاں اردو عربی اور فارسی کے اشعار و محاورات پیش کئے ہیں وہیں ان کے ہاں موقع و محل کے مطابق قرآن کے حوالے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

حوالہ قرآن

"هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ

کیا تمہیں شجر بقائے دوام اور ملک بقانہ بتادوں اور" ۵۹

"يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ

ان میں سے ہر ایک ہزار برس کی زندگی کا متمنی ہے ۶۰

"كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ

ہر جاندار نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے ۶۱

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ﴿٢٧﴾

جو بھی اس پر ہے مٹ جانے والا ہے اور تیرے رب ذوالجلا والا کرام کی ذات ہی باقی رہے گی" ۶۱

"الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا"

اس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کون اچھے عمل کماتا ہے۔ ۶۳

"وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ" ۶۳

"قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ" ۶۴

آپ کہہ دیں کہ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا۔ ۶۵

اسی طرح کتاب مذکورہ میں متعدد جگہ پر موقع کی مناسبت سے احادیث کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حافظ بصیر پوری کو نہ صرف اردو عربی اور فارسی زبانوں پر اچھی دسترس تھی اس کے ساتھ وہ ایک بلند پایا عالم دین بھی تھے اور انہیں قرآن پاک کے ساتھ احادیث نبوی ﷺ کا بھی بھرپور علم تھا اور اس کے معانی و مفاہیم سے بھی بطریق احسن آگاہ تھے۔

حوالہ احادیث نبوی ﷺ

"مرد مومن کے لیے تو خاص طور پر حیات دنیوی عہد اسارت کے مترادف ہے۔ حدیث پاک میں فرمایا گیا

الدنیا سجن المؤمن: دنیا مومن کا قید خانہ ہے۔ ۶۶

اسی طرح ایک اور مضمون میں دنیا کی لذتوں سے پرہیز کرنے، زیادہ ہنسنے اور باتیں کرنے سے منع کرنے کے لیے مندرجہ ذیل حدیث بیان کی

"حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں کو زیادہ باتیں کرتے ہوئے اور ہنستے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

تم لذتوں کو مٹانے والی یعنی موت کا ذکر کیا کرو کیوں کہ ہر شخص کی جائے قبر ہر روز پکار کر کہتی ہے میں غربت کا گھر ہوں میں تنہائی کا گھر ہوں، میں وحشت کا گھر ہوں میں تاریک گھر ہوں۔ مٹی کا گھر ہوں۔ میں کیڑوں کا گھر ہوں میرے لیے تیاری کرے۔ ۶۷

اہل بیت سے حافظ بصیر پوری کی محبت و عقیدت اور ان کی تکریم کی تلقین بھی اس کتاب کا ایک حصہ ہے اس میں ایک مضمون میں بہت تفصیل کے ساتھ اہل بیت کی محبت و حقوق پر بات کی گئی ہے جس کا ذکر اپنے مقام پر

آ ئے گا یہاں ایک حدیث بیان کی گئی ہے جس میں اہل بیت کی تعظیم پر بات کی گئی ہے۔

"مختصر یہ کہ ہمیں امتی ہونے کی وجہ سے اہل بیت رسول کی کی تعظیم کا ہر وقت پاس رکھنا چاہیے۔ جیسا کہ رسول خدا نے ارشاد فرمایا:

من احبهم فبحبي احبهم و من ابغضهم فببغضي ابغضهم

ترجمہ: جس نے ان سے محبت رکھی میری محبت کے باعث رکھی اور جس
نے ان کے ساتھ بغض رکھا میرے ہی ساتھ بغض کی وجہ سے رکھا ۶۸

"درد و داغ" نثر کا بہترین مجموعہ ہے جس میں بے شمار شاہکار دیکھنے کو ملتے ہیں اپنے مضامین میں حافظ صاحب اردو عربی اور فارسی کے اشعار بھی لکھتے ہیں، حافظ صاحب کے ہم عصر لوگوں میں عام طور پر قدیم شعرا کے اشعار ہی دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن حافظ بصیر پوری کے ہاں ہمیں قدیم اور جدید دونوں ادوار کے لوگوں کے اشعار ملتے ہیں۔ جیسا کہ ایک مضمون میں عدیم ہاشمی کا مندرجہ ذیل شعر ملتا ہے:

فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا ۶۹

اس مضمون میں فیض احمد فیض کا زبان زدِ عام شعر بھی ذکر کیا ہے:

نہ گنواؤ ناوک نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا ۷۰

شعر و سخن سے مصنف کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے نثری مضامین میں شعر کے چند الفاظ کو استعمال کر کے مضمون کو خوبصورت محکم اور مدلل بناتے ملتے ہیں جیسا کہ انہوں نے کتاب کے سب سے پہلے مضمون میں "چکبست برج نرائن" کے شعر سے لفظ مستعار لیتے نظر آتے ہیں۔

حافظ صاحب لکھتے ہیں:

زندگی جو چیز بھی ہے اور اس کی حقیقت جو کچھ بھی ہو........... کوئی
اسے عناصر میں ظہور ترتیب کہے یا امر کن کا جواب سمجھے ۷۱

یہاں پر چکبست برج نرائن کے مندرجہ ذیل شعر کے ترکیب لی گئی ہے

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

حافظ صاحب اپنے مضامین میں اردو عربی اور فارسی اشعار سے سجاتے ہوئے نظر آتے جس سے نا صرف نثر میں ایک خوبصورتی نمایاں ہوتی ہے بلکہ ان مافی الضمیر سمجھنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔

مضامین میں اردو اشعار

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔ ۷۲

تجھ پہ بھولے عبث کوئی اے عمر
تونے کی جس سے بے وفائی کی ۷۳

ہمیں معلوم ہے ان کے دلوں پر جو گزرتی ہے
کہ جن کی زندگانی کے سہارے ٹوٹ جاتے ہیں۔ ۷۴

قید حیات کے سوا، پی کر خضر کو ملا کیا
آب حیات کی طرف دست طلب بڑھائے کون۔ ۷۵

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا۷۶

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا۷۷

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں۔ ۷۸

اس گلی کا گدا ہوں میں جس میں
مانگتے تاجدار پھرتے ہیں۔ ۷۹

کل کی بات نظر آتی ہے پہلی رات بچھڑنے کی
اور اگر برسوں کو گنیئے، آج زمانے بیت گئے ۸۰

روح نہ ہو کیوں مضطرب موت کے انتظار میں
سنتا ہوں مجھ کو دیکھنے آئیں گے وہ مزار میں ۸۱

کچھ ایسے بھی اٹھ جائیں گے اس بزم سے جنکو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے۸۲

نہ جہاں میں مجھ کو اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو تیرے عفو بندہ نواز میں ۸۳

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۸۴

فارسی اشعار کا استعمال، فارسی اشعار میں صوفیانہ جمالیات

فارسی زبان و ادب پر بھی حافظ بصیر پوری کو بھرپور دسترس تھی اور کتاب میں جا بجا فارسی اشعار اور محاورات کا بھی استعمال کرتے نظر آتے ہیں جیسا کہ انہوں نے کتاب کا انتساب "یارانِ رفتہ کے نام......." فارسی ترکیب سے ہی کیا ہے اور اس جملے کے بعد فارسی کا شعر ہی درج کرتے ہیں جس سے ان کی اپنے دوستوں سے محبت اور جذباتی وابستگی کا اندازہ کرنا قطعاً مشکل کام نہیں رہ جاتا حافظ صاحب لکھتے ہیں:

بآں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند
سلامِ ما برسانید ہر کجا ہستند۸۵

اسی طرح متعدد مضامین میں فارسی کے اشعار ملتے ہیں جن میں سے چند ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں:

آنکہ ایں نامۂ سربستہ نوشتہ است نخست
گر ہے سخت بہ سررشتۂ مضموں زدہ است۸۶

روئے نکو معالجۂ عمر کوتاہ است
ایں نسخہ از بیاض مسیحا نوشتہ ایم۸۷

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم برلب اوست۸۸

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا۸۹

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا
بُلبل ہمیں کہ قافیہٗ گل شود بس است۹۰

عربی اشعار کا استعمال

اسی طرح عربی کے اشعار سے بھی مضامین کو آراستہ و پیراستہ کیا گیا ہے۔

الموت قدح کل نفس شاربوھا
والموتُ باب کل نفسٍ داخلوھا ۹۱

لیلی بوجھك مشرقٌ
وظلامہٗ فی الناس ساری
الناس فی سدف اظلا
ام و نحن فی ضوالنھار ۹۲

کتاب کی ابتدا "آہ! اے زیست" کے عنوان سے لکھے گئے مضمون سے ہوئی ہے کتاب کے متعدد مضامین سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مضمون کس شخصیت کے بارے میں لکھے گئے ہیں لیکن سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی چاہنے والے کے بچھڑ جانے پر لکھا گیا ہے۔

کتاب مذکورہ میں متعدد مقامات پر عالمانہ اور خطیبانہ انداز اختیار کیا گیا ہے اور مضمون کا آغاز فلفسیانہ انداز میں کیا گیا ہے ایسا انداز عمومی طور پر زندگی اور موت کے بارے میں لکھے گئے مضمون میں کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے مضمون کا آغاز ان الفاظ میں کیا گیا ہے

زندگی کیا ہے؟ .... ایک نقش غلط .... جو لوح ہستی پر

ابھرتا ہے اور پھر مٹا دیا جاتا ہے۔ ایک شرارہ .... میں نے بارہا سوچا کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے مگر طائر عقل و خرد کے پر جل گئے..........۹۳

اسی طرح ایک مقام پر زندگی کے بارے میں یوں بھی ذکر کرتے ہیں

اگر چند لمحوں کے لیے فرض کیا جائے کہ تمام انسان ہمیشہ زندہ رہتے تو کیا نتیجہ نکلتا؟ یا تو انسانِ اول کے علاوہ جہان میں کوئی دوسرا نہ ہوتا کیوں کہ آدمی شادی، بچوں کی پرورش، جائیداد کا حصول اور دوسرے اہم کام صرف اسی احساس کے تحت انجام دیتا ہے کہ وہ لاشعوری طور پر اپنے نام کی بقا اور اپنی نسل کے دوام کا طالب ہوتا ہے۔ اگر اسے یقین ہو کہ مجھے کبھی موت نہ آئے گی تو وہ یہ مصیبتیں ہر گز نہ اُٹھائے.......۹۴

کتاب کے تمام تر مضامین چونکہ المیہ کے وقت لکھے گئے ہیں اس لیے ان میں دکھ، رنج، بچھڑنے کا غم دنیاوی زندگی کی بے ثباتی اور آخرت کی ابدی زندگی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ حافظ بصیر پوری کا ہی خاصہ ہے کہ وہ موت اور بچھڑنے کا ذکر بھی اس خوبصورت انداز میں کرتے ہیں کہ قاری ان کے سحر میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی تحریروں میں دو چیزوں کے درمیان موازنہ بھی بہت ہی عمدگی سے کیا گیا ہے فقیہ اعظم محمد نور اللہ قدس سرہ العزیز کے دوسرے سالانہ عرس مبارک کے موقع پر اپنے مضمون ”ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق“ میں وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

میں اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ مرتے تو سب ہیں مگر سب کی موتی یکساں نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کسی کی زندگی عذاب جاں ہے اور کسی کی رشک جناں .... اسی طرح کسی کی موت عذاب الیم ہے اور کسی کی بہشت نعیم .... کسی کی قبر دوزخ کا گڑھا ہے اور کسی کی قبر جنت کا باغ .... کسی کی قبر سانپوں کا مسکن اور بچھوؤں کا ٹھکانہ .... کسی کی قبر میں کلیوں کا بستر اور پھولوں کا سرہانا بلکہ اس میں ہے حبیب خدا کا آنا جانا..........۹۵

جہاں ”درد و داغ“ علم الکلام کا نمونہ ہے وہی اس میں صنائع بدائع اور تلمیحات وغیرہ سے بھی بطریق احسن و خوبی کام لیا گیا ہے۔ کئی مقامات پر صنعت تضاد کو بہت ہی عمدگی سے استعمال میں لایا گیا ہے۔

وہ مجھے گاہے بگاہے ملتا.......... یہ ملاقات کبھی نہایت قلیل ہوتی اور کبھی بغایت طویل .... قلیل ہوتی تو صبر کا امتحان ہوتا......

طویل ہوتی تو شکر کی آزمائش.......... ایسا بھی ہوا کہ وہ پہروں میرے
پاس رہا مگر نہ میں سیر اب ہوا نہ وہ بیزار.......... اگرچہ وہ مجھے اپنی
محبت کا یقین دلاتا، مگر میں اسیر وہم و گمان ہی رہتا کیوں کہ بسا اوقات وہ
ملنے آجاتا باسا اوقات پہلو تہی بھی کر جاتا.......... اس سے میں دامِ
تذبذب میں الجھ کر رہ جاتا.......... پھر وہ پے در پے وعدہ خلافی کرتا
تو میں شدتِ کرب سے پھوٹ پھوٹ کر رو دیتا...... تاہم اس اذیت
میں لذت بھی تھی.......... اس انتظار میں لطف بھی تھا کہ اب تک
کلفت اُلفت سے ہم آغوش تھی اور وہ..........۹۶

اس نے آئندہ میرے پاس رہنے کے لیے اقرار کیا۔ میں نے انکار کے
پردے میں اقرار اور اقرار کے پردے میں انکار کیا۔۹۷

اسی طرح ایک جگہ پر صنعت تضاد کی جو مثال ملتی ہے اس کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں صنعت تضاد کے ساتھ ساتھ صنعت تکرار بھی موجود ہے۔

آہ! انسان بھی کتنا مجبور ہے؟ کبھی جینے پر مجبور کبھی مرنے پر مجبور.....
کبھی مسکرانے پر مجبور کبھی آنسو بہانے پر مجبور.......... کبھی حضوری
کے لیے مجبور کبھی دوری کے لیے مجبور..........
کبھی یہاں رہنے پر مجبور کبھی وہاں جانے پر مجبور.......... یہاں
مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی.......... کبھی ملنے کے لیے مجبور
کبھی بچھڑنے کے لیے مجبور.......... کبھی پاس آنے پر مجبور کبھی دور
جانے پر مجبور.......... کبھی پاس ہو کر دور رہنے پر مجبور.....
اس کی مجبوریاں دیکھ کر آنکھیں اشک بہاتی ہیں۔ دل خون روتا ہے....
مجبوریاں در مجبوریاں........ فطرتی مجبوریاں، معاشرتی مجبوریاں
..........خدا ساختہ مجبوریاں، خود ساختہ مجبوریاں.....۹۸

اپنے مضامین کو جاندار اور بلیغ بنانے کی غرض سے کچھ تلمیحات و تشبیہات کا استعمال بھی کیا ہے جس سے ان کے وسیع المطالعہ ہونے کا علم ہوتا ہے جیسا کہ انہوں نے واقعہ کربلا کے بعد شام غریباں کی طرح اس طرح اشارہ کیا ہے جس سے تلمیح و تشبیہ ایک ہی جملے میں جمع ہو گئے ہیں اور یہ انداز تحریر انہیں دوسرے مصنفین سے منفرد و ممتاز کرتا ہے۔ اپنے ایک شاگرد سہیل کی خودکشی کی خبر پر ایک مضمون بعنوان "اف یہ بے درد زمانہ، یہ زمانے والے" لکھا ہے جو کو بجا طور پر ایک بیانیہ افسانہ بھی کہا جا سکتا ہے یہ مضمون کئی جہات سے افسانے کی

شرائط کو پورا کرتے ہیں اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

آخر جنازہ ہوا اور پھر دیدارِ میت پر شورِ محشر اٹھا۔ میں نے آخری بار سہیل
کے چہرے پر نظر ڈالی .... اشکوں کے چند موتی اس کے چہرے پر
ڈھلک گئے .... یہ شام، شامِ غریباں تھی، یہ رات شبِ قیامت
تم کیا گئے ہم پہ قیامت گزر گئی۔۹۹

حافظ بصیرپوری کے ہاں دنیا کے چند روزہ ہونے اور ابدی زندگی کی طرف رغبت کی مثالیں بھی ملتی ہیں اور اپنے احباب کے بچھڑنے کا غم بھی عمدہ انداز میں بیان کرتے ہیں ان کے ہاں لفظوں کا چناؤ بہت ہی عمدہ اور مسلسل رواں دواں ہے۔ اپنے تحریر کو مدلل بنانے کے لیے جہاں وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں وہیں صحابہ کرام انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اولیا کرام کے اقوال و واقعات بھی بیان کرتے ہیں۔

جہاں حافظ صاحب کے ہاں صنعت تضاد کے ساتھ صنعت تکرار بھی ملتی ہے ابوالفضل حضرت مولانا الحاج محمد نصر اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر لکھا گیا مضمون جس کی ابتدا دنیا اور آخرت کی زندگی کا فرق دو ہی جملوں میں سمیٹ دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

حیات انسان مستعار ہے اور اساسِ عمر ناپائیدار .... دنیا مقام فنا
ہے......... یہاں ہر مسرت کے بعد مضرت ہے اور ہر عشرت کے بعد
عسرت..........۱۰۰

اسی طرح آخرت کی ابدی زندگی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حدیث پاک میں آتا ہے کہ موت سے پہلے زندگی کو غنیمت سمجھو۔ یعنی اس سے پہلے کہ زبان بولنے سے اور آنکھیں دیکھنے سے رہ جائیں۔ ہمیں اپنے گناہوں پر استغفار کرنا چاہیے اور خوفِ خدا سے آنسو بہانے چاہئیں۔۱۰۱

موت کی حقیقت کے ساتھ دو انبیائے کرام حضرت ادریس علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ اٹھائے جانے کا تلمیحاً یوں ذکر کرتے ہیں:

اگر جسمانی انتقال کوئی ایسی ہی ناپسندیدہ چیز ہوتا تو خداوند کریم اپنے
محبوبین اور مقربین کو ضرور اس سے مستثنیٰ قرار دیتا مگر ایسا نہیں کیا
گیا۔ بلکہ محبوبِ حقیقی سے قریب تر ہونے کا ذریعہ بنایا گیا۔ اسی لیے کہا گیا
ہے کہ "موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست سے ملاتا ہے" چنانچہ
ماسوائے ایک دو حضرات کے جملہ انبیائے کرام اور مقبولین بارگاہِ
خداوندی نے لقائے خدا کو ترجیح دی"۔۱۰۲

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مختصر انتہائی مختصر بات کی ہے جس سے روح تک سرشار ہو جاتی ہے۔ ایسے خوبصورت اور حسین فقرے اور عمدہ نصیحت کہ اگر اس کے ساتھ جناب ابراہیم علیہ السلام کا نام مبارک نہ بھی لکھا ہو تبھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ کلام بلاشبہ اللہ کے مقرب پیغمبر کا ہی ہو سکتا ہے۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں:

> ایک دن سیدنا ابراہیم خلیل اللہ نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ کسی عزیز کی میت پر رو رہے ہیں۔ فرمایا:
> اگر تم میت کی بجائے اپنے آپ پر روتے تو بہتر تھا کہ میت تو مشکل مرحلوں سے آگے نکل گئی۔ عزرائیل کی ہولناک شکل بھی دیکھ چکی اور نزع کی سختی سے بھی گزر گئی۔ تمہاری سب مشکلیں تاحال باقی ہیں۔
> ۱۰۳ے

ہمارے ہاں عام دستور ہے کہ لوگ میت میں بھی جائیں تو خدا خوفی کا مظاہرہ کم کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ جنازہ دیکھ کر بھی ہماری ہنسی چھوٹی جاتی ہے قبرستان میں بھی موت کو یاد کرنے کی بجائے منڈی کے بھاو یا رشتوں ناتوں کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ تعزیت کی مجلسوں میں قہقہوں کی آوازیں ایک عام سی بات ہے چونکہ حافظ صاحب ایک باعمل صوفی اور اہل اللہ میں سے ہیں اسی لیے وہ کسی بھی موقع پر خدا خوفی اور آخرت کی تیاری کے لیے لوگوں کو نصیحت کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضمون میں تنبیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"ایسی محفل یں سنجیدگی کے ساتھ ذکر و فکر میں مشغول رہنا چاہیے اور یہ خیال کرنا چاہیے کہ میں نے کیا زادہ راہ تیار کیا ہے"

اپنی تحریر و تقاریر میں اولیا کرام کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام کے اقوال و اعمال کا ذکر بھی کرتے ہیں اور ظاہری سی بات ہے کہ مقصد باطنی طہارت ہے جو کہ صوفیا کا شیوہ خاص رہا ہے۔ جناب سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے روبرو دوزخ کا ذکر ہوتا تو آپ نہ روتے مگر قبر کا ذکر ہوتا تو رونے لگتے۔ آپ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا:
> "کہ میں میدانِ قیامت میں بھی لوگوں کے ساتھ ہوں گا اور دوزخ میں ہوا تو بھی لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔ مگر قبر میں تنہا۔ اس لیے قبر سے زیادہ ڈرتا ہوں" ۱۰۴

اہل بیت سے محبت اور ان کی تکریم پر کتاب مذکورہ میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ان کے دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحب پیغمبر اعظم علیہ الصلوۃ والسلام کے کنبہ اقدس سے کس درجہ محبت رکھنے والے

انسان تھے اس مختصر سی کتاب میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر اور انتہائی جامع تعارف کے ساتھ حضرت جنیدؒ کی اہل بیت اطہار کے ساتھ محبت کا ایک خوبصورت واقع ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

حضرت جنیدِ بغدادی جو کہ حضور غوثِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیرانِ سلسلہ میں سے ہیں۔ آغازِ کار میں شاہی پہلوان تھے۔ آپ کی قوت وطاقت کا غلغلہ چار دانگِ عالم میں پھیلا ہوا تھا۔ کسی کو حوصلہ زور آزمائی نہ تھا۔ ایک روز ایک نحیف و ضعیف مفلوک الحال شخص نے بھرے دربار میں آپ کو کشتی لڑنے کا چیلنج دیا سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا لیکن اس کے اصرار پر بالآخر مقابلہ طے پا گیا۔ خلقِ خدا جمع ہو گئی اور فریقین اکھاڑے میں اترے۔ تو اُس کمزور شخص نے آہستہ سے جنید کو کہا ''جنید! سُنا ہے تم مُحبِ اہل بیت رسول ہو۔ میں ایک غریب سیدزادہ ہوں اگر تم آج شکست کھا جاؤ تو میں انعام و اکرام سے مالا مال ہو جاؤں گا۔ دنیا میں تمہاری رسوائی ضرور ہو گی، مگر روزِ قیامت نانا جان کی بارگاہ میں تمہاری شفاعت کروں گا''۔ جنید کے دل میں بات گھر کر گئی اور دوسرے لمحے جنید چاروں شانے چت زمین پر آرہے۔ چاروں طرف شور مچ گیا کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ جنید جیسا شاہ زور پہلوان ایک ضعیف و نحیف اور کمزور شخص سے یوں شکست کھا سکتا ہے۔ کشتی دوبارہ ہوئی۔ جنید دوبارہ شکست کھا گیا۔ اس کمزور شخص کو انعامات و اکرامات سے مالا مال کر دیا گیا۔ جنید سر کھجاتے جلسہَ عام سے باہر نکلے۔ کسی نے کہا جنید تمہیں کیا ہو گیا تھا؟ تم نے فلاں فلاں داؤ کیوں نہ آزمایا جنید بولے ''بے وقوف میں یزید نہ تھا کہ آلِ رسول پر زور دکھاتا اور داؤ آزماتا.......... میں شمر نہ تھا کہ سید کے سینے پر چڑھ بیٹھتا'' رات نے کائنات کو اپنی آغوش میں لے لیا تو رحمۃ للعالمین نے جنید کو سینے سے لگا لیا ارشاد فرمایا:

''جنید تم نے میرے بیٹے کی لاج رکھی ہے تمہیں دونوں جہان کی عزت بخش دی گئی جاؤ تمہیں اولیا کا سرتاج و سردار بنا دیا گیا۔۱۰۵

صدیوں سے طبقہ صوفیا لوگوں کی آخرت کی فکر میں لگے ہیں اور ان کے لیے دنیا اور آخرت کی فلاح و کامیابی کے لیے مصروف کار ہیں۔ ہمارے ہاں صوفیا کرام کی کرامات کے حوالے سے بہت سی لایعنی اور لغو قسم کی

سینہ گزٹ روایات چلی آ رہی ہیں لیکن حافظ صاحب نے اپنے مضمون میں لوگوں کو کسی لغو کرامت کی طرف پھیرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ انہوں نے لوگوں کی اصل بات کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی شخص ہو عام آدمی ہو کوئی صحابی ہو یا کوئی ولی اور صوفی ہر کسی کی فلاح و کامیابی دین الٰہی پر اس طرح عمل کرنے میں جس طرح رسول خدا نے ہمیں آگاہ کیا اور ہماری رہنمائی کی ہے۔ انہوں نے قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے یہ تو کہا ہے کہ اللہ رب العزت نے اہل استقامت کو خوف و حزن سے نجات اور قربِ خداوندی کی نوید سنائی ہے، اس کے ساتھ ساتھ حضرت جنید بغدادیؒ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ اہل اللہ کے ہاں بھی کامیابی اور کامرانی کا درجہ وہی ہے جو کسی بھی عام مسلمان کے لیے ہے۔ مندرجہ ذیل ایمان افروز واقعہ نے ذہن و قلب کو کشادہ و منور کر دیا ہے۔ اس کتاب میں اس سے زیادہ خوبصورت واقعہ اور کوئی نہیں ہو سکتا، حافظ بصیر پوری واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک عقیدت مند ان کے پاس بارہ سال تک ٹھہرا رہا۔ جب چلنے کا ارادہ کیا تو عرض کیا "حضور آپ کے پاس بارہ سال تک رہا مگر آج تک کوئی کرامت دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا"۔ فرمایا کیا بارہ سال میں میرا کوئی قول یا فعل خلاف سنت دیکھا؟ عرض کیا نہیں۔ فرمایا اس سے بڑھ کر کون سی کرامت ہو سکتی ہے کہ اتنے عرصے میں میرا قدم حکم خدا اور سنت مصطفیٰ ﷺ کے خلاف نہ اُٹھے۔[۱۰۶]

ساری کتاب موت و حیات کا تقابل اور آخرت کی تیاری کی رغبت دلاتی ہے کسی بھی حالت میں خدا کا شکر کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ حافظ بصیر پوری کو یہ ملکہ بھی حاصل ہے کہ وہ مشکل سے مشکل صورتحال یہاں تک ہے مرض الموت میں مبتلا شخص کے ایسے کلمات پیش کرتے ہیں جن سے شخصیت کا ایک مثبت پہلو سامنے آتا ہے۔ یہی ان کی نثر کی عمدگی ہے۔ جناب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے آخری ایام کا واقعہ مولانا رومی کی مثنوی سے پیش کرتے ہیں، اس سے حافظ صاحب کے وسیع المطالعہ ہونے کی روشن دلیل بھی ملتی ہے۔ حافظ صاحب رقمطراز ہیں:

> ایک روایت یاد آئی جو مولانا رومی نے اپنی مثنوی میں بڑی دھوم سے بیان فرمائی۔ کہتے ہیں کہ جب موذنِ رسول ﷺ حضرت بلالؓ مانندِ ہلال مرض الموت سے نحیف و نزار ہوئے اور موت کے آثار نمودار ہوئے تو ان کی زوجۂ محترمہ کے منہ سے درد کے مارے نکلا .... واحر باہ یعنی ہائے مصیبت۔ یہ سن کر آنجناب نے آنکھیں کھول دیں اور تڑپ کر کہا

لاتقولی واحرباہ بل قولی واطرباہ سالقی غداً الاحبّہ محمداً وصحبہٗ

ہائے مصیبت مت کہہ بلکہ واہ واہ شادمانی پکار۔ کل تک میں اپنے احباب
یعنی محمد مصطفیٰ ﷺ اور صحابہ سے جاملوں گا۔ ۱۰۷

جہاں کسی بھی مصنف کے کلام کی خوبصورتی کا معیار اس کے موضوعات کا انتخاب ہوتا ہے وہیں پر اس موضوعات کو قارئین پر پیش کرتے ہوئے اس میں الفاظ کا چناؤ عبارت کی ترتیب یعنی لفظوں کی بساط بچھانے کا طریقہ اور ان کو برتنے کا سلیقہ بھی اس کے ذوق واحساس کا پتا دیتا ہے۔ کتاب کا موضوع از خود ایک مرقع جمال ہے اس پر لفظوں کے چناؤ اور بہاؤ نے اس کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ کو معدودے چند مضامین ہی ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کن لوگوں کی یاد میں لکھے گئے ہیں مگر معلق مضامین میں بھی وہ چاشنی اور جاذبیت ہے قاری کو اپنے سحر میں باندھے رہتے ہیں۔ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ حافظ صاحب فنی طور پر لوگوں کے اذہان کے و قلوب کے فاتح ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کس طرح لفظوں کی بساط پر لوگوں کو باندھ کر رکھنا ہے۔ قاری باوجود کوشش کے بھی ان کے سحر سے نکل نہیں پاتا۔ حافظ صاحب کے وسیع و قلب و مطالعہ ہونے کے بارے میں بیان کیا جا چکا ہے کہ انہوں نے جدید و قدیم تمام لوگوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے ہاں غالب، میر، انشا، ولی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے تو دوسری طرف فراز اور عدیم ہاشمی جیسے عصر حاضر کے شعراء کے اشعار کے ماسٹر پیس ملتے ہیں جن کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ حالانکہ فراز اور عدیم ہاشمی کسی بھی طرح بصیر پوری صاحب کے ہم پلہ ادیب نہیں ہیں بلکہ اگر فنی اعتبار سے دونوں کے معیار کو دیکھا جائے تو علوم وفنون میں دونوں اصحاب طفل مکتب نظر آتے ہیں اس کے باوجود موقع محل کی مناسبت سے ان کے اشعار بھی پیش کر دیئے۔

حافظ صاحب کے ہاں بعض مقامات پر نثر میں اس طرح سے لفظوں کی بساط سجائی گئی ہے کہ نظم و نثر میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نثر میں بھی قافیہ بندی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جیسا کہ پیر سید منظور احمد گیلانی قدس سرہٗ کی ملاقات کے حوالے سے جو سطور درج کی ہیں ملاحظہ ہوں

آہ! میں نے ان چند لمحوں میں کیا کیا کچھ دیکھا! .... چہرے کی
نورانیت دیکھی .... طبع کی روحانیت دیکھی .... گفتگو کی
لطافت دیکھی .... لہجے کی صداقت دیکھی .... کردار کی
عظمت دیکھی .... اخلق کی رفعت دیکھی .... صورت کا
تقدس دیکھا .... سیرت کا تفوق دیکھا .... لباس کی سادگی
دیکھی .... ماتھے کی کشادگی دیکھی .... جبین متین کا نور
دیکھا .... آنکھوں کا سرور دیکھا، ڈاڑھی کا جمال دیکھا ....
ڈیوڑھی کا جود ونوال دیکھا .... سرفرازی دیکھی .... مہمان

نوازی دیکھی .... غرض اس ایک مجلس کا ماحصل ہی لیے میری
لیے زندگی بھر کا سرمایہ ہے۔ افسوس کہ دوسری ملاقات سے قبل ہی وہ
خاکدانِ عالم سے عالم بالا کی طرف پرواز کر گئے۔۱۰۸

حضرت فقیہ اعظمؒ کے وصال کے موقع پر لکھا گیا مضمون بھی شاندار مقفع و مسجع ہے اس میں بھی لفظوں کو اس طرح جوڑا گیا ہے کہ اس سے نا صرف نثر کا جمال ظاہر ہوتا ہے بلکہ موصوف کے لیے حافظ صاحب کی محبت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

حافظ صاحب لکھتے ہیں:

بصیر پور کے در و دیوار سنسان .... دارالعلوم کے حجرے ویران
ہیں .... مسجد کے مینار نوحہ خواں ہیں .... کھجور کے گیسو
پریشاں ہیں .... دارالفرقان میں سناٹا ہے .... ذارِ جدید
سونا ہے۔۱۰۹

اسی طرح ایک مضمون جو شاید کسی شاگرد کے کسی طرح سے بچھڑ جانے پر لکھا گیا ہے اس میں بھی اسی قسم کی عبارت ملتی ہے

اس میں عفت و عصمت بھی ہے، رعنائی بھی .... وفا و مروت
بھی ہے زیبائی بھی ....اپنے حسن کا غرور بھی ہے، مگر چاہنے
والوں کے پر خلوص عشق کا شعور بھی .... جفا کا شوق بھی ہے وفا
کا ذوق بھی، خود پرستی بھی ہے خدا پرستی بھی .... خرد کی
چیرہ دستی بھی ہے جنوں کی مستی بھی .... ناز و ادا بھی ہے اور
ادب و حیا بھی۔ اس میں بے رخی ہے مگر نازِ التفات کے بعد
.... پیام موت ہے پر بخشش حیات کے بعد.......... کرم کرم
میں ستم، ستم میں کرم .... قابلیت بھی ہے، شرافت بھی
.... ذہانت بھی ہے، دیانت بھی .... حسن گفتار بھی
ہے حسن کردار بھی....... خوبی اطوار بھی ہے خوبی رفتار بھی"۔۱۱۰

حوالہ جات

۱۔ قمر منصور، پروفیسر، مکتوب نگاری کی روایت، پورب اکادمی حیدرآباد، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۱
۲۔ غلام رسول مہر، مرتبہ، مکاتیب غالب، مکتبہ علم و عرفان لاہور، ۱۹۸۸، ص ۷۹
۳۔ احمد سلیم، خطوط اقبال، مکتبہ کاروان ادب، ۱۹۷۳، ص ۱۱۷
۴۔ سلیمان اطہر جاوید، مرتبہ، خطوط رشید احمد صدیقی، مکتبہ جدید لاہور، ۲۰۰۱، ص ۱۱۵
۵۔ غلام رسول مہر، مرتبہ، مکاتیب اقبال، مکتبہ علم و عرفان پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۸ ۱۱۲
۶۔ حافظ بصیرپوری، سوز و ساز، مکتبہ گہوارہ ادب، بصیرپور، ۱۹۹۲، ص ۵
۷۔ مجیب الرحمان، فلسفہ جمالیات، فلسفہ و ادب شرقیہ لاہور، ۱۹۷۵، ص ۳۰
۸۔ حافظ بصیرپوری، سوز و ساز، مکتبہ گہوارہ ادب بصیرپور، اوکاڑہ، ۱۹۹۲، ص ۷۰
۹۔ ایضا، ص ۸، ۹
۱۰۔ ایضاً، ص ۸۱
۱۱۔ ایضا، ص ۸۲
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۷
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۴۶
۱۴۔ ایضاً ص ۱۰۷
۱۵۔ ایضا، ص ۶۲
۱۶۔ ایضاً ص ۱۲۹، ۱۳۰
۱۷۔ ایضاً، ص ۳۹
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۲۹
۱۹۔ ایضا، ص ۴۳
۲۰۔ ایضاً، ص ۸۱
۲۱۔ ایضاً، ص ۱۴۶
۲۲۔ ایضاً، ص ۱۴۶
۲۳۔ ایضاً ص ۱۳۳
۲۴۔ ایضاً، ص ۱۳۳
۲۵۔ ایضاً ص ۱۳۵

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۲۱، ۱۲۲
۲۷۔ ایضا، ۲۴
۲۸۔ ایضا، ۱۲۰
۲۹۔ ایضا، ۱۲۷
۳۰۔ ایضا، ۱۱۷
۳۱۔ ایضا، ۳۹
۳۲۔ ایضا، ۱۲
۳۳۔ ایضا، ۱۰۳
۳۴۔ ایضا، ۱۳۷
۳۵۔ ایضاً، ص ۱۰۴
۳۶۔ ایضاً، ص، ۱۰۸
۳۷۔ ایضاً، ص ۲۵
۳۸۔ ایضاً، ص ۲۸
۳۹۔ حافظ بصیرپوری، درد و داغ، مکتبہ گہوارۂ ادب بصیرپور، اوکاڑہ، ۱۹۹۲، ص ۳
۴۰۔ ایضا، ص ۳
۴۱۔ مجیب الرحمٰن، ابن رشد کا فلسفہ جمالیات و شرح کتاب الشعر، لاہور، مطبع فلسفہ وادبِ شرقیہ، ۱۹۷۵ء ص ۲۴
۴۲۔ سورۃ البقرہ، آیت ۱۵۵
۴۳۔ سورۃ البقرہ، آیت ۱۵۳
۴۴۔ ایضا، ص ۱۱
۴۵۔ ایضا، ص ۱۳
۴۶۔ ایضا، ص ۱۸
۴۷۔ ایضا، ص ۳۳
۴۸۔ ایضاً، ص ۲۸
۴۹۔ ایضا، ص ۴۸
۵۰۔ ایضاً، ص ۵۲
۵۱۔ ایضاً، ص ۵۴

۵۲۔ ایضاً ص ۵۷

۵۳۔ ایضا، ص ۶۰

۵۴۔ ایضاً ص ۶۴

۵۵۔ ایضاً، ص ۶۷

۵۶۔ ایضاً، ص ۶۹

۵۷۔ ایضا، ص ۸۵

۵۸۔ ایضاً، ص ۹۹

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۳ (سورہ طہٰ آیت ۱۶۰)

۶۰۔ ایضاً، ص ۱۶ (سورۃ البقرہ ۹۶)

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۹ (سورہ آل عمران آیت ۱۸۵)

۶۲۔ ایضاً، ص ۱۹ (سورہ الرحمٰن آیت ۲۶، ۲۷)

۶۳۔ ایضاً، ص ۳۵ (سورۃ الملک آیت ۲)

۶۴۔ ایضاً، ص ۳۹ (سورۃ البقرہ آیت ۱۵۴)

۶۵۔ ایضاً، ص (۵۷ سور الزخرف آیت ۸۱)

۶۶۔ حافظ بصیرپوری، درد وداغ، مکتب گہوارۂ ادب بصیر پور، اوکاڑہ، ۱۹۹۲، ص ۱۶

۶۷۔ ایضاً، ص ۳۷

۶۸۔ ایضاً، ص ۸۴

۶۹۔ ایضاً، ص ۶۵

۷۰۔ ایضاً، ص ۶۵

۷۱۔ ایضا، ص ۸

۷۲۔ ایضا، ص ۷

۷۳۔ ایضاً، ص ۱۱

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۱

۷۵۔ ایضاً، ص ۱۴

۷۶۔ ایضاً، ص ۱۵

۷۷۔ ایضاً، ص ۱۸

۷۸۔ ایضاً، ص ۲۵

۷۹۔ ایضاً، ص ۲۷

۸۰۔ ایضاً، ص ۳۳

۸۱۔ ایضاً، ص ۷۱

۸۲۔ ایضاً، ص ۸۷

۸۳۔ ایضاً، ص ۹۳

۸۴۔ ایضاً، ص ۹۵

۸۵۔ ایضاً، ص ۳

۸۶۔ ایضاً، ص ۷

۸۷۔ ایضاً، ص ۸

۸۸۔ ایضاً، ص ۱۴

۸۹۔ ایضاً، ص ۲۸

۹۰۔ ایضاً، ص ۸۳

۹۱۔ ایضاً، ص ۱۹

۹۲۔ ایضاً، ص ۴۴

۹۳۔ ایضاً، ص ۷

۹۴۔ ایضاً، ص ۱۵

۹۵۔ ایضاً، ص ۳۸، ۳۹

۹۶۔ ایضاً، ص ۵۴

۹۷۔ ایضاً، ص ۵۶

۹۸۔ ایضاً، ص ۴۵

۹۹۔ ایضاً، ص ۹۴، ۹۵

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۱۸

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۱۳، ۱۴

۱۰۳۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۰۴۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۰۵۔ ایضاً، ص ۸۰، ۸۱

۱۰۶۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۱۰۷۔ ایضاً، ص ۴۰

۱۰۸۔ ایضاً، ص ۶۹

۱۰۹۔ ایضاً، ص ۳۲

۱۱۰۔ ایضاً، ص ۶۳

محاکمہ

"حافظ بصیر پوری کی نظم و نثر کے جمالیاتی عناصر: فکری و فنی جائزہ"

حافظ بصیر پوری کی شاعری و نثر کے جمالیاتی عناصر کا فکری و فنی جائزہ لینے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

مقالہ کل پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

مقالہ کے پہلے باب ادب میں جمالیاتی عناصر اور اس کے بنیادی مباحث، وغیرہ پر بات کی گئی ہے۔ اس میں سب سے پہلے جمالیات کے متعلق بات کی گئی ہے۔

جمال یونانی لفظ aisthetikos سے مشتق، بمعنی حسّی ادراک، جمالیاتی ادراک، جو مرتّب ہے جمالیاتی انبساط و تحسین سے۔ aesthete کے معنی ادراک کرنے والے یعنی حسن پرست اور حسن شناس کے ہیں۔ صلاحیتِ حسن کی معطلی کو anaesthesia کہتے ہیں۔ aesthesia کے معنی صلاحیتِ حسن کی بحالی کے ہیں، جسے احساس کی ایک عمومی صلاحیت اور عمل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کسی شے یا فن کی خوبصورتی کے احساس کو جمالیات کہا جاتا ہے۔ عظیم سائنس دان آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے مطابق جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ یقینی نہیں کہ وہی ہو جو ہم دیکھ اور سمجھ رہے ہیں۔ ہمیں وہ چیز جو کچھ نظر آ رہی ہے وہ ہماری نگاہ، فاصلے اور زاویے کے علاوہ اور بہت سے ایسے حقائق پر منحصر ہے جن سے ہماری شناسائی نہیں ہوتی یا جن کو "نامعلوم عوامل" کہا جاتا ہے۔ اکثر سائنس دانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس کائنات میں کوئی چیز "مکمل" نہیں۔ نہ کوئی دائرہ مکمل ہے نہ کوئی خط مستقیم۔ شے اصل میں کیا ہے اور کیا نظر آتی ہے۔ یہ ہماری نظروں کے اسے دیکھنے اور محسوس کرنے پر منحصر ہے۔

مثلاً ہم چاند، سورج اور سیاروں کو گول سمجھتے ہیں جب کہ وہ مکمل گول نہیں۔ اسی طرح فطرت میں کوئی شے نہ خوبصورت ہے نہ بدصورت۔ صرف کسی شے کا وجود ہی اصل حقیقت ہے۔ اسے دیکھ کر آپ کے اندر کون سی حس جاگتی ہے کون سا جذبہ ابھرتا ہے اسی کو ہم جمال یا تیا خوبصورتی کہتے ہیں۔ انسان ہر چیز کو "حواس خمسہ" سے محسوس کرتا ہے لیکن جمالیات کو حواس خمسہ نہیں بلکہ انسان کی "چھٹی حس" محسوس کرتی ہے۔ پانچوں حِسیں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں لیکن وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ہر انسان میں چھٹی حس ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ زیادہ تر لوگوں میں چھٹی حس کی کمی ہوتی ہے تو یہ کچھ غلط بھی نہیں ہوتا۔

اگر ہم بینائی اور نظر کے فرق کو سمجھ لیں تو یقیناً ہمیں جمالیات کو سمجھنے میں آسانی ہو سکتی ہے، ظاہری طور پر دیکھا جائے تو بینائی اور نظر ہم معانی الفاظ ہیں لیکن فنی طور پر ان میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ بینائی دیکھنے کی وقت ہے اور نظر کسی چیز کی قدر و قیمت کو سمجھنے کا پیمانہ ہو سکتا ہے۔ اور اسی نظر سے سے نظریات اور فلسفے جنم لیتے ہیں۔ بینائی کی قوت سے ہم چیزوں کو دیکھ تو سکتے ہیں مگر اس کا عمیق مطالعہ نہیں کر سکتے اس کا عمیق مطالعہ کرنے

کے لیے نظر کا ہونا ضروری ہے۔ نظر کو ایک اندرونی احساس بھی کہا جا سکتا ہے جس کے ذریعے ہم کسی بھی چیز کی اچھائی یا برائی کو محسوس کر سکتے ہیں۔

انسان اس کائنات کا حسن ہے۔ ہر زمانے میں ہر مذہب و دین نے اس کے اس جمالیاتی تخیل کا خیال رکھا ہے جو اس کے ساتھ ان کی فطرت کے موافق جڑا ہوا ہے جس کو وہ فنون لطیفہ اور ثقافت کے جمالیاتی اقدار کے پہلوؤں کے ذریعے مختلف تصورات کی بنیاد پر اجاگر کرتا رہا ہے۔ اردو ادب میں اسے ذوقِ جمال یا جمالیاتی ذوق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسانی نفسیات کو خوبصورتی، بدصورتی، اچھائی اور برائی ہر دور میں متاثر کرتی رہی ہے۔ انسان فطرتاً حسن پرست ہے خواہ وہ ظاہری حسن و جمال ہو یا حقیقی حسن یا عشق مجازی ہو یا عشق حقیقی۔ ہر دور میں انسان خوشی، غم، دکھ، درد، رنج، تکلیف جیسے جذبات سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ اس کا موضوع انفرادی محسوسات بھی رہا ہے اور اجتماعی بھی۔

تاریخ کے ابتدائی ادوار میں انسان اجتماعی مشترکہ زندگی گزارتا تھا۔ للٰذا اس کے ان محسوسات کا محور و مرکز اجتماعیت ہی تھا۔ وہ اپنے ان جذبوں کا اظہار پینٹنگ، سنگ تراشی، مجسمہ سازی، موسیقی، شاعری اور رقص وغیرہ میں کرتا رہا۔ ایک تخلیق کار کا ایسے جذبوں کا بیان کردہ کسی بھی شکل میں اظہار ہی دراصل ایستھیٹکس یا جمالیاتی ذوق کہلاتا ہے جو جمال کے سر تہاں کو کھولنے اور سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔ حسن، خوبصورتی اور پرکشش روپ یہ لفظ فکری حوالے سے کائنات کی تخلیق سے پہلے خالق کائنات نے تجویز کیا اور کائنات کو حسن کی تعبیر اور معنویت کی مثال بنا کے پیش کیا۔ حسن نام ہے کسی چیز کا صحیح اور درست توازن۔ امام راغب المفردات میں حسن کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ حسن وہ چیز ہے جو مسرت بخشتی ہے یا جو عقل وحسیات کی رو سے مرغوب ہو، حسن کا نقیض وہ ہے جو غم لاتا ہے۔

جمال کی تعبیر کو قرآن میں 'حسنہ' کہا گیا ہے جس کے معنی زندگی کے ہر گوشہ میں سامان راحت، آسائش، انفرادی اور اجتماعی حیات کے پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ قرآن نے انسانی قد و قامت کے جمالیات کو چار مدارج میں تقسیم کیا ہے۔ تخلیق، تسویہ، تعدیل اور ترکیب صوری۔ جمالیات کے مختلف پہلوؤں میں جمالیاتی حقائق، جمالیاتی اقدار، ماورائی جمالیات، جمالیاتی رجحانات، جمالیاتی حظ، جمالیاتی حسیات اور جمالیاتی ذوق وغیرہ شامل ہیں۔

فکری طور پر جمالیات ایک وسیع موضوع ہے جو اپنے ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے آج تک کے انسانی فکر و جمال کے مختلف زاویوں اور روایات کا احاطہ کرتا آیا ہے جس میں انسانی معاشرت سے متعلق ہر چیز سمونے کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ معاشرے کے تاریخی ارتقاء کے دوران سماجی شعور کی متنوع صورتوں نے خود کو انسان کی زندگی اور روحانی فعالیت کے مختلف سانچوں میں ڈالا۔ انسانی تاریخ کے ابتدائی مراحل سے جمالیاتی محسوسات، تجربات اور ادراکات بھی اس میں شامل ہو گئے جس کے نتیجے میں سماجی زندگی کی ایک معینہ ہیئت ارتقاء پذیر ہوئی جس میں انسان کے حقیقت و واقعیت کے ساتھ جمالیاتی رویوں نے خود کو مستحکم کیا، ایک سانچے میں اپنے آپ کو ڈالا

اور ترقی کی منازل طے کیں۔

جمالیاتی ارتقاء کے دوران نہ جانے کتنے تصورات پیدا ہوئے، تبدیل ہوئے، مختلف تصورات میں نئی مفاہیم کی جہتیں پیدا ہوئیں، خود جمالیات نے کتنی اصطلاحات خلق کی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

اس کے بعد جمالیات کے بارے میں اسلامی نکتہ نظر اور بنیادی مباحث کو موضوع بنایا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن حکیم زندگی کے ہر شعبے میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے، کیونکہ اس میں ہر بنیادی مسئلہ حیات کا حل موجود ہے لیکن معارف قرآنی سے آگاہ ہونے کے لئے اس پر اس قلب کے ساتھ غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ جو اپنے حسن فطری سے منور ہو۔ اس سے پیشتر کہ نفس مضمون پر بحث کا آغاز کیا جائے۔ میں اس واقعیت کا اظہار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ قرآن حکیم نے آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے حیات انسانی کے اس اساسی مسئلے پر، جسے جمالیات کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، روشنی ڈالی ہے اور اسے اس انداز بیان سے حل کیا ہے جو ذہن انسانی کے ارتقائے مدام کے باوجود ہر زمان و مکان میں اس کی جمالیاتی حس کے اس بنیادی جذبے کی تشفی کرتا رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں اس نے جمالیات کے اسی اساسی مسئلے کا ایسا حل بتایا ہے جو زمان و مکان کی اضافیت میں مطلق حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد جمالیات کی تاریخ اور ادب میں جمالیاتی عناصر کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور بارے میں بام گارٹن، سقراط، افلاطون اور کانٹ وغیرہ کی طرف سے پیش کئے جانے والے نظریات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں جمالیات کے بارے میں اسلامی نظریہ قرآن کی روشنی کے تحت بھی کچھ مختصر جائزہ کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں حافظ منظور حسین بصیر پوری کا مختصر سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے جس میں ان کا خاندانی پس منظر ان کے جد امجد جگدیو رائے کے بیٹے کا قبول اسلام اور منٹگمری کے علاقہ ساہیوال اور بصیر پور میں آکر بسنے کا ذکر بھی ہے اور ان کے والد پر چچاؤں کی طرف سے ہونے والے ظلم کے بارے میں بتایا گیا۔ اس کے بعد ان کے والد کا اپنے سے بھاگ کر کراچی جانا اور بحری جہاز کی ملازمت اور عدن، بصرہ اور بغداد جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد حافظ بصیرپوری کے والد کی شادی ان کی والدہ کا شادی کے بعد تعلیم حاصل کرنا، حصول تعلیم کے بعد بطور استاد پرائمری سکول میں استاد مقرر ہونے سے ان کی بہن خدیجۃ الکبری کی پیدائش تعلیم وتربیت اور سولہ سال بعد حافظ بصیر پوری کی پیدائش ان کی تعلیم وتربیت والدہ کا انتقال اور بڑی بہن کا بطور والدہ ان کی دیکھ بھال کا ذکر کیا گیا ہے۔

حافظ بصیرپوری کی تین شادیوں میں سے دو ناکام ہونے کی وجوہ بیان کی گئی ہیں اور تیسری کامیاب شادی اور ان کے بچوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ حافظ بصیر پوری کی تعلیم وتربیت، سکول کی تعلیم، کے بعد مدرسہ سے درسِ نظامی کی سند، حفظ قرآن اور مصلے سنانے اور حضرت فقیہ اعظم کے حلقہ ارادت میں شمولیت، بطور استاد ان کی خدمات، سکول میں فارسی استاد سے لیکر کالج کے پرنسپل بن کر ریٹائر ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔

حافظ بصیر پوری کی طرف سے مختلف تعلیمی اداروں کے آغاز اور ان کی کارکردگی بارے مختصر مگر سیر

حاصل بات کی گئی ہے۔

حافظ بصیرپوری کی تعلیمی خدمات کے علاوہ ان کے نامور شاگردوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کے شاگرد اس وقت بہت اعلیٰ اور ارفع مقام پر پہنچے ہوئے ہیں جن میں اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی کے سابق پرنسپل تحسین فراقی کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔

اس باب میں حافظ صاحب کے خوش الحان قاری قرآن ہونے کی بات کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح ان کے استاد نے انہیں مدرسہ کی مسجد میں قرآن سنانے کے لیے مقرر کیا اور چوبیس سال تک وہ اپنے استاد کا یہ حکم بجالاتے رہے۔ ان کی غیر مطبوعہ کتب کا ذکر کرتے ہوئے ان کے انتقال کی خبر پر اس باب کا خاتمہ کیا گیا ہے۔

حافظ بصیرپوری کی شاعری کی دو کتب "شام افق" اور "نالۂ شب" کی شاعری اور اس میں موجود جمالیاتی عناصر بارے بات کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ

حافظ منظور حسین بصیرپوری المعروف "حافظ بصیرپوری" نے اپنی تمام عمر دین و ادب کی خدمت میں گزاری زبان و ادب پر ان کی گرفت سے انکار ممکن نہیں، وہ ایک وسیع المطالعہ اور وسیع القلب انسان تھے۔ نثر کی طرح شاعری میں بھی ان کا اپنا ایک منفرد انداز اور جداگانہ اسلوب ہیں۔ وہ ایک روایت پسند شاعر کے طور پر سامنے آئے ہیں اور انہیں عام طور پر سہل ممتنع کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔

ان کی شاعری میں رومانویت بھی ہے اور غم و سوز بھی ہے ان کی شاعری کا بیشتر حصہ غزلوں پر مبنی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں نظم لکھنے پر بھی اسی قدر عبور ہے جس قدر انہیں نثر اور غزل پر دسترس ہے۔

اس کے بعد شاعری کا فنی اور جمالیاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور اس کے موضوعات، خیال، تخیل اور اصناف کو بطور خاص بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔

اس باب میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حافظ بصیرپوری نے اقبال اور غالب کی طرح استفہامیہ انداز میں شاعری کی ہے اور اس کے ہاں بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں جو شاید دیگر شعرا کے ہاں موجود نہیں مثال کے طور پر ایک شعر کے دونوں مصرعوں میں متعدد بار شاعر کا تخلص استعمال کیا جانا۔ اس کے علاوہ ان کی نظموں اور ان کے موضوعات پر بھی بات کی گئی ہے۔

حافظ بصیرپوری کی کتب "اس دیار میں" (سفر نامہ حج)، "دامن گلچیں" (مقالات و تقاریر کا مجموعہ) اور "دل میں اترتے حرف" (دروسِ احادیث پر مشتمل نثری تقاریر کا مجموعہ) میں موجود جمالیاتی عناصر بارے بات کی گئی ہے۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ جمالیات کے عناصر میں، ذوق، حس، وجدان اور شوق شامل ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہر اس چیز کو جمالیات کا جزو قرار دیا گیا ہے جس کا مقصد انسان کی فلاح و اصلاح ہو، ان کتب پر اس بنیاد پر بات کی گئی ہے کہ جمالیات کا بہترین منبع و مخرج قرآن حدیث ہیں کیونکہ ان کا مقصد ہر طرح سے انسان کی فلاح اور

اصلاح ہے۔ ان تینوں کتابوں میں مصنف کے ذوق، حس، وجدان، شوق وغیرہ کو دیکھتے ہوئے ان ہی بنیادوں پر جمالیاتی عناصر پر بات کی گئی ہے۔ ساتھ ہی مصنف کے اعلیٰ ذوق کے تحت اردو، عربی، فارسی اشعار کے انتخاب بھی مختصراً پیش کیا گیا ہے، ادبی اصناف پر بھی بات کی گئی ہے۔ سفر نامہ کی ابتدا اور حج کے سفر ناموں پر نہایت مختصر بات کرتے ہوئے مصنف کا امتیاز اور انفرادیت بھی واضح کی گئی ہے۔

دامن گلچیں اور دل میں اترتے حرف کے بارے کے مسودے کے بارے میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دونوں کتابیں جمالیات کا عمدہ نمونہ ہیں۔

تینوں کتابوں میں مصنف کا ذوق و شوق، احساس، وجدان محبت اور لفظوں کے چناو سے قاری ساتھ بندھا چلا جاتا ہے اور اس کو ثابت کرنے کے لیے کتب مذکورہ سے حوالے پیش کئے گئے ہیں۔

پانچواں باب حافظ بصیرپوری کی مکتوب نگاری کے حوالے سے پیش کیا گی ہے جس میں ان کی دو کتب ''درد و داغ'' اور ''سوز و ساز'' کو موضوع سخن بنایا گیا ہے سب سے پہلے خطوط نگاری کے آغاز وارتقا بارے مختصر بات چیت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ خطوط نگاری کے آغاز وارتقا کے حوالے سے مذہبی صحائف اور کتابوں میں خطوط نگاری کا تذکرہ ضرور سامنے آیا ہے۔ ادبیات عالم میں جہاں گرد کی واپسی، ''اوڈیسی'' جو ہیومر کی داستان ہے اس میں بھی خطوط کا تذکرہ بہت اہم ہے۔ اس لیے اردو خطوط نگاری کے حوالے سے جب ہم بات کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسد اللہ خان غالب سے پہلے غلام غوث بے خبر اور رجب علی بیگ سرور کے مکتوبات تاریخ کا حصہ بن چکے تھے۔ انہی کے ساتھ مرزا غلام غوث کا مجموعہ '' انشائے بے خبر'' اور'' فیضان بے خبر'' بھی منظر عام پر آچکے تھے۔ اس کے باوجود اسد اللہ خان غالب کو خطوط نگاری میں صف اول کے لکھنے والوں میں جگہ دی جاتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے خطوط کو اردو خطوط نگاری میں معیاری مانا گیا ہے۔ مکتوب نگاری کی معلوم تاریخ کے مطابق پہلا خط چین میں چار ہزار سال پہلے لکھا گیا تھا۔ یہ صرف مفروضہ ہے اور اس کے حوالے سے ماہرین آثار قدیمہ کے پاس کوئی واضح ثبوت موجود نہیں

اس کے بعد کتب میں جمالیات عناصر کا جائزہ کیا گیا ہے۔ جس میں آیات قرآنی، احادیث مبارکہ منتخب اشعار اور اصناف ادب کے حوالے سے جائزہ کی کوشش کی گئی ہے، جس سے مصنف کے ذوق واحساس وجدان اور اخلاق کا علم ہوسکے، اس میں عربی، اردو اور فارسی کے اشعار کا انتخاب الگ الگ کیا گیا ہے۔

کتابیات

اثر،امداد امام۔کاشف الحقائق ،لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع سوم اپریل ۲۰۱۶ء۔

آزاد،ابوالکلام۔ترجمان القرآن،لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع سوم اپریل ۲۰۱۶ء۔

انجنیئر،اصغر علی۔ مارکسی جمالیات، لکھنؤ:حیدری مارکیٹ امین آباد، نصرت پبلشرز، س ن۔

انور فواد ابی خزام،الروح الصوفیہ فی جمالیات الفن الاسلامی،لبنان: دارالصداقۃ العربیہ بیروت، س1995

بلگرامی، غلام حسین قادر، سید۔قواعد العروض، لکھنؤ: مطبع شام اودھ، ۱۳۰۰ھ۔

تبسم کاشمیری۔اردوشاعری میں علامت نگاری،لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء۔

ثریا حسین۔جمالیات اور ادب، علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، فروری۱۹۷۹ء، طبع اوّل۔

ثریا حسین۔جمالیات شرق و غرب، علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ،۱۹۸۳ء۔

جاوید اختر،لینن اور جمالیات، کوئٹہ: سنگت اکیڈمی۲۰۶، مری لیب، فاطمہ جناح روڈ، طبع دوم۲۰۱۷ء

جلال الدین احمد جعفری،سید۔کنز البلاغت، الٰہ آباد: مطبع انوار احمد، س ن۔

جمال،جمال الدین۔تفہیم العروض، لاہور: میسرز ناشرین،۲۰۰۲ء۔

جمیل جالبی۔تاریخ ادب اردو، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۱ء۔

جوش ملیح آبادی۔ یادوں کی بارات، لاہور: مکتبہ شعر و ادب، مئی۱۹۷۵ء۔

جین، گیان چند۔ تحقیق کا فن، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۴ء۔

جین، گیان چند۔اُردو کا اپنا عروض، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۹۱ء۔

حافظ بصیرپوری ۔اس دیار میں بصیرپور: مکتبہ گہوارۂ ادب، ۱۹۸۷ء۔

حافظ بصیرپوری جادہ شوق ،بصیرپور: مکتبہ گہوارۂ ادب، ۱۹۸۳ء۔

حافظ بصیرپوری،دامنِ گلچیں، لاہور: اکبر بک سیلرز،۴۰ اُردو بازار، ۲۰۱۶ء، طبع دوم۔

حافظ بصیرپوری،درد و داغ، لاہور: مکتبہ گہوارۂ ادب، ۱۹۹۲ء۔

حافظ تبصیر پوری دل میں اترتے حرف، لاہور: اکبر بک سیلرز، ۴۰ اُردو بازار، ۲۰۱۶ء۔

حافظ تبصیر پوری۔ سفرنامہ عراق (غیر مطبوعہ)۔ عراق کا سفر نامہ، ۲۰۱۴ء۔

حافظ تبصیر پوری۔ سوز وساز، بصیر پور: مکتبہ گہوارۂ ادب، ۱۹۸۰ء۔

حافظ تبصیر پوری۔ مزات و کرات۔ (غیر مطبوعہ)۔ خواب نامہ۔

حافظ تبصیر پوری۔ نالۂ شب، بصیر پور: مکتبہ گہوارۂ ادب، ۱۹۸۰ء۔

حافظ تبصیر پوری۔اُفق شام، بصیر پور: مکتبہ گہوارۂ ادب، ۱۹۸۲ء۔

حافظ تبصیر پوری۔میں اور میرے۔ (غیر مطبوعہ)۔ خودنوشت سوانح عمری (۲۰۱۶ء)۔

حافظ تبصیر پوری۔نوید سحر۔ (غیر مطبوعہ) اسلامی منتخب کلام (دورِ آخر)۔

حالی، خواجہ الطاف حسین۔مقدمہ شعروشاعری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء۔

خان، یوسف حسین۔ غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات، نئی دہلی: غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدینؒ، ۱۹۷۹ء۔ اشاعت اوّل۔

سجاد بیگ، مرزا۔تسہیل البلاغت، لاہور: مجلس ترقی ادب۔ طبع سوم، اپریل، ۲۰۱۶ء۔

سروش، محمد اجمل۔اُردو غزل میں عروضی تجربات، فیصل آباد: روہی بکس، اکتوبر ۲۰۱۶ء۔

سعید احمد رفیق۔تاریخ جمالیات۔ قلات پبلشرز، کوئٹہ: مستونگ۔ ۱۹۷۲ء۔ مخزونہ سیمینار لائبریری اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی علامہ اقبال کیمپس، لاہور۔

سنبل نگار۔اُردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، لاہور: دارالنوادر، ۲۰۱۳ء۔

شکیل الرحمن۔جمالیاتِ حافظ شیرازی۔ دہلی: نرالی دنیا پبلی کیشنز۔ مخزونہ مرکزی کتب خانہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔

شکیل الرحمن۔ادب اور جمالیات، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، طبع ۲۰۱۱ء۔

شکیل الرحمن۔ترجمان القرآن کے اسلوب کا جمالیاتی معیار، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع سوم، اپریل ۲۰۱۶ء۔

شکیل الرحمن۔تصوف کی جمالیات۔دہلی: نرالی دنیا پبلی کیشنز۔ مخزونہ مرکزی کتب خانہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔

شکیل الرحمن۔محمد قلی قطب شاہ کی جمالیات۔دہلی: نرالی دنیا پبلی کیشنز۔ مخزونہ مرکزی کتب خانہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔

شکیل الرحمن۔ہند اسلامی جمالیات۔دہلی: عرفی پبلی کیشنز۔ مخزونہ مرکزی کتب خانہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔

شکیل الرحمن۔ہندوستان کانظام جمال:بدھ جمالیات سے جمالیاتی غالبؔ تک۔نئی دہلی

شیرازی،انجم۔غزل کانیکی، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، س ن۔

صدیقی،ابوالاعجاز۔کشاف تنقیدی اصطلاحات،اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، س ن۔

صہبائی،امام بخش۔ حدائق البلاغت،لکھنؤ: مطبع منشی نول کشور، ۱۸۸۷ء۔

عابد علی عابد،سید۔اسلوب، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء۔

عابد علی عابد،سید۔البدیع، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء۔

عابد علی عابد،سید۔البیان، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء۔

عبدالستار، قاضی۔جمالیات اور ہندوستانی جمالیات،دودپور علی گڑھ :ادبی پبلی کیشنز،آنند بھون،۱۹۷۷ء۔

عتیق اللہ۔ تنقیدکی جمالیات، دہلی: کتابی دنیا، ترکمان گیٹ، طبع ۲۰۱۳ء۔

فاخر حسین۔مضامین جمالیات،لاہور: نگارشات پبلی کیشنز،اکتوبر ۱۹۸۸ء، مخزونہ مرکزی کتب خانہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔

فاروقی، شمس الرحمن۔عروض،آہنگ اور بیان، نئی دہلی: ۲۰۰۴ء۔

فاروقی، شمس الرحمن۔شعر، غیر شعر اور نثر،اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۶ء۔

فقیر، شمس الدین۔حدائق البلاغۃ،کانپور: مطبع منشی نول کشور، ۱۸۸۷ء۔

شکیل الرحمن۔ فراقؔ کی جمالیات،دہلی: نرالی دنیا پبلی کیشنز، طبع ۲۰۰۹ء۔

شکیل الرحمن۔کلاسیکی مثنویوں کی جمالیات، دہلی: نرالی دنیا پبلی کیشنز۔ طبع ۲۰۰۸ء۔

شکیل الرحمن۔مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات، نئی دہلی: غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، طبع ۲۰۱۱ء۔

شکیل الرحمن۔ہندوستانی جمالیات۔ جلد اوّل، نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نمبر۹، گولا مارکیٹ دریا گنج، طبع ۱۹۹۴ء۔

لطف اللہ کریمی۔ اصطلاحات ادبی (انگلش۔فارسی)۔ مطبع علمی و فرہنگی، ۱۳۷۲ء۔

مجنوں گورکھپوری۔تاریخ جمالیات، علی گڑھ: انجمن ترقی اُردو۔ طبع دوم، ۱۹۵۹ء۔

مجیب الرحمن۔ ابن رشد کا فلسفہ جمالیات اور کتاب الشعر، لاہور: مطبع فلسفہ و ادب شرقیہ، جولائی ۱۹۷۵ء۔ مخزونہ سیمینار لائبریری اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی علامہ اقبال کیمپس، لاہور۔

محمد اسلم ضیا۔علم عروض اور اُردو شاعری، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء۔

محمد سجاد بیگ، مرزا۔تسہیل البلاغت، دہلی: محبوب المطابع برقی پریس، ۱۳۳۹ھ۔

محمد عبیداللہ الاسعدی۔تسہیل البلاغۃ، لاہور: المکتبہ الاشرافیہ،

محمد مظفر۔فنون لطیفہ اور جمالیات: فن، فنکار اور عمل، گوگنج لکھنؤ: ضیا پبلشنگ ہاؤس، مقبرہ جناب عالیہ، طبع ۲۰۰۹ء۔

مزمل حسین۔اردو میں علمِ بیان اور بدیع کے مباحث (تحقیقی وتنقیدی جائزہ) لاہور: مجلس ترقی ادب، جولائی ۲۰۱۰ء۔

میاں محمد شریف۔جمالیات کے تین نظریے، لاہور: مجلس ترقی ادب ۲۔کلب روڈ۔دسمبر ۱۹۶۳ء۔ مخزونہ کتب خانہ گورنمنٹ اصغر مال کالج، راولپنڈی۔

ناصر، نصیر احمد۔ آرزوئے حسن، لاہور: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمٹیڈ، فروری ۱۹۶۳ء۔ مخزونہ مرکزی کتب خانہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔

ناصر، نصیر احمد۔ حسنِ قرآن، لاہور: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمٹیڈ۔ (حصہ اول۔ پارہ ۱تا۲۱)،

ناصر، نصیر احمد۔ سرگزشت فلسفہ، لاہور: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمٹیڈ، ۱۹۹۱ء۔

ناصر، نصیر احمد۔اقبالؒ اور جمالیات، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع دوم ۱۹۸۱ء۔ مخزونہ مرکزی کتب خانہ قومی ادارہ برائے فروغِ زبان اُردو (مقتدرہ قومی زبان)، ایچ۔۸، اسلام آباد۔

ناصر، نصیر احمد۔تاریخ جمالیات (حصہ اول)، لاہور: مجلس ترقی ادب، فروری ۱۹۳۶ء۔ مخزونہ سیمینار لائبریری اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی علامہ اقبال کیمپس، لاہور۔

ناصر، نصیر احمد۔تاریخ جمالیات۔ (حصہ دوم)، لاہور: مجلس ترقی ادب، فروری ۱۹۳۶ء، مخزونہ کتب خانہ، کتب خانہ گورنمنٹ اصغر مال کالج، راولپنڈی

ناصر، نصیر احمد۔جمالیات (قرآن حکیم کی روشنی میں)، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع سوم، اپریل ۲۰۱۶ء

ناصر، نصیر احمد۔جمالیات (قرآن حکیم کی روشنی میں)، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اول

ناصر، نصیر احمد۔فلسفۂ حسن، لاہور : مجلس ترقی ادب، جنوری ۱۹۸۴ء۔ مخزونہ مرکزی کتب خانہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔

نجم الغنی، مولوی۔بحر الفصاحت، لاہور: مجلس ترقی ادب، س ن۔

نقوی، محمد صدیق۔شکیل الرحمن اور مولانا جامی کی جمالیات، دہلی: نرالی دنیا پبلی کیشنز، مخزونہ مرکزی کتب خانہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ہاشمی، رفیع الدین۔اصناف ادب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء۔

ہاشمی، رفیع الدین۔جامعات میں اردو تحقیق، اسلام آباد: ہائر ایجوکیشن کمیشن۔ طبع اوّل، ۲۰۰۸ء۔

ہاشمی، حمید اللہ۔ فن شعرو شاعری اور روحِ بلاغت، لاہور: مکتبہ دانیال، س ن۔

ہمائی، جلال الدین۔فنون بلاغت وصناعتِ ادبی، تہران: انتشارات، ۱۳۶۴ھ۔

International Islamic Univ.
CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD